

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	_____	شعلہ مستور
مصنف	_____	علامہ غلام احمد پرویزؒ
ناشر	_____	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	_____	۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور (۵۳۲۲۰)
طالع	_____	دوست ایسوسی ایشن
مطبع	_____	ایچ۔ وائی پرنٹرز، لاہور
ایڈیشن	_____	پنجم (بلا ترمیم) ۱۹۹۳ء

ملنے کا پتہ

• طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

دوست ایسوسی ایشن

بیسمنٹ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مشمولات

مَسَلَّتْ شَعْرًا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳	خلاف خدا کی طرف سے آخری حجّت۔	ق	تعارف
۱۳	حضرت عیسیٰ کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کی افراط و تفریط		حضرت زکریا و یحییٰ
	قرآن کریم کا فریضہ تبیان حقیقت		از ص ۱ تا ص ۱
۱۵	اناجیل میں حضرت عیسیٰ کی زندگی کی تفصیل	۲	حضرت زکریا کو بیٹے کی خوش خبری
	پیدائش سے متعلق کوآلف پورب کے مجوسیوں کی آمد	۴	انجیل میں اس واقعہ کا ذکر
۱۶	مصر کی طرف روانگی۔	۶	حضرت زکریا نے اپنا وارث خدا سے مانگا تھا۔
۱۶	سات یا بارہ برس کی عمر میں واپسی	۷	انجیل میں حضرت یحییٰ (یوحنا) کی ولادت کا ذکر۔
	یوحنا سے ہتسمہ لے کر تبلیغ شروع کر دی	۸	حضرت یحییٰ کی خصوصیات۔
	چونکہ یہ تعلیم اسلاف پرستی کے خلاف تھی اس لئے		حضرت عیسیٰ
	یہودیوں نے اس کی مخالفت کی۔		از ص ۱ تا ص ۱۵۶
۱۶	سازش کر کے مقدمہ چلویا		بنی اسرائیل کی معصیت کوشیوں اور بد عنوانیوں کے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹	رینان کے بیان کے مطابق آپ مصر میں نہیں بلکہ فلسطین کے گرد و پیش یوحنا سے ملے جو ایسینی فرقہ کی تعلیم کے مرکز تھے۔	۱۹	اور صلیب پر لٹکا دیا۔
۲۴	اس وقت کے معاشرہ کی حالت	۲۱	قبسہ جی اٹھنے اور آسمان پر چلے جانے کا واقعہ
۲۵	آپ کی تعلیم کیا تھی؟	۲۵	لیکن انجیل برناباس کی شہادت کچھ اور ہے۔
۲۸	کیا یہ کہ مسیحی دعوئی و نو میدی جاوید کی ہلاکت انجیز زندگی بسر کئے جاؤ۔	۲۵	مشہور مورخ رینان کی تحقیق ان سب کے جداگانہ ہے۔
۵۰	اناجیل نے عام طور پر کچھ ایسی ہی تصویر کھینچی ہے لیکن ایسی تعلیم ایک نبی کی نہیں ہو سکتی۔	۲۷	قرآن کریم کی تصریحات
۵۰	اس لئے یہ تعلیم حضرت عیسیٰ کی نہیں، بعد کی محرف تعلیم ہے۔	۲۸	سب سے پہلے حضرت مریم کی شہادت
۵۰	آپ کی تعلیم وہی حشر بدامان انقلاب آفرین دعوت کی تعلیم تھی جو حکومت خداوندی کے قیام کے لئے ہر رسول نے پیش کی۔	۲۹	حضرت مریم کی پیدائش اور میکہ کی نذر
۵۱	اس انقلاب کے لئے سرفروشنوں کی جماعت کی ضرورت تھی یہی "انصار اللہ" حارمی تھے۔	۳۰	آپ کی کفالت کا مسئلہ
۵۲	انہی کے لئے آسمان سے مادہ نازل ہوا تھا یعنی.....	۳۱	ہیکل کی زندگی
۵۳	ان حواریوں کے متعلق اناجیل کی تصریحات۔	۳۲	حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی بشارت
۵۵	قیاس کن تو کجائی دمن کجا واعظ؟	۳۶	حضرت عیسیٰ کی پیدائش
۵۶	اناجیل میں اس قسم کی مغلویت کی تعلیم اور مغلویت کی تصویر کیوں ہے؟	۳۹	مصر کی طرف روانگی اور مراجعت
		۴۰	آپ کی تیس سال تک کی زندگی کے حالات ابھی تک منقہ شہور پر نہیں آ سکے۔
		۴۱	قیاس یہ ہے کہ یہ عرصہ ایسینی فرقہ کی معیت میں گزرا ہوگا۔
		۴۱	اس فرقہ کا مختصر تعارف
		۴۲	نبی کے قلب میں زمانہ قبل از نبوت میں تلاش حقیقت کی بے پناہ تڑپ موجزن ہوتی ہے۔
		۴۲	لیکن حقیقت کئی کسب ہنر سے معلوم نہیں کی جاسکتی۔ یہ یکسر وہی خصوصیت ہوتی ہے۔
		۴۳	رسالت حضرت عیسیٰ۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۵	حضرت عیسیٰ صلیب نہیں دیئے گئے۔ آپ پر یہودیوں کا ہاتھ پڑنے ہی نہیں دیا گیا۔	۵۸	ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ حضرت عیسیٰؑ مستبد روٹیوں سے حکومت چھین کر خدا کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔
۷۷	پھر ہوا کیا؟ فلسطین سے ہجرت۔	۵۹	تاریخ و اناجیل کی شہادات۔ چونکہ حکومت خداوندی میں اجبار و رہبان کی "خدائی" ختم ہو جاتی ہے اس لئے انہوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی۔
۷۹	ہجرت کے بعد کی زندگی کے متعلق کچھ معلوم نہیں نہ ہی قرآن کریم نے اس کا ذکر ضروری سمجھا ہے وفات مسیحؑ	۶۰	حضرت عیسیٰؑ بروز شمشیر اس باطل کو مٹانا چاہتے تھے۔ تفریق کفر و ایمان، وہی پیغام ازلی۔
۸۰	قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نزول قرآن کے وقت وفات پا چکے تھے۔	۶۱	حضرت عیسیٰؑ کے مقصد انقلاب پر ایک آخری اور حتمی شہادت۔
۸۲	توفیق کے معانی	۶۲	ایسا عظیم الشان انقلاب پیش نظر اور قوم کی یہ حالت کہ.....
۸۴	رَفَعَ إِلَى السَّمَاءِ کا قرآنی مفہوم	۶۳	ان صبر آزماء راعل میں روح القدس کی تائید واضح دلائل اور روشن معجزات
۸۹	سج مچ آسمان پر چڑھ جانا نہیں بلکہ.....	۶۴	دعوت مسیحائی کی سخت ترین مخالفت سرکش یہود اور ان کے علماء و مشائخ
۹۰	عیسائیت میں بھی یہ تخیل بعد کی پیداوار ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے واپس آنے کی نہیں بلکہ لایک اور آنے والے کی بشارت دی تھی۔	۶۵	سازش کی طرف سے سازش اور نہایت انسانیت سوز سازش۔
۹۱	فارقیط اور اناجیل کی مخالفت	۶۶	مقدمہ اور سزا۔ (اناجیل کے بیان کے مطابق کفارہ کا حقیقہ)
۹۲	غرضیکہ اتمام حجت ہو گیا اور اس کے بعد یہودیوں کی اس آخری تباہی کا وقت آ گیا جس کے بعد وہ پھر دوبارہ زندہ نہ ہو سکے۔	۶۷	ویش آئی تفصیل۔
۹۳	اور خدا کا عہد شاخ اسمعیلؑ کی طرف منتقل ہو گیا۔	۶۸	
۹۴	اسی الساعۃ کی نشانی حضرت عیسیٰؑ تھے۔	۶۹	
۹۵	پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مزید تصریحات	۷۰	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۳	لیکن سوال یہ ہے کہ حیات و وفات اور پیدائش مسیح کے مسائل کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ عیسائیوں کے ہاں تو یہ ان کے مذہب کی اصل و بنیاد ہیں اس لئے.....	۹۸	اناجیل کا بیان: سچا نبی کی ہیش گئی خود اناجیل نے آپ کو یوسف کا بیٹا لکھا ہے۔
۱۳۴	لیکن مسلمانوں کے ہاں کیوں؟ اس لئے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین نہیں جدید ہندی "نبوت" اور ان مسائل کی اہمیت ان مسائل میں الجھنے کا نتیجہ؟	۱۰۱	عقیدہ ابنیت سینٹ پال کی اختراع ہے۔ خود عیسائیوں میں ایسے فرنے موجود تھے جو اس عقیدہ سے انکار کرتے تھے۔
۱۳۵	"مسیحی و محکومی و نامیدی جاوید"	۱۰۲	رینان کی تحقیق۔
۱۳۶	ایک آنے والے کا عقیدہ۔ ان تمام مسائل کا ایک جواب۔ لیکن اس سے بھی ذرا آگے بڑھ کر اپنی حالت کو دیکھئے۔	۱۰۲	تورات میں "خدا کا بیٹا" برگزیدگی کے لئے استعمال ہوا ہے۔
۱۳۸	عیسائیوں کے معتقدات اور ان کا غلو۔ لیکن ان کے موجودہ ارباب تحقیق ان باطل معتقدات سے خود ہی انکار کئے جا رہے ہیں۔	۱۰۳	قرآن کریم کا سببان۔
۱۳۹	کفارہ کا عقیدہ جس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ اس عقیدہ کا بطلان خود اہل مغرب کی زبانی دُنیا طوقا ذکر قرآن کی طرف آرہی ہے۔	۱۰۵	حضرت زکریا اور حضرت مریم کو بشارات حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش یہود کی طرف سے طعن و تشنیع کیوں تھا؟
۱۴۰	واقعہ تصلیب سے متعلق ایک اور آیت اور اس کا مفہوم۔	۱۱۲	فقیہوں اور فریسیوں کی نقاب کشائی
۱۴۱		۱۱۳	نفی روح سے مراد کیا ہے؟
۱۴۲		۱۱۵	کلمۃ کے معنی کیا ہیں؟
۱۴۳		۱۲۲	عام بات۔ خصوصیت والی بات۔ مشن اور مقصد تو ان میں البیہ۔
۱۴۴		۱۲۳	یہی قوانین کتاب خداوندی میں منضبط ہیں۔
۱۴۵		۱۲۸	حضرت عیسیٰ کیسے کلمۃ اللہ بنے؟
۱۴۶		۱۳۰	پیدائش حضرت عیسیٰ سے متعلق ایک اور آیت
۱۴۷		۱۳۱	إِنَّمَا مَثَلُ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ مَثَلُ الْآدمِ اس سے کیا مفہوم ہے؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	زندگی بسر کیا کرتے تھے۔		دکوئی اہل کتاب ایسا نہ ہوگا جو موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے۔
	بعد میں اس نے ایک متعین مسلک کی شکل اختیار کر لی۔	۱۴۷	ایک ضمنی گوشہ۔
۱۵۹	ابتدائی دور کا ایک عبرت انگیز واقعہ	۱۴۹	دشمن سے محبت یا عدل؟
۱۶۰	رقیم کہاں واقع ہے؟	۱۵۰	عیسائیوں کے لئے "یوم الحشر" کو نسا دن تھا؟
۱۶۲	خار کی زندگی۔		انجیل۔
۱۶۳	اس کے بعد ایک مرتبہ آبادی کا رخ کیا۔	۱۵۱	انجیل حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔
۱۶۵	ان کے معتمد میں نے اس خار کو معبود بنا دیا۔	۱۵۲	نور و ہدایت کا سرچشمہ اور تورات کی صدق۔
	خانقاہوں کی زندگی کبسی ہوئی تھی؟		اس میں ایسی ہی مبنی بر صداقت تعلیم تھی جیسی
	اس قسم کے خاروں کی تفصیل تورات	۱۵۳	قرآن کریم میں ہے۔
۱۶۷	اور تاریخ میں۔		لیکن یہ انجیل مخوف ہو گئی۔
۱۶۰	فلسفہ رہبانیت۔		اور اس کی تعلیم قرآن کریم کے اندر آگئی۔
	خانقاہوں کے حیا فروش فتنے!!		عیسائیوں نے اسے قبول نہ کیا اور خدائی
۱۶۱	اور ان فتنوں کی عبرت انگیز تفصیل		برکات سے محروم ہو گئے۔
۱۶۴	یہ اور ہم	۱۵۵	خلاصہ بحث۔
	قللہ الرسل از ص ۱۶۶ تا ص ۲۳۱		اصحاب کھف از ص ۱۵۷ تا ص ۱۶۴
۱۶۷	کاروان شوق منزل کے قریب		عیسائیت اور مسلک خانقاہیت
۱۶۸	اس جو بہار آسمانی کی خصوصیات	۱۵۸	یہ مسلک انسانوں کا خود ساختہ تھا۔
	اسلام کیا ہے؟ الدین اور الاسلام		خلوت گزینی کی ابتدا اس سے ہوئی کہ خدا پرست
۱۶۹	کا مفہوم کیا ہے؟		لوگ مستند قوتوں کے خوف سے چھپ چھپا کر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۸	کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ ان کے دوائر تبلیغ و تعلیم کے اعتبار سے	۱۸۰	انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق۔ انسان خارجی اور داخلی اثرات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے صحیح ضابطہ زندگی کے اندر رکھنے کے لئے قوانین کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس نظام میں قوانین الہیہ نافذ ہوں اسے نظام حکومت الہیہ کہتے ہیں۔
۱۸۹	بعض کو بعض پر فضیلت ضرور تھی۔ چونکہ یہ حضرات انسانوں کی تعلیم و ہدایت کے لئے آتے تھے اس لئے سب انسان ہوتے تھے اور انسانوں میں سے بھی مرد۔ رسول کا علم (وحی) خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتا تھا۔	۱۸۱	حضرات انبیاء کرام اسی حکومت کے قیام کے لئے آتے تھے۔ ان حضرات کی تسلیم ایک ہی تھی۔ اس تعلیم کا نقطہ ماسک تھا، توحید یعنی اللہ کے سوا کسی کی حکومت جائز نہیں اس حکومت خداوندی کا عملی طریق یہ تھا کہ حکومت الہیہ کے مرکز اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کی جائے۔ یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہ تھی بلکہ اس نظام کی اطاعت تھی جو قوانین الہیہ کو نافذ کرتا تھا۔ اصل و اساس ایک تھی لیکن اقتضائے زمانہ سے جزئیات میں فرق ہوتا تھا۔ بائیں ہمہ ان حضرات انبیائے کرام میں کسی قسم
۱۹۰	اس باب میں حکمائے مغرب کا اعتراف ارباب حکومت اور اراکین مذہب کی طرف سے اس دعوت انقلاب کی مخالفت۔ استہزار جذبہ اسلاف پرستی میں تکذیب۔ مترفین کی طرف سے مخالفت۔ مترفین کون ہیں؟ قیصریت و برہنیت دولوں کے علمبردار۔ اس انقلاب کے لئے مادی قوتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کرام مادی قوتوں کو قوانین الہیہ کے تابع رکھنا سکھاتے تھے۔ مخالفین کی طرف سے دوسری کوشش یہ ہوتی کہ رسول ان کے ساتھ مصالحت و مفاہمت کرے۔	۱۸۲	
۱۹۲		۱۸۳	
۱۹۳		۱۸۴	
۱۹۴		۱۸۵	
۱۹۷			
۱۹۸			
۲۰۱			
۲۰۱			
۲۰۳			

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۶	خدا کے سچے پیغام کو پھر اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیتا۔	۲۰۴	لیکن حق اور باطل میں مفاہمت کیسی؟
۲۱۷	البتہ ضروریات زمانہ کے اعتبار سے دین کی جزئیات میں ارتقائی تبدیلی ہو سکتی تھی۔	۲۰۶	اس تمام جدوجہد میں رسول کسی سے اجر و خدمت نہیں مانگتا۔
۲۱۸	لیکن نئے رسول کے آنے کے بعد ایمان اطاعت اس کی لازم آجاتی۔	۲۰۷	رسول کے مخاطبین دو گروہوں میں بٹ جاتے۔
۲۲۰	یہ کیوں؟ اس لئے کہ —	۲۰۸	ایک ماننے والے دوسرے نہ ماننے والے
۲۲۱	کیا تمام (موجودہ) مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں؟	۲۰۹	بس یہی تقسیم تقسیم خداوندی ہے۔
۲۲۲	ایک اہم بحث۔	۲۱۰	ان دونوں جماعتوں میں تصادم و تضام ہوتا۔
۲۲۳	حضرت انبیائے سابقہ کی کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم۔	۲۱۱	انکار و دعوت حق کا لازمی نتیجہ عذاب خداوندی۔
۲۲۴	ہر حالے والا بعد میں آنے والے کی تصدیق کی تاکید کر کے جاتا تھا۔	۲۱۲	عذاب سے مفہوم کیا ہے؟ یہ کس طرح آتا ہے؟
۲۲۵	آخر میں رسول آخر الزماں خدا کا آخری پیغام لیکر تشریف لائے۔	۲۱۳	اس کی تشریح میں سورۃ یسین کی چند آیات جلیلہ
۲۲۶	قرآن۔ پہلی کتابوں کی اصلی تعلیم بھی اسی کے اندر ہے۔	۲۱۴	رسول کی تشریح اس کی تکذیب کا مفہوم
۲۲۷	اب اطاعت اس پیغام خداوندی کی ضروری ہے۔	۲۱۵	ابتداء رسول ہرستی اور ہر قریہ میں آتے تھے۔
۲۲۸	حضرات انبیائے کرام کی سیرت جمالی و جلالی پر نکتہ باز گشت۔	۲۱۶	اس کے بعد علاقوں کے صدر مقامات میں رسول آتے رہے۔
۲۲۹	ایک ضروری نکتہ۔ امت محمدیہ۔	۲۱۷	اور جب تمام انسانوں میں ایک برادری بننے کی صلاحیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تو تمام انسانوں کے لئے آخری رسول آگیا۔
۲۳۰		۲۱۸	رسول کے بعد کچھ عرصہ تک لوگ اس کی صحیح تعلیم کی اتباع کرتے۔
۲۳۱		۲۱۹	پھر رفتہ رفتہ اس میں تحریف و الحاق ہو جاتا۔
		۲۲۰	ایسی صورت میں پھر ایک اور رسول آ جاتا جو

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۱	قلب نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی۔		
"	ایمان ہی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔		
۲۴۲	قوموں کی ہلاکت کیسے ہوتی ہے؟		
۲۴۳	ہلاکت کا عذاب کس کس شکل میں مسلط ہوتا ہے؟	۲۳۳	علم تاریخ کی اہمیت
۲۴۴	حوادث ارضی و سماوی کی صورت میں بھی		انسانی متاع علم و تہذیب اسی کی بدولت ہے۔
۲۴۵	اور قوم میں باہمی نفرت انگیزی سے بھی۔	۲۳۵	قرآن کریم کی رو سے علم تاریخ کی اہمیت۔
	عذاب کی صورت کوئی ہو، نتیجہ ہمیشہ ایک ہی		وہ اقوام گذشتہ اور اُمم سابقہ کے احوال و ظروف
۲۴۵	ہوتا ہے۔		کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے۔
	یعنی۔ ذلت و رسوائی، محکومی و غلامی۔		وہ کہتا ہے کہ جس طرح عالم طبیعیات میں قوانین
۲۴۶	یہ سب کچھ غیر محسوس طور پر ہو جاتا ہے۔		ضوابط غیر تبدیل ہیں اسی طرح انسانوں کی
۲۴۷	اور ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آجاتی ہے۔		عمرانی و اجتماعی زندگی کے لئے بھی اٹل قوانین
۲۴۹	ظہورِ ستارح کا وقت	۲۳۷	متعین ہیں۔ (سُنَّةِ اِله)
۲۵۲	طاقت اور تباہی کن جرائم کی پاداش میں آتی ہے؟		استحکام و ارتقار ان کے لئے ہے جو ان
"	ابدی حقائق سے انکار (کفر)		قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔
۲۵۳	انکار ہی نہیں بلکہ تکذیب		اور ہلاکت و فنا ان کے لئے جو ان قوانین سے سرکشی
	یہ انکار و تکذیب محض اس بنا پر کہ یہ حقائق اس		اختیار کریں۔
	روش کے خلاف ہیں جو آبار و اجداد سے		یہی قانون خداوندی ہے جو شعور سے آج تک
	منوارث ملتی آتی ہے۔		چلا آرہا ہے۔
۲۵۵	تکذیب سے بھی آگے۔ استہزاء		اسی کو سنت اللہ کہا جاتا ہے۔
	پھر کھلی ہوئی بغاوت، ظلم و سرکشی	۲۳۸	یہ سنت اللہ کسی کے لئے نہیں بدلتی۔
	یہ سب کچھ قوت اور دولت کے نش		یہ سنت اللہ کیا ہے؟
۲۵۶	کی وجہ سے۔	۲۴۱	(ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷۸	اس کے لئے سیرو فی الارض کا تائیدی حکم دیا گیا۔	۲۷۲	در نہ یہ لوگ سمجھ بوجھ سب کچھ رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں۔
۲۸۲	قرآن کریم کے ان گوشوں پر تدبر سے ایک خاص مومنانہ فراست پیدا ہو جاتی ہے	۲۷۴	لیکن جب کسی سوسائٹی میں اخلاقی اقدار بدل جاتیں تو پھر عیب، عیب ہی نہیں رہتا۔
۲۸۳	جس سے ایک مرد مومن کسی تہذیب کی بنیادوں کے اس کے آل کا پتہ لگا لیتا ہے۔	۲۷۵	یہ تمام سرکشی اور بغاوت قوم کے اکابر کی طرف سے ہوتی ہے۔
۲۸۴	تہذیبِ حاضر کی خود تخریبی اور خود کشی۔		ان حالات و کوائف کے بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ انہواری اقوام جہت حاصل کریں اور
۲۸۶	کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کا خاتمہ ہو رہا ہے ؟	۲۷۸	قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھیں۔
	بالکل نہیں ! انسان ٹھوکریں کھا کھا کر آئین	۲۷۳	اقوامِ گزشتہ کی تاریخ کا ایک اور ذریعہ۔
	خداوندی کے قریب آ رہا ہے اور قریب آتا چلا جائے گا۔		اثری انکشافات
۲۸۷	اُممِ سابقہ سے ہمارا واسطہ۔		قرآن کریم نے اس گوشہ پر بھی بہت زور دیا ہے۔
		۲۷۶	اقوامِ گزشتہ کے کھنڈرات پر غور و تدبر کا حکم۔

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ
جملہ آمدن شہرانی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

پرویز صاحب کی زندگی کا مشن 'خدا کی کتاب عظیم کا سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا' ہے۔ اس کے سمجھنے کا سلسلہ تو ان کے اوائل عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن اس کے حقائق و معارف کو قوم کے سامنے پیش کرنے کے مربوط سلسلہ کا آغاز ۱۹۴۱ء سے ہوا تھا جب انہوں نے سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد شائع کی جس کا عنوان تھا۔ اللہ۔ اس سلسلہ کی دوسری اور تیسری کڑیاں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئیں۔ دوسری کڑی میں 'انسان و آدم' ملائکہ، ابلیس، وحی وغیرہ موضوعات کے علاوہ 'حضرت نوح'، حضرت ہود و حضرت صالح (علیہم السلام) کے کوائف حیات شامل تھے اور تیسری جلد حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک کے انبیاء کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل تھی۔ ازاں بعد جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا وقت آیا تو مناسب سمجھا گیا کہ ہر جلد کو اس کے موضوع کی نسبت سے الگ نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ وہ تین جلدیں 'ان پانچ مجلدات کی شکل میں شائع ہوئیں۔

(۱) من دینواں۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآن کریم میں عطا کردہ تفصیل بڑی حسن و خوبی سے پیش کی گئی ہیں۔

(۲) ابلیس و آدم۔ انسان، آدم، ملائکہ، شیطان، ابلیس، جن، روح، وحی، رسالت وغیرہ عنوانات سے متعلق حقیقت کشا مباحث۔

(۳) جوئے نورد۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک کے انبیاء کے کوائف حیات۔

(۴) بوقِ طور۔ حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء نے بنی اسرائیل کے تذکارِ زندگی اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت آموز داستان۔

(۵) شعلہ مستور۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے سوانح حیات۔

ان میں سے شعلہ مستور ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی اور مدت سے نایاب تھی۔ اس دوران میں یورپ اور امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات سے متعلق ایسی تحقیقاتی تصانیف شائع ہوئیں جن میں بہت سے راز ہائے مستور سامنے لائے گئے۔ جب شعلہ مستور کے جدید ایڈیشن کا تقاضا ہوا تو مصنف نے ضروری سمجھا کہ تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں اس کے تاریخی مذکورات پر نظر ثانی کی جائے۔ اس سے اس میں کافی حکم اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ یہ تازہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معلومات افزا ہے۔

پرویز صاحب نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تعارف میں 'اس کے نام کے سلسلہ میں ایک وضاحت کی تھی۔ اسے ہم 'اس کی اہمیت کے پیش نظر دہرا دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جیسا کہ معلوم ہے "حضرات انبیاء کرام آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا مشن یہ ہوتا تھا کہ طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر ان کی جگہ ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانین خداوندی پر مشتمل ہو۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اس سلسلہ زریں کی ایک اہم کڑی تھے اور ان کا مقصد رسالت بھی آسمانی انقلاب تھا۔ لیکن اس انقلابی جدوجہد کی صرف ایک جھلک ہمارے سامنے آتی ہے جس کے بعد آپ ہجرت کر جاتے ہیں، ہجرت کے بعد کے واقعات قرآن نے بیان نہیں کئے۔ اس اعتبار سے کتاب کا عنوان "شعلہ مستور" تجویز کیا گیا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت نے بھی انقلابی دعوت کی بجائے خانقاہیت کی زندگی کو مقصود دین قرار دے لیا اور اس طرح یہ برقی خاطر غاروں میں چھپ کر رہ گئی۔ یہی مستور شعلہ نبی اکرمؐ کے عہد میں اس درخشندگی و تابندگی سے بے نقاب ہوئے کہ ان سے ساری فضائے عالم مرقع نور و نار بن گئی۔ نارا باطل کے بخرس و خاشاک کے لئے اور نور ہر نگہ بصیرت طلب کے لئے تفصیل اس اجمال کی آپ کو "معراج انسانیّت" میں ملے گی۔

(۱۰)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے آیات کے حوالہ میں 'اور سورة کا نمبر ہوتا ہے اور نیچے آیت کا۔ (مثلاً ہم ۲/۲ سے مراد ہے 'سورہ بقرہ کی چوبیسویں آیت۔

(۱۱)

پرویز صاحب کی تصانیف کی اشاعت کی سعادت طلوع اسلام ٹرسٹ کے حصہ میں آئی ہے جس پر ہم جس قدر بھی فخر کریں کم ہے، اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ نظام طباعت و غیرہ کی عام حالت کی وجہ سے ہم انہیں سابقہ معیار کے مطابق پیش نہیں کر سکتے۔ امید ہے قارئین کے حسن ذوق کے نزدیک ہماری یہ معذرت قابل پذیرائی ہوگی۔ والسلام

جنوری ۱۹۶۵ء

طلوع اسلام ٹرسٹ

وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ مَمُوتٍ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۱۹/۱۵)

حضرت

زکریا
و
حکیم

علیہم السلام

قافلہ بہارِ طاہرِ پیشِ رسِ نگر!

حضرت زکریا و یحییٰ

عَلَيْهِمُ السَّلَامُ

وہ کاروانِ رشد و سعادت، جو صبحِ ازل خراماں خراماں سوئے منزل روانہ ہوا تھا، اب رفتہ رفتہ منزل کے قریب آتا جا رہا ہے۔ اس کعبۂ مقصود سے ایک پڑاؤ اور ہر مقامِ مسیحِ ناصری (علیہ السلام) ہے۔ اور جس مقدس سنگِ میل پر ہم اب پہنچے ہیں وہ اس مقام کا گویا نشانِ راہ ہے۔ یعنی حضرت زکریا جن کی کفالت میں حضرت مریمؑ کو تفویض کیا گیا (۳۴/۳) اور حضرت یحییٰ (یوحنا) جنہوں نے قریہ قریہ میں (حضرت) مسیحؑ کی منادی کی۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

هٰذَاكَ دَعَا زَكْرِيَّا رَبِّهٖ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ
ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَا ۝ (۳۸/۳)

اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربانِ گاہ کا) کہ زکریا نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی، ”خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے!“

اللہ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور ایک فرزندِ صالح کی بشارت دی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ اِنَّ اللّٰهَ

يُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ مُّصَدِّقًا لِّكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيُدْأَوْحُصُّوْكَ
وَبَدِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳/۳۹)

ملا کہ نے زکریا کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا مصروف دعا تھا۔ ”خدا تمہیں عیسیٰ کی
(یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام عیسیٰ رکھا جائے) بشارت دیتا ہے۔ وہ
قوانین خداوندی کو سچ کر دکھانے والا، ایک بڑی جماعت کا لیڈر صاحبِ نظم و ضبط
اور بلند ترین صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔

اس بشارت پر حضرت زکریا متعجب ہوئے۔ جیسے اس سے پیشتر حضرت ابراہیم کی
بیٹے کی خوشخبری | بیوی، بیٹے کی خوشخبری پر حیران ہوتی تھیں۔

قَالَ رَبِّ اَنۡیَ یُّکُوْنُ لِیۡ عَلٰمٌۢ وَّ قَدْ بَلَغَیۡنِی الْکِبَرُ وَاُمْرَآتِی
عَاقِرٌ ۚ قَالَ کَذٰلِکَ اَللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝ (۳/۴۰)

زکریا نے جب یہ سنا تو کہا، ”خدایا! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو
چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟ (کیا میرے ہاں سچ و سچ بیٹا پیدا ہوگا یا اسی طرح
کوئی لڑکا مل جائے گا جس طرح مریم جیسی بیٹی ملی تھی) جواب ملا کہ نہیں جس طرح ہمارے
قانونِ مشیت کے مطابق بیٹے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح یہ پیدا ہوگا۔

آپ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیۡ اٰیةً ۚ قَالَ اٰیٰتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمَزًا ۚ وَاذْکُرْ رَبَّکَ کَثِیْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ
وَالْاُبْکَارِ ۝ (۳/۴۱)

اس پر زکریا نے عرض کیا، ”خدایا! اس بارے میں میرے لئے کوئی خاص حکم ہو تو فرما
دیجئے۔“ ارشاد ہوا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم تین دن تک بات چیت نہ کرو مگر
صرف اشارہ سے (یعنی روزہ رکھو جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا) قانونِ خداوندی کو
شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو اور باقی جس طرح تمہارا معمول ہے اپنے فرائض کی
تکمیل میں صبح و شام مصروف رہو۔

یہودیوں میں روزہ میں بات چیت بھی منع تھی۔ لوقا کی انجیل میں اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ایلیاہ کے فریق میں سے زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی یسوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام ایسبج تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستہ باز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ ایسبج ہانچہ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔

جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوگا کہ کہانت کے دستور کے مطابق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا مانگتا رہی تھی کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی دہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا اور زکریا دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی مگر فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سن لی گئی اور تیری بیوی ایسبج تیرے لئے بیٹا جنے گی۔ تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی خرمی ہوگی اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سببے خوش ہوں گے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ ایلیاہ کی روح اور وقت میں اس کے آگے آگے چلے گا والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے زکریا نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا میں جبریل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں۔ اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں تو چپکار رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا اور لوگ زکریا کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے

معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رو یاد بھی ہے اور وہ اُن سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا پھر ایسا ہوا کہ جب اس کی خدمت کے دن پورے ہو گئے تو وہ اپنے گھر گیا۔

(لوقا کی انجیل ۵۱-۱/۲۳)

(قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریاؑ کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی) اس کے بعد حضرت یحییٰؑ (یوحنا) پتسمہ دینے والے کی ولادت کا ذکر ہے۔

اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا۔
(لوقا ۱/۸۰-۱)

سورہ مریم میں ہے۔

إِذْ نَادَى رَبَّهُ يَدَاْعٍ خَفِيًّا ۖ قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا ۖ لَمْ أَكُنْ بِدُعَاؤِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۚ
وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي ۚ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا ۚ فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۖ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ
يَعْقُوبَ قُلْ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۖ (۱۹/۴-۳)

جب ایسا ہوا تھا کہ زکریاؑ نے اپنے نشوونما دینے والے کو انتہائی خاموشی سے

پکارا (۳/۳۷)

اور کہا کہ اے میرے پروردگار! میں بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے سر کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ اے میرے نشوونما دینے والے! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا ہو اور تُو نے نہ دیا ہو۔ (تیری اس رحمت نے پایاں سے مجھے امید ہے کہ میری بڑھاپے کی یہ دعا بھی شرف قبولیت سے نوازی جائے گی)۔

(میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اس لئے 'نظر بظاہر' اب مجھے اولاد کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ اور اولاد نہ ہونے کا مجھے غم اس لئے ہے کہ ہمارے جدِ امجد حضرت یعقوبؑ کی برکات اور خصوصیات 'اس کے گھرانے میں' نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہوئی، مجھ تک پہنچی ہیں۔ میرے بھائی بندوں میں کوئی اس قابل

نہیں جو ان کا اہل ہو سکے۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے بعد انہیں ضائع کر دیں گے اور یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکے گا۔ اس لئے میری دعا یہ ہے کہ تو اپنی جناب سے مجھے کوئی ایسا وارث عطا کر دے جو ان برکات و نعمات کا اہل بن سکے تاکہ میں انہیں اس کے سپرد کر جاؤں۔ وہ ایسا ہونا چاہیے جو اس منصبِ جلیلہ کے لئے ہر طرح سے موزوں اور تریبی نوازشات کا صحیح طور پر مستحق ہو۔

ہم اس سے پیشتر (برقی طور میں) حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا وارث کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے وارث کے لئے بحضور رب العزت دعا مانگی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام رہبانیت کی زندگی بسر نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے اہل و عیال ہوتے تھے اور وہ اولاد کے لئے بھی آرزو رکھتے تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی سامنے آچکی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق بعض حالات میں باپ بھی نبی ہوتا تھا اور بیٹا بھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نبوت، باپ سے بیٹے کی طرف ورثاً منتقل ہوتی تھی۔ نبوت یکسر وہی طور پر ملتی ہے۔ اس میں نہ ذاتی کسب و ہنر کو کوئی دخل ہوتا ہے نہ حسب و نسب کا کوئی تعلق۔ بیٹے کو نبوت اس لئے ملتی تھی کہ وہ نبوت پانے کی خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا اس لئے خدا سے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا۔

بہر حال حضرت زکریاؑ نے دعا مانگی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

يٰۤاٰزَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اَسْمُهُ يَحْيٰى ۚ لَمْ نَجْعَلْ
لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ (۱۹/۷)

(اس پر حکم ہوا) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔ یہ لڑکا ایسا ہوگا جس کی نظیر تمہارے خاندان میں نہیں ملے گی۔

انجیل لوقا میں ہے۔

اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے۔

انہوں نے اس سے کہا کہ تیرے کہنے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انہوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تمتی منگا کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے اور سب نے تعجب کیا کہ اسی دم اس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔
(لوقا کی انجیل (۵۹-۱/۴۴)

اس بشارت پر حضرت زکریا نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اَلْنِي يَكُونُ لِي غُلَامٌ ۚ وَكَانَتْ اِمْرَاَتِي عَاقِرًا ۚ
قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ (۱۹/۸)

زکریا نے (متعجب ہو کر) کہا کہ پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے؟ میری بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا۔

اس کے بعد آیات (۹ تا ۱۱) میں دی ہی کچھ کہا گیا ہے جو آیات (۴۰-۳/۴۱) میں پہلے آچکا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ فرزند عطا فرمایا جسے بچپن میں ہی فہم و بصیرت عطا کر دی گئی اور جب بڑا ہوا تو اسے نبوت (کتاب ہائے دی گئی۔ سورہ مریم میں ہے

حضرت عیسیٰ

يَسْمَعِي خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۚ اَلَيْسَ كُنْهِيَ اِضْلَالُهُ قَوَانِيْنِ خُدا وَنَدَى كُوْتُوْتِ دَاقْتِدَارِ
کے ساتھ محکم طور پر تھا مگر "تسارن کریم نے یہاں ایک لفظ میں ساری حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ عیسائیوں

کے عام تصور اور انانجیل کے بیان کے مطابق "حضرت عیسیٰ" JOHN THE BAPTIST ایک فقیر

بادیہ نشین تھے جو لوگوں سے اخلاقی و عظمیٰ کہتے اور انہیں پانی میں بپتسمہ دیتے تھے اور نہایت مظلومیت کے عالم میں، ایک رقاصہ کی فرمائش پر سردر باران کا سر قلم کر دیا گیا۔ لیکن قرآن کی رو سے، خدا کے رسول، عظیم انقلابات کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ ان کا مشن، دنیا میں "خدا کی حکومت" کا قیام ہوتا ہے اور اس راستے میں جو بھی حائل ہو اس کا مقابلہ کرنا۔ حضرت عیسیٰ بھی خدا کے رسول تھے اور ان کا مشن بھی یہی تھا۔ اسی لئے ان

لہ انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق حضرت عیسیٰ نے فرمایا:

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے

والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔ (۱۰/۱۱)

سے کہا گیا کہ "خدا کی کتاب کو قوت (اقتدار) کے ہاتھوں سے تھامو" قوت کے بغیر کتاب محض وعظ رہ جاتی ہے۔

عصانہ ہو تو کلیسیا ہے کارِ بے بنیاد

حضرت یحییٰ کے مواعظ، رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف اعلانات بغاوت تھے۔ چنانچہ (MARCELLO CRAVERI) کی تحقیق کے مطابق، وہ نظم و نسق حکومت کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتے اور لوگوں سے کہتے کہ اب یومِ مکافات قریب ہے۔ ظالموں کی حکومت کا شجرہٴ خبیثہ جڑ سے کٹ جائے گا۔ اگر نبی اسرائیل سب کے سب ختم بھی ہو جائیں گے تو بھی اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جس کے ہاتھوں باطل کا تختہ الٹ جائے گا۔ (THE LIFE OF JESUS)۔ یہ "وعظ" ایک فقیر بادیہ نشین کے نہیں ہو سکتے، ایک عظیم مصلح کے انقلاب آفریں اعلانات ہو سکتے ہیں۔ یہ تھے (قرآن کریم کی رو سے) حضرت یحییٰ جنہیں منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا اور ان تمام خصوصیاتِ حسنہ سے نوازا گیا تھا جو باعثِ شرفِ انسانیت ہیں (۱۳ — ۱۹/۱۵)۔

سورۃ انبیاء میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ۖ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ (۸۹ — ۹۰/۲۱)

اور اسی طرح زکریا کا بھی معاملہ یاد کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے اس دنیا میں 'بغیر وارث کے تنہا نہ چھوڑ' اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ تو ہی ہم سب کا بہترین وارث ہے۔ (لیکن اس قسم کے وارث کی ضرورت بھی ظاہر ہے) (۳/۳۷)؛ (۵۱ — ۵۲/۱۹)۔

ہم نے اس کی پکار سُن لی اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے اسے یحییٰ جیسا بیٹا عطا کر دیا۔

یہاں وَ أَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ حضرت زکریا نے عرض کیا تھا کہ میری بیوی

عقیم ہے اس لئے اس کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی (وَاضْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ) كَذَلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۳/۴۰) اللہ اپنی مشیت کو اس طرح پورا کر دیا کرتا ہے۔

حضرت زکریا اور یحییٰ (علیہم السلام) کا نام دیگر انبیائے کرام کے زمرہ میں سورۃ النعام میں آیا ہے۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ ۝ كُلٌّ مِّنَ
الْمُضِلِّينَ ۝ (۶/۸۵)

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح
انسانوں میں سے تھے۔

تورات میں زکریا، عیسیٰ کا ایک صحیفہ بھی موجود ہے لیکن ان کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اس لئے حضرت یحییٰ کے والد (حضرت زکریا) اُن سے الگ شخصیت ہیں۔

(۱۰)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم نے حضرت یحییٰ کی خصوصیت گہری یہ بتائی ہے کہ ”وہ ایک عظیم جماعت کے لیڈر، صاحبِ نظم و ضبط اور بلند ترین صلاحیتوں کے مالک تھے“ (۳/۳۹)۔ آگے چل کر اس زمانے کی ایک وسیع و عریض تحریک کا تفصیلی تعارف آپ کے سامنے آئے گا جسے ایسینی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ انقلابیوں کی ایک بڑی مؤثر جماعت تھی جو سلطنتِ روم کے استبداد اور اخلاقی خرافات کے استیصال کے لئے رُوبہ عمل تھی۔ حضرت یحییٰ اس جماعت کے مرکز تھے اس لئے بڑی قوتوں کے مالک۔ تورات یا انجیل میں نہ ان کی ان خصوصیات کا ذکر ہے نہ ایسینی جماعت کی انقلابی سرگرمیوں کا کوئی تذکرہ۔ اس کے برعکس، ان کے قتل کی جو داستان انجیل متی میں درج ہے، وہ ایک افسانہ نظر آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

اُس وقت چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودس نے یسوع کی شہرت سنی اور اپنے خادموں سے کہا کہ یہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔ وہ مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اس لئے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہیرودس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سب سے یوحنا کو پکڑ کر باندھا اور قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے کہ

یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ اس کا رکھنا تجھے روا نہیں اور وہ ہر چند اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ اسے نبی جانتے تھے لیکن جب ہیرودس کی سالگرہ ہوئی تو ہیرودیا اس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر ہیرودس کو خوش کیا وہ اس پر اس نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا کہ جو کچھ تو مانگے گی تجھے دوں گا جوہ اپنی ماں کے سکھانے سے بولی کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر نکال میں یہیں مجھے منگوا دے ۵ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے اور آدمی بھیج کر قید خانے میں یوحنا کا سر کٹوا دیا اور اس کا سر نکال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا اور وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی اور اس کے شاگردوں نے اگر اس کی لاش اٹھالی

اور اسے دفن کر دیا اور جا کر یسوع کو خبر کر دی ۵ (متی کی انجیل . باب ۱۴ . آیات ۱۲-۱۱)

یہ قصہ پھر شاعروں اور ادیبوں کے ہتھ چڑھا اور "قصہ سلومی" کے نام سے وجہ رنگینی مجالس بنتا چلا گیا۔ لیکن قرآن کریم میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔

حضرت عیسیٰ کے بعد آسمانی انقلاب کا یہ پروگرام حضرت عیسیٰ کی طرف منتقل ہو گیا جن کا تذکارِ جلیلہ آئندہ صفحات میں وجہ فروغ دیدہ ہے۔

یہ ہیں رسولؐ !

إِنَّكَ مِنَ الرُّسُلِ

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (۲/۲۵۳)

بنگر کہ جوئے اب چہستانہ می رود !!

مِلکِ السُّلُسُ

یہ ہیں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام

طاہرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل جھللاتے تاروں کی سکوت افزا شبِ نبی چھاؤں میں، جانبِ منزلِ روانہ ہوا تھا، قنیلِ آسمانی کی بصیرِ افروز و جہاں تابِ روشنی میں 'زمزمہِ سنج و نغمہ بار' جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزلِ روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح 'دور سے مسکراتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس مقصدِ عظیم کی تکمیل ہوگی جس کے لئے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گل مقامِ شرف و مجدۃِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیمایا ہوا۔ نفوسِ قدسیہ کا یہ قافلہٗ رشد و ہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کبکشاں سے فرازِ کوہ پر جلوہ بار و گہر ریز ہوئی اور سینہ کو ہزار کوہِ حیرتی، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سر و زندگی کو اپنی لبروں کے آغوش میں پرورش دیتی، داخلِ دشت و صحرا ہوئی۔

در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب واکرد چشمِ شوق باغوشِ کوہِ سار
از سنگِ ریزہ نغمہ کشاید خرم او سیمائے اوچو آئینہ بے رنگ بے غبار

زی بحیرہ پیکرِ انہ چہستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بے گانہ می رود

اے مشہورِ جرمن مفکر اور شاعر گوئیں گے نغمہٗ محمدؐ کے نام سے ایک بڑی پیاری نظم لکھی تھی جس کا ترجمہ علامہ اقبالؒ نے پیامِ شرق میں شائع کیا تھا یہ اسی نظم کے بند ہیں۔

یہ مست خرام جو تبارِ دشت و صحرا میں زمین صالح کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک اور برکشتِ زبوں حاصل کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ گاہ اپنی سکوت افزا وانیوں سے سبزہ نود میدہ کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی اور گاہ کفِ بروہاں طغیانوں سے بڑے بڑے سرکش و تناور درختوں کو جڑ سے اکھڑتی، این و آں سے بے نیاز، ماحول سے مستغنی، گرد و پیش سے غیر متاثر، اپنی خودی میں مست، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے بے رنجی برستی اور صرف اس قانونِ سرمدی کا اتباع کرتی جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، جانبِ منزل بڑھتی چلی گئی۔

دریائے پُر خروش زبند و شکنِ گذشت از تنگنائے وادی و کوہ و دکنِ گذشت
یکساں چوسیل کردہ نشیب و فراز را از کلخِ شاہ و بارہ و کشت و چمنِ گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار در ہر زماں بتانہ رسید از کہنِ گذشت
زمی بجسہ ہیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ قافلہٗ رشد و ہدایت، یہ کاروانِ نور و نکبت، ہر ناقہٗ بے زمام کو دعوتِ قطار دیتا اور ہر رہرو سفرِ حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں اتنا منزل نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ تکمیلِ سفر کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم پاشکتہ کیا لگا سکتے ہیں نہ جن کے قدم آشنائے جادہ نہ آنکھیں شناسائے منزل؟ اس والہانہ کیفیت کا پوچھئے کسی ایسے قلبِ زندہ سے جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بہر کیف، یہ راحلہٗ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے! ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بند ہے کہ اب اگلا قدم حرمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں ان تیاریوں میں مصروف ہے، آئیے ہم ان کی قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہ باز گشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامنِ نگاہ میں لئے ان کے ساتھ آگے بڑھیں کیونکہ اس سے آگے فاران!

لے سیرتِ نبی اکرمؐ مقصود ہے۔ یہ سیرت، معراجِ انسانیت کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

کی مقدس وادی میں پہنچ کر جہاں کا ہر سنگریزہ جلوہ فروش مدطور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرف نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ بھود ہوگی۔

کائنات کی ہر شے ایک مقررہ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس روشِ تسلیم و رضا **اسلام کیا ہے؟** کا نام اسلام (جھک جانا) اور جس قانون کی اطاعت ہو رہی ہے اس کا نام دین (نظامِ اطاعت یا مسلکِ زندگی) ہے۔ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی کسی آئین و نظام کے سامنے جھکنا ضروری ہے۔ جو نظامِ اطاعت اس کے لئے متعین کیا گیا ہے اس کا نام الدین ہے اور جس انداز سے اس نظام کی اطاعت ہوگی اس کا نام الاسلام ہے۔ انسان کے لئے اس الدین کے علاوہ نہ کوئی اور دین (نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات) ہے نہ الاسلام کے علاوہ کوئی اور اسلام (اندازِ اطاعت اور طریقِ زندگی) یعنی نظام بھی ایک اور اس نظام کی اطاعت کا طریق بھی ایک۔

أَفَتَبِيزِ دِينَ اللَّهِ يَبْغُونَ وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر دوسری راہ ڈھونڈنے نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے طوعاً و کرہاً سب اُسی کے حکم کے فرماں بردار ہیں اور ہر ایک کی گردش کا رخ اسی محور کی طرف ہے۔

اس نظامِ اطاعت کے علاوہ کوئی اور نظام قابلِ قبول نہیں۔

وَ مَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ۝ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے سوا (جو ایک مکمل نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخر الامر خاسر و نامر لو رہے گا۔

اس لئے کہ

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳/۱۹)

بلاشبہ الدین (نظام اطاعت) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے!

انسان اور دیگر اشیاء میں فرق | دیگر اشیائے کائنات جس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے لئے تخلیق ہوئی ہیں اُن پر اُن کے ذاتی میلانات

ورحمانات یا خارجی موثرات اثر انداز نہیں ہوتے۔ برعکس اس کے انسان داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں سے اثر پذیر ہوتا ہے اس لئے اس سے الدین کے مطابق زندگی بسر کرالے کے لئے، اس نظام زندگی کو بار بار اس کے سامنے لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی یاد دہانی اور تاکید کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ نظام اطاعت (یا ضابطہ قوانین) جو اس طرح بار بار اس کے سامنے لایا جائے ایسے مقام سے ملنا چاہیے جو خارجی امیال و عواطف سے اثر پذیر نہ ہو۔ یہ مقام سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اشیائے کائنات میں سے کسی نے اپنے لئے خود قوانین حیات مرتب نہیں کئے۔ ہر ایک کو خالق فطرت کی طرف سے ضابطہ زندگی عطا ہوا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے لئے آپ قانون نہیں وضع کر سکتا۔ یہ اصول و اساسات اسے خالق فطرت ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس لئے وہ خالق فطرت بذریعہ وحی اس قانون کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور جن مقدس حضرات کے واسطے سے یہ قانون انسانوں تک پہنچتا ہے انہیں انبیاء یا رسول (پیغامبر) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب انسان نے عمرانی زندگی کی ابتدا کی اور حیات اجتماعیہ کے مقتضیات و روابط نے ابھرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ سلسلہ پیغام رسانی بھی شروع ہو گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰتُوْا زَكٰتَکُمْ يَوْمَ الْحٰجِّ ۝۱۰۷ (۲/۱۰۷)

(اور فرمان الہی ہوا تھا) اے وہ انسان! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں

اور میرا قانون تمہارے سامنے پیش کریں، تو جو کوئی ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور اس

طرح اپنے اندر ارتقائے انسانیت کی صلاحیت پیدا کر لے گا۔ اس کے لئے کسی طرح

کا اندیشہ نہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

حضرات انبیائے کرام کا منصب یہی نہیں ہوتا کہ وہ ان پیغاماتِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ ان کا

فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کریں، یعنی ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ یہ نظام اس جماعت کے ہاتھوں وجود پذیر ہوتا ہے جس کے افراد بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی سے) قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ان فیصلوں نے قانون کی حیثیت اختیار کرنی ہو تو ان کے نفاذ کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جو ان فیصلوں کو پسند نہیں کریں گے جن سے ان کے مفاد پر زبرد پڑتی ہو۔ نیز ایسی قوتیں بھی ہوں گی جو اس نظام کی مخالفت کریں گی۔ ان تمام مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کے پاس قوت بھی ہو۔ لہذا حضرات انبیاء کرامؑ محض مبلغ اور داعی نہیں ہوتے تھے ایک فعال نظام کے مرکز اور ایک مملکت کے صدر اعلیٰ بھی ہوتے تھے۔ سورۃ حدید میں ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ
إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۵۴/۲۵)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب (قانون) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہ سکیں اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے واسطے بڑی بڑی منفعتیں ہیں۔ (اور یہ سب کچھ اس لئے بھی کیا گیا) تاکہ خدا (اور مرکز حکومتِ الہیہ) کو ابھی طرح معلوم ہو جائے کہ کون خدا اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے امداد کرتا ہے (اور کون نہیں کرتا)۔ بلاشبہ خدا بڑی قوت اور غلبہ والا ہے

لے دنیا میں قوت کا مظاہرہ ہمیشہ فولاد سے ہوتا رہا ہے خواہ وہ ازمنہ قدیمہ کی تیغ و سناں اور زرہ و خود ہواور خواہ دورِ حاضرہ کے ٹینک اور ہوائی جہاز۔ قوت کے ان مظاہر کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن فولاد کی حقیقت اپنی جگہ پر مستقلاً قائم و دائم ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے قوت کے مفہوم کے لئے فولاد ہی کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر قوت کے مختلف شئون و صورتیں محصور ہیں۔

اُسے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہاری امداد خود تمہاری بہبود کے لئے ہے۔

حکومت الہیہ جس نظام کے ماتحت کوئی قانون عملاً نافذ ہوا اسے نظام حکومت کہتے ہیں اور جس حکومت کے ماتحت قوانین الہیہ کی تنفیذ ہوا اسے حکومت الہیہ۔ لہذا حضرات انبیاء کرام کا مقصد زندگی قیام و بقائے حکومت الہیہ تھا تاکہ دنیا سے انسانی تغلب و استیلا (فساد) کو مٹا کر عدل و انصاف کی بساط بچھائیں۔

فَهَزَمُوا هُم بِأُذُنِ اللَّهِ قَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَ اتَّهَ اللَّهُ
الْمُلُكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عِلْمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَ لَوْ لَا دَعَا اللَّهُ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَ لَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (۲/۲۵۱)

چنانچہ (ایسا ہی ہوا) انہوں نے قانون خداوندی کے مطابق اپنے دشمنوں کو بزمیت دی اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور (حکمرانی و دانشوری کی باتوں میں سے) جو کچھ کھانا تھا سکھلادیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راستے سے ہٹاتا رہے تو دنیا خراب ہو جاتی (اور امن و عدالت کا نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

سب کی تعلیم ایک تھی | ظاہر ہے کہ جب ان تمام حضرات انبیائے کرام کا مقصد زندگی ایک تھا، مبداء علم (نبوت) ایک تھا، وہ قانون جس کی ترویج و تنفیذ کے لئے ان کی بعثت ہوئی تھی ایک تھا، تو ان میں باہمی اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ ان میں کبھی اختلاف نہ تھا۔ ان کا پیغام ایک تھا، ان کی تعلیم ایک تھی، ان کی منزل واحد تھی، ان کا منہمائے نگاہ ایک تھا۔ اس لئے کہ اللہ انسانوں کے لئے ایک ہے اور یہ حضرات اسی اللہ کی اشاعت و تنفیذ کے لئے آتے تھے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَ الَّذِي أَوْحَيْنَا
إِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَى وَ عِيسَى أَنْ أَقِيمُوا

الدِّينَ ذَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۖ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ
إِلَيْهِ ۗ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَيَهْدِي إِلَيْهِ
مَنْ يُنِيبُ ۝ (۱۳/۴۲)

اور دیکھو! اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے (اے پیغمبر اسلام) تمہارے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس الدین کو جو سب کے لئے واحد ہے، قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرنا۔

مشدکین کو یہ بات جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو بڑی اسی گراں گزری۔ کیا یہ گراں تم پر حسد کی وجہ سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ اللہ جسے چاہتا ہے (نبوت کے لئے) برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنی راہ دکھا دیتا ہے۔

نہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لئے الدین ایک تھا بلکہ ہر زمانہ میں ایک تھا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ طبیعی دنیا میں دیکھئے۔ سنکیا جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانہ کے انسانوں کے لئے قاتل تھا اسی طرح آج بھی مہلک ہے۔ جس طرح افرنگ کے پریزاد انسان کے لئے مہلک ہے اسی طرح افریقہ کے حبشی کے لئے بھی زہر ہے۔ پانی جس طرح سامی النسل انسانوں کے لئے ممد حیات ہے اسی طرح ایرین قوم کے لئے بھی معادن زندگی ہے۔ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے خواص و اثرات کی یہ کیفیت ہے اسی طرح اس کی عمرانی، معاشرتی، مالی، سیاسی، غرضیکہ حیات اجتماعیہ کے ہر گوشے کی یہی حالت ہے۔ جو چیز آج سے دس ہزار برس پیشتر انسان کے شجر حیات کی کسی شاخ کے لئے وجہ شگفتگی و شادابی تھی وہی آج بھی باعثِ نزہت و لطافت ہے۔ جو ایران میں موجبِ افسردگی و پژمردگی تھی وہ یونان میں بھی باعثِ ہلاکت و بربادی تھی۔ اس لئے کہ انسانی تقاضے اختلافِ زمان و مکان سے مختلف نہیں ہو جاتے اور دو اور دو آج سے پانچ ہزار سال پیشتر بھی اسی طرح چاڑھ تھے جس طرح آج۔ اور افلاطون کی عقل اور فیثاغورث کے قواعد کی رو سے بھی ان کا نتیجہ وہی چاڑھ تھا جو ایک دہقانِ گنوار کے ٹھیکریوں سے گن لینے کا۔ لہذا ان حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کے اصول و اساس ہمیشہ ایک تھے اور انہیں ایک ہونا بھی چاہیے تھا۔ یہ اصول کیا تھے؟ پھیلائیے تو ان کے لئے کتابوں کی کتابیں درکار ہوں، لیکن مٹانے سے فقط ایک نقطہ توحید، یعنی یہ کہ خدا کے

نازل فرمودہ قوانین کے علاوہ کسی اور ضابطہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔ بالفاظِ دیگر، محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت (عبودیت) **نقطہ توحید** اختیار کرنا شرک ہے۔

قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونَنِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ۝ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ بَلِ اللَّهُ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ (۴۳-۴۴/۳۹)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہو کہ کیا تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کر لوں؟ حالانکہ تمہاری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں یہ وحی کر دی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک کر لیا تو تمہارے اعمال بے کار ہو جائیں گے۔ تم ان لوگوں میں ہو جاؤ گے جو خسارہ اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ تم ہمیشہ اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور شکر گزار بندوں میں سے بن جاؤ!

یہ تھی مرکزی تعلیم۔ یہ تھا بنیادی پیغام۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان حضرات کا کام فقط تبلیغ و رسالت (یعنی پیغام رسانی) نہ تھا۔ بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرنا تھا جس کی رُو سے عبودیت فقط قوانینِ الہیہ کی رہ جائے۔ اس نظام کے قیام کے لئے مرکزِ حکومت کی اطاعت نہایت ضروری **مرکز حکومت کی اطاعت** تھی۔ اس لئے اس اصول کی نشر و اشاعت کے ساتھ یہ بھی

ارشاد تھا کہ

فَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ ذَٰلِكُمْ يُغْنِي عَنْكُمْ رِزْقَ اللَّهِ ۖ وَأَنْتُمْ تَتَّقُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي ۖ وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوا اللَّهَ ۖ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۴۳-۴۴/۴۳)

پس قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری (یعنی مرکزِ حکومت کی) اطاعت کرو، بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ لہذا اُسی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے!

یعنی قوانینِ الہیہ کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ تو دیئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ انسان

کی حیاتِ اجتماعیہ میں نظم و ضبط قائم رکھ سکیں جس کا نتیجہ عدل و اصلاح ہو۔ یعنی ہر فرد کو وہ سب کچھ مل جائے جس کا وہ مستحق ہے اور ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس میں اس کے جوہرِ انسانیت پوری طرح نشوونما پا کر اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لیں جس سے یہ پیکرِ آب و گل اس دنیاوی زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے اور یوں حال و مستقبل کی تمام سرفرازیاں اور کامرانیاں اس کے قدم چومیں۔ لیکن ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رسولوں کی یہ اطاعت ان کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ بلکہ حتماً و اصلاً اس ضابطہ قوانین کی اطاعت تھی جو انہیں منجانب اللہ عطا ہوتا تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ
كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَكْلُمُونَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے انسان کی ہدایت کے لئے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بند بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تمہیں چاہیے کہ ربانی انسان بنو، اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

وہ خدا پر ایمان لانے کی منادی کرتے اور اسی کی اطاعت سکھاتے تھے۔

رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ
فَأَمَّا قَوْمٌ فَابْتِغَا غَفْرَ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفَرُوا عَنَّا سَيِّئَاتِنَا
وَكَوَفُّنَا مَعَ الْاُفْبَارِ ۝ (۳/۱۹۳)

خدایا! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا! ہماری حفاظت فرما۔ ہماری برائیاں مٹا دے اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو!

خدا کے عبد | ادران کی خود سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کے محکوم اور غلام تھے۔

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰحٰنَ وَ يَعْقُوْبَ اُولٰٓئِکَ
وَ الْاَوْبَصَارِ ۝ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب میں ہمارے فرمانبردار بندوں میں سے ابراہیم، اسمٰحٰن اور یعقوب کا ذکر کرو جو قوت و سطوت اور دانش و بینش کے مالک تھے!

اسی کے غلام اور اسی کے محتاج۔
فَسَقٰی لَہُمَا نَمْرَ تَوٰی اِلٰی الْبَطْلِ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ
اِلَیَّ مِنْ خَیْرِ فَقِیْرٌ ۝ (۲۸/۲۴)

دخترانِ شعیب کے لئے (بحریوں کو) پانی پلا کر موسیٰ سائے کی طرف واپس آگیا اور
(خدا سے) مناجات کرنے لگا۔ ”خدا یا! جو کچھ بھی میری طرف تو بھلائی اتار دے میں اس کا
محتاج ہوں!“

حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کے لئے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

قُلْ لَوْ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ
لَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبِ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ شَیْءًا وَ مَا مَسْنٰی
الشُّوْعُرُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۸۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں
نہیں رکھتا بجز اس کے جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور
ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا

کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لئے خبردار کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں!

لہٰذا ان سب کی تعلیم کی اساس و بنیاد یہی تھی کہ تمام دنیا کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے منہ موڑ کر صرف
ایک اللہ کی محکومیت اختیار کی جائے۔

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنّٰہُ

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝ (۲۱/۲۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر ہم نے اس بات کی وحی نہ بھیجی ہو کہ کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں مگر میری ذات۔ پس چاہیے کہ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔

ہر ایک آکر یہی کہتا تھا کہ

قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۝ (۵۱)

اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (حاکم اور مطاع) نہیں ہے۔

شریعت یعنی جزئیات | اساس و بنیاد سب کی تعلیم کی ایک تھی۔ البتہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے اعتبار سے تفصیل و جزئیات میں فرق ہونا لازمی تھا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر دنیا کی حالت یہ تھی کہ ایک بستی کے رہنے والوں کی ضروریات کا دوسری بستی والوں پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا گویا ایک بستی میں سمٹ کر آگئی ہے اور زمان و مکان کے بعد عہد پارینہ کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اس لئے جن بین الاقوامی قوانین و ضوابط کی آج ضرورت ہے اُس زمانہ میں اُن کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اس لئے ان تمام انبیاء کرام کی تعلیم کی اصل و بنیاد جہاں ایک تھی تفصیل و جزئیات کے اعتبار سے ان میں ارتقائی امتیاز ضروری تھا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ ان تفصیل کے اختلاف سے اصل حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے طرق و انداز کے اختلاف کے باوجود اکثر و بیشتر مشترک اقدار کا ذکر کیا ہے۔

وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ قَدْ
وَ بِأُولَئِیْنَ إِحْسَانًا وَ ذِی الْقُرْبَىٰ وَ الْیَتَامَىٰ وَ السَّالِکِیْنَ وَ قُولُوا لِلنَّاسِ
حُسْنًا وَ أَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ ۖ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ إِلَّا
قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ أَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ۝ (۲/۸۳ نیز ۵/۱۳ : ۲۰/۱۴)

اور پھر وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے (اتباع شریعت کا) عہد لیا تھا (وہ عہد کیا تھا یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار نہ کرنا۔ ماں

باپ کے ساتھ احسان کرنا، عزیزوں قریبیوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، یتیموں مسکینوں کی خبر گیری کرنا، تمام انسانوں سے اچھے طریق پر ملنا، نظامِ صلوة قائم کرنا، زکوٰۃ (یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما) کا انتظام کرنا۔ لیکن تم اس عہد پر قائم نہیں رہے اور ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے روگردانی کی اور حقیقت یہ ہے کہ (ہدایت کی طرف سے) کچھ تمہارے رُخ ہی پھرے ہوئے ہیں۔

تفریق بین الرسل چونکہ یہ تمام حضرات انبیائے کرامؑ ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں، ایک ہی آسمان کے درخشندہ ستارے اور ایک ہی شجر مقدس کی مختلف شاخیں تھیں، اس لئے ان کی رسالت و نبوت کے بارے میں ایک دوسرے میں قطعاً کوئی فرق نہ تھا، نہ فرق کیا جاسکتا ہے۔

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ تَفَ لَا يُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ تَفَ (۲/۲۸۵)۔

اللہ کا رسول اس وحی پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (اُن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) کہ ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ ایک کو مانیں دوسرے کو نہ مانیں یا سب کو مانیں مگر کسی ایک سے انکار کر دیں۔ ہم خدا کے تمام رسولوں کو یکساں رسول مانتے ہیں)۔

اس لئے کسی ایک رسول پر ایمان لانے والے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب پر بلا تفریق و تمیز ایمان لائے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهِ وَ لَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ اُجْرُهُمْ وَ كَانَتْ اِلٰهُهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۳/۱۵۳)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی نبوت سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ (پچھے مومن ہیں اور) عنقریب ہم انہیں ان کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا رحمت والا ہے!

فضیلت | البتہ ان حضرات کے دواثر و نفوذ اور خطائے تعلیم و تبلیغ میں فرق تھا۔ ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی تنذیر و تبشیر کے لئے آتا لیکن دوسرا ایک عظیم الشان قوم کی اصلاح و ہدایت کے لئے۔ ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرا فراعنہ وقت اور نماریہ عصر کی طاغوتی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا۔ اس اعتبار سے اُن کے مدارج و مناصب الگ الگ تھے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ م (۲/۲۵۳) نیز ۱۶/۵۵
یہ ہمارے پیغمبر ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے لیکن اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں)۔

بائیں ہمہ اختلاف مدارج و مراتب یہ تمام حضرات ایک ہی برادری کے افراد تھے۔
وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (۲۳/۵۲)
اور دیکھو یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس میرے قوانین کی نگہداشت کرو۔



بشریتِ رسول | اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان حضرات انبیاء کرام کا مقصد بعثت یہ تھا کہ وہ لوگوں تک ان قوانین کو پہنچاتے جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ شرفِ انسانیت کی تکمیل کر سکتے تھے۔ اور صرف پہنچاتے ہی نہیں بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرتے جس کے ماتحت وہ قوانین نافذ العمل ہوتے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ حضرات انبیاء کرام انسان ہوتے۔ اس لئے کہ انسانی حیات اجتماعیہ کے نظم و ضبط کے لئے انسان ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی

لئے فرمایا۔

قُلْ تَوَكَّلْ عَلَىَّ فَإِنِّي أَنَا رَبُّكَ ۚ يَتَمَشَّوْنَ فِي الْأَرْضِ مَدْبُوعَةً لَّيْلًا ۚ مُطْمَئِنِّتِينَ لَنَزَلْنَا عَلَيْهِمُ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۝ (۱۴/۹۵)

کہو کہ اگر زمین پر فرشتے چلتے پھرتے سکونت پذیر ہوتے تو ہم آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔ لیکن چونکہ زمین میں انسان آباد ہیں اس لئے ان کے لئے انسانوں میں سے ہی رسول بنایا جاسکتا ہے۔

لہذا تمام رسول انسان تھے اور انسانوں میں سے بھی صرف مرد۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجُلًا ظَوِّجْنَا إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۚ (۱۲/۱۰۹ نیز ۱۶/۳۳؛ ۲۱/۷)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر اسی طرح کہ وہ باشندگانِ شہر میں ہی سے ایک مرد تھا اور ہم نے اس پر دُجی اتاری تھی (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان سے فرشتے اترے ہوں)۔

یہ حضرات دوسرے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۚ (۱۳/۳۸ نیز ۲۵/۲۰)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی (بے شمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کئے اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔

سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۚ أَفَأَنْتَ مِمَّنْ فُهِمُ الْخُلْدِ ذُنْ ۝ (۲۱/۳۳)

اور (اے ہمارے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے)۔ پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟

لہذا ان میں الوہیت کا کوئی شائبہ یا مافوق البشر ہونے کا کوئی نشان نہ تھا۔ تو ہم پرست، کم فہم لوگ

اس بات پر معترض بھی ہوتے کہ رسول دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ کچھ اور کیوں نہیں ہیں؟

فَقَالَ الْمَلَكُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ
مِثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَوُثِّلَ
فَلَيْعَلَّكُمْ مِمَّا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٢٣﴾ (نیز ۵۴: ۶۴)
اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سن کر (لوگوں سے) کہنے لگے،
”یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی
بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو وہ کیا فرشتے نہ اتار دیتا؟ وہ ہماری
ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیام بر کیوں بنانے لگا؟ ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی
ایسی بات کبھی سنی نہیں۔“

لیکن وہ اس حقیقت کو نہ سمجھتے کہ انہیں صحیح راستہ وہی دکھا سکتا ہے جو خود ان میں سے ہو البتہ اسے مبداء فیض
کی طرف سے یہ راستہ واضح اور تین طور پر (بذریعہ وحی) دکھا دیا گیا ہو۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَلَاحِدٌ
فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا
يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿١٨/١١٠﴾

(نیز) کہہ دے ”میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ
اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا معبود (یعنی حاکم و مطاع) وہی ایک ہے۔ اس کے سوا
کوئی نہیں پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے چاہیے کہ اچھے کام انجام
دے اور اپنے پروردگار کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) میں کسی دوسری ہستی کو شریک
نہ کرے۔“

رسول کی فضیلت یہی ہوتی ہے کہ جو علم اس کے پاس ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكُمْ قَبْلُ فَاصْبِرُوا
أَعْدِلًا صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿١٩/٢٣﴾

اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔

پس میرے پیچھے چل میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

اور یہ علم (وحی) کسب و ہنر سے نہیں مل سکتا، اللہ کے چشمہ فیض سے وہی طور پر ملتا تھا۔

اللَّهُ يُصْطَفِي مَنِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو (انبیاء کی طرف) پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی (دوسرے انسانوں کی طرف) پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کر لیا۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا، دیکھنے والا۔

اس موہبت کبریٰ میں نسلی امتیاز کو بھی کچھ دخل نہیں ہوتا۔

وَ إِذِ ابْتَلَىٰ اِبْرٰهٖمَ رَبُّہٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّتْہُنَّ ۚ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۗ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۗ قَالَ لَا یَنَالُ عٰہِدِیَ الظَّالِمِیْنَ ۝ (۲/۱۲۴)

اور (پھر غور کرو) وہ واقعہ جب ابراہیم کے لئے اُس کے پروردگار نے نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے تھے اور وہ ان میں پورا اُترا تھا۔ جب ایسا ہوا تو خدا نے فرمایا، اے ابراہیم! میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا، جو لوگ میری نسل میں سے ہوں گے ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا، جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں تو ان کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!

نبوت دیئے جانے کا اہل کون ہے، اس کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا۔ کوئی شخص اپنے کسب و ہنر سے نبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ۚ اَنْ اَسْمِدُ رُوًّا اَنْتَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۷/۲)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس غرض سے جُن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتہ الروح کے ساتھ اس پر بھیجے (یعنی وحی کیساتھ بھیجے) اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں ہے۔ پس میرے ہی قوانین کی

نگہداشت کرو۔

ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لیجئے کہ رسول اپنی بشریت کے اعتبار سے دوسرے انسانوں جیسے ہوتے لیکن اپنی خصوصیت نبوت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں سے بالکل الگ تھلگ۔ اس اعتبار سے حضرات انبیاء کرام گویا اپنی ایک مخصوص نوع رکھتے تھے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اب مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

MEANING AND PURPOSE اپنی کتاب KENNETH WALKER

میں لکھتا ہے:

یہ روحانی راہ نما دوسرے انسانوں سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ انہیں انسانوں کی ایک جداگانہ نوع کہنا چاہیئے۔ یہ اور صرف یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی تجربہ کے اس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں جو برگتان اور اوسپنسکی کے خیال کے مطابق انسانیت کا آخری مقام ہے۔ وہ صفات جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتے ہیں، یعنی شعور اور روحانی اقدار کا علم ان میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہوتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت حیات کی ایک نئی سطح پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور روحانی اعتبار سے دوسرے انسانوں سے اسی طرح مختلف ہوتے ہیں جس طرح تلیاں ان پتنگوں سے مختلف ہوتی ہیں جن کی ارتقار یافتہ شکل وہ خود ہیں۔ برگسان کا خیال ہے کہ ہم حیات کے ارتقار کو اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب ہم اسے اس نقطہ نظر سے دیکھیں کہ یہ کسی ایسی منزل کی تلاش میں ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہے، وہ منزل جس تک روحانیت والے انسان ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر اس بلندی تک جس تک یہ مخصوص انسان پہنچ چکا ہے تمام انسان یا انسانوں کی اکثریت بھی پہنچ سکتی تو فطرت نوع انسانی تک ہی رُک نہ جاتی۔ اس لئے کہ یہ انسان دوسرے انسانوں سے لقیثاً آگے ہوتے ہیں۔ (۹۶۔ ۸)

اس مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک خدا سے نبوت پانے کا تعلق ہے، یہ چیز نبی کو اپنے کسب و ہنر کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی تھی، وحی خدا کی موہبت تھی۔ لیکن جب وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا تو اس کے بعد اس میں اور دوسرے انسانوں میں (انسان ہونے کی جہت سے) کوئی فرق نہ رہتا۔ اس کے بعد وہ اپنی وحی کی روشنی میں جو معجزات عقل کا رنامہ کر کے دکھاتا

وہ سب ایک انسان کی حیثیت سے کرتا۔ قرآن کریم نے حضراتِ انبیاءِ کرام کی بشریت کے اظہار کو اس قدر اصرار و تکرار سے واضح اس لئے کیا ہے کہ دوسرے انسان یہ نہ خیال کر لیں کہ رسول نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ کسی مافوق الفطرت قوت کا کرشمہ ہے۔ اسے دہی کر سکتا تھا۔ عام انسان اس قسم کے کارنامے سر انجام نہیں دے سکتے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور صحیح نہیں۔ رسول جو کچھ کر کے دکھاتا ہے وہ کچھ ہر وہ انسان کر کے دکھا سکتا ہے جو دجی کے اتباع سے اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ رسول کے میسر العقول کارنامے درحقیقت یہ بتاتے ہیں کہ یہ انسانی ممکنات کا مظاہرہ ہے۔ (یہ وجہ ہے کہ میں نے 'نبی اکرم کی سیرت طیبہ سے متعلق اپنی کتاب کا عنوان — معراجِ انسانیت — رکھا ہے، یعنی حضور کی سیرت اس امر کا اعلان و اظہار ہے کہ انسان ان بند یوں تک پہنچ سکتا ہے یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے رسول اللہ کی سیرت کو دوسرے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ — ماڈل) قرار دیا گیا ہے۔ اگر دوسرے انسانوں کے لئے وہ کچھ کر دکھانا ممکن نہ ہوتا، تو رسول کی زندگی ان کے لئے ماڈل کس طرح بن سکتی! رسول کی اطاعت بھی اس حیثیت سے ہوتی کہ وہ دجی کے مطابق قائم کردہ حکومت کا اولین سربراہ ہوتا۔



اس عظیم الشان مقصد کو لے کر رسول آتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس کے دائرۂ تبلیغ میں حالت یہ ہوتی کہ ہر شعبہ زندگی میں خدائی قوانین کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ رسوم و آئین عمل پیرا ہوتے۔ اسی کا نام فساد ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ
بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۳۰/۴۱)

جو کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھوں کیا دھرا اُس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل رہا ہے
(اور قانونِ مکافات اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اُن کے کئے کا نتیجہ دکھا دے۔
شاید (اس طرح) یہ لوگ غلط روش سے باز آجائیں!

تبشیر و تنذیر | اس کا کام یہ ہوتا کہ وہ انسانوں کے خود ساختہ غلط نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔
اس کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دے اور اس کی جگہ بالکل نئی بنیادوں پر ایک
جہان نو کی تعمیر کرے جس میں ہر شے قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنی اپنی جگہ سرگرم عمل ہو۔ اس کے لئے وہ

انہیں غیر خدائی آئین و ضوابط کی ہلاکت سامنیوں سے آگاہ کرتا (تذییر) اور آسمانی نظام زندگی کے درختہ نتائج کی بشارت دیتا۔ (تبشیر)۔

وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ ۚ فَمَنْ أَصْنٰ
وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَبُوا
بِآيَاتِنَا يَسْتَمِعُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (۴۸-۴۹-۵۰ نیز ۵۶/۱۸)
اور (ہمارا قانون تو یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر اس لئے کہ (ایمان و عمل کی برکتوں
کی خوشخبری سنائیں اور) انکار و بد عملی کے نتائج سے آگاہ کریں۔ پھر جو کوئی یقین لایا اور
اس نے اپنے اندر صلاحیت عظیم پیدا کر لی، تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی
طرح کی غمگینی مگر جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا، تو فاسق ہونے کی وجہ سے ضروری
ہے کہ ہمارے عذاب کی پلیٹ میں آجائیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس دعوت انقلاب کی ہر طرف سے مخالفت ہوگی۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق غصب کئے
بیٹھے ہوں وہ بھلا کب چاہتے ہیں کہ شکار کا جانور ان کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ غیر خدائی نظام میں ارباب
قوت و حکومت، اصحاب سرمایہ و دولت اور اراکین مذہب دونوں اپنی اپنی "خدائی" کی مسندوں پر متمکن
ہوتے ہیں۔ رسول کی دعوت کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ خدا کے بندوں کو ان مستبد قوتوں کے پنجہ قہاریت سے
چھڑا کر آزادی کی فضا میں اذین بال کشائی دے۔ اس لئے ان کی طرف سے
مخالفت مخالفت ہوتی ہے اور سخت ترین مخالفت۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۚ (۲۵/۳۱)

اور یوں مجرمین کا طبقہ ہر نبی کا دشمن ہوتا رہا۔

اور مجرمین کو دوسری جگہ مترقین کہا گیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا
إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۳۴/۳۴)

اور (دیکھو) ہم نے کسی بستی میں (انکار و بد عملی کے نتائج سے) کوئی آگاہ کرنے والا نہیں
بھیجا مگر ہمیشہ اس کے مفاد پرست لوگوں نے یہی کہا کہ جن تعلیمات کے ساتھ تمہیں بھیجا

گیا ہے ہم انہیں ملنے والے نہیں۔

مترقیین کے معنی ہیں سہل انگاری اور عیش پسندی کی زندگی بسر کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں (خواہ وہ جاگیر داری کی شکل میں ہو یا فتوحات خانقاہی کی صورت میں) انہیں جدوجہد کی زندگی موت کی مصیبت دکھائی دے گی۔ اس لئے ان سب کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ سرمایہ دار، جاگیر دار، ارباب حکومت و اقتدار، مسانید فتاویٰ و ارشاد کے اجارہ دار، تمام متحدہ و متفقہ طور پر اس آواز کو دبانے کے لئے محافوظ قائم کر لیں گے۔ باقی رہے عوام، سوائے ان کے جسم فیضیت کی زنجیروں میں جکڑے اور ان کے دل برہمنیت کے پھندوں میں پھنسے ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے وہ فضا جس میں ایک داعی انقلاب دنیا کو حق پرستی کی طرف بلاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ رسول کا مقصد کس قدر عظیم اور اس کی مہم کیسی صبر آزما اور زہرہ گداز ہوتی ہے۔ ہجوم مخالفت میں ایک بہت بڑا ہمت شکن مقام استہزاء کا ہوتا ہے۔ آپ نہایت متانت و سنجیدگی سے ایک بات کہتے ہیں، متوقع ہیں کہ دوسرا بھی متانت و سنجیدگی سے اس پر غور کرے گا، اپنے شکوک و شبہات کو پیش کرے گا۔ آپ ان کا تسکین بخش جواب دیں گے۔ اسے دعوت غور و فکر دیں گے، اس کی بصیرت کو اپیل کریں گے، اس راہ میں آپ کو کتنی ہی مشکلات پیش آئیں اور کتنا ہی زیادہ وقت کیوں نہ صرف ہو آپ ہمت نہیں ہاریں گے۔ لیکن اگر آپ کی متانت و سنجیدگی کے جواب میں آپ کا مذاق اڑا دیا جائے، غور و فکر کے بجائے مسخر و استہزاء سے پیش آیا جائے۔ آپ کی دعوت بصیرت افزا کا استقبال ایک حقارت آمیز ہنسی اور نفرت انگیز قبضہ سے کیا جائے تو اس ہمت شکن اور صبر آزما مرحلہ سے گزر کے لئے کوہ تمثال استقلال اور فلک پیما حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسولوں کو سب سے پہلے اسی دادی جگر سوز سے گزرنا پڑتا تھا۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا
ثُمَّ اخَذْتُهُمْ فَفُلْکَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۱۳۳) (نیز ۱۱۱/۳۳؛ ۱۱۲/۳۱)۔

اور (اسے مسخر کیا) تجھ سے پہلے بھی ایسا ہی ہو چکا ہے کہ پیغمبروں کی ہنسی اڑائی گئی اور ہم نے (انہیں)
مقررہ قانون کے مطابق پہلے ان لوگوں کو ڈھیل دی، پھر گرفتار کر لیا۔ تو دیکھو، ہمارا اظہار یا مؤاہلہ

کیسا تھا اور کس طرح ظہور میں آیا؟

کبھی انہیں ساحر کہا جاتا، کبھی مجنون قرار دیا جاتا۔

كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ
أَوْ مَجْنُونٌ ۝ (۵۱/۵۲)

(اور دیکھو) اسی طرح ان سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں آیا مگر (اُن کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ) لوگوں نے کہا: ”یہ تو کوئی ساحر ہے یا مجنون ہے۔“
”ساحر“ کے معنی جادوگر ہی نہیں، جھوٹا اور فریب کار بھی ہیں۔ اس سے آگے بڑھتے تو ان کی عملاً تکذیب کی جاتی۔

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ وَ قَوْمُ
ثَمُودَ ۝ (۲۲/۲۲-۲۳ نیز ۳۵/۲۵-۲۶) ذ (۳۴/۲۵)

اور (اسے پیغمبر!) اگر یہ (منکر) تجھے جھٹلائے، تو وہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود۔
اسلاف پرستی | دوسری طرف ارباب مذہب (علماء و مشائخ) کو لیجئے۔ وہ اس دعوت کی تکذیب و تردید کے لئے اس سے زیادہ کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ سمجھتے کہ یہ تعلیم اس روش کے خلاف ہے جو ان کے آباء و اجداد سے اُن تک متوارث چلی آئی ہے۔ یعنی اسلاف پرستی ہمیشہ حقیقت پرستی پر غالب آتی اور بزرگوں کی اندھی تقلید ہر سچائی کی مخالفت پر آمادہ پیکار کر دیتی۔

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ
مُقْتَدُونَ ۝ وَكَذَلِكَ مَا آمَرْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي فِرْعَوْنٍ
مَنْ يَنْذِرُ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا ۚ إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ
وَ إِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُقْتَدُونَ ۝ (۲۲-۲۳/۲۳)

(انہوں نے سچائی کو قبول نہیں کیا، بلکہ کہنے لگے ”کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقش قدم پر (چل کر) ہی ہدایت یاب ہو سکتے ہیں۔“ اور اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آبادی میں کوئی (انکار و بد عملی کے نتائج سے آگاہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر ہمیشہ اس کے عیش پسند اور تن آسان لوگوں نے یہی کہا ”ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقش قدم کی پیروی کرتے رہیں گے“)

غور کیجئے۔ یہاں اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کی روش پر چلنے والوں کو بھی مُتَرَفِینُ کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ غور و فکر کے بعد کسی راہ عمل کو اختیار کرنے کے لئے بڑی محنت اور ذہنی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تقلید کی بکڑی کے سہارے کسی متواتر روش پر آنکھیں بند کر کے چلے جانا نہایت آسان ہے۔ اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ اسلاف پرستی کی راہیں اختیار کئے ہوں ان کے قوائے عملیہ مفلوج اور ذہن کی فکری صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں۔ وہ تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی کے عادی بن جاتے ہیں اور مجاہدانہ روش انہیں مصیبت نظر آتی ہے (خواہ یہ جدوجہد جسمانی ہو یا ذہنی) اُسی طرح جیسے ایک خاندانی امیر کو جس نے دولت کو خود نہ کمایا ہو بلکہ بلا استعداد و اہلیت ورثہ میں پالیا ہو) محنت و مشقت کی سپاہیانہ زندگی چھلا دین کر ڈراتی ہے۔ شُہَدَانِ کریم نے جہاں (پہلی آیات میں) اس قسم کے سہل انگاروں اور عیش پسندوں کو مترفین کہا ہے وہاں (مؤخر الذکر آیات میں) اسلاف پرستی کی روش میں ذہنی سہل انگاری کی زندگی بسر کرنے والوں کو بھی مترفین قرار دیا ہے۔ ویسے بھی مذہبی راہ نما خود کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں اور اس انداز سے کہ لوگ انہیں نذرانے بھی دیتے ہیں اور پاؤں بھی چومتے ہیں۔ لیکن قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اس روش زندگی کا انجام ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ؕ

(۴۳/۲۵)

چنانچہ ہم نے انہیں اُن کی غلط روش کی سزا دی (تو اے پیغمبر!) دیکھو ان جھٹلانے والوں

کا انجام کیسا رہا؟

مُتَرَفِین | مترفین کے ٹکڑے پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ یہ وہ تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والے ہیں جو دوسروں کی محنت کی کمائی سے اپنی عیش پرستی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک مجرّمین، جو اپنی کثرت مال و اولاد (قوت و حشمت) پر نازاں ہوتے ہیں اور دوسرے اربابِ مذہب (علماء و مشائخ) جو اسلاف پرستی کے مقدس نقاب میں حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخِ عالم پر غور کیجئے۔ دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ انہی دو گوشوں سے اُبھرتی نظر آئے گی۔ ایک گوشہ ملکیت والوں کا (خواہ وہ قیصر ہو یا سرمایہ دار) اور دوسرا گوشہ مذہبی پیشواؤں کا (خواہ وہ اربابِ شریعت ہوں یا ارکانِ طریقت)۔ اس لئے کہ یہ دونوں گوشے دوسروں کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر تن آسانی اور سہل انگاری

کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ایک شخص دس ہزار ایکڑ قطعہ اراضی کا مالک ہے جو اسے بلا محنت و مشقت ورثہ میں مل گئی ہے۔ ہزاروں کاشت کار صبح سے شام کپکپاتے جاڑے اور چلچلائی دھوپ میں لہو پانی ایک کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے حصہ میں سوکھے ٹکڑے بھی نہیں آتے اور یہ تن آسان (مترف) حریر و اطلس کے نرم و نازک لباسوں میں ملفوف، افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں پر بیٹھنے والا بلا محنت و مشقت ان غریبوں کا خون چوس لیتا ہے۔ یہ قیصریت کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے۔ دوسری طرف برہمنیت کو دیکھئے تو ان کا غلبہ و استیلا قیصریت سے بھی بڑھ کر محکم اور استوار ہوتا ہے۔ قیصریت کی حکومت جسموں پر ہوتی ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے بہت سی تدابیر کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن برہمنیت کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے اور اس کے لئے سوائے اس کے کہ عوام کو اندھی عقیدت اور ادھام پرستی کی جہالت میں رکھا جائے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قیصریت کو پھر بھی یہ فکر دامگیر رہتی ہے کہ محکوم کہیں اپنی زنجیریں توڑ کر بھاگ نہ جائے۔ لیکن برہمنیت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر کسی اسیر حلقہ عقیدت کی زنجیر کو توڑ بھی دیکھے تو وہ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے دل سے گڑگڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی زنجیر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو مڑگان عقیدت سے چنتا اور زنجیر کو کسی نہ کسی طرح جوڑ کر نہایت عجیب و الحاح سے پھر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ سوچئے کہ اس گوشہ برہمنیت (افانقاہیت و ملاہیت) سے حضرات انبیاء کرام کے پیغام انقلاب کی مخالفت کیوں نہ ہوگی؟ اس لئے کہ دعوت انقلاب میں تمام مترفین (دوسروں کی کائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والوں) کی موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ لہذا قیصریت اور افانقاہیت دونوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے اور سخت ترین مخالفت۔ اور بسا اوقات یہ دونوں مل کر اس دعوت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ قیصریت کے پاس مادی قوت موجود ہوتی ہے لیکن برہمنیت کے پاس اس سے بھی کہیں زیادہ مؤثر حربے ہوتے ہیں۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ شخص کہتا ہے کہ وہ طریقہ جس پر تمہارے آباء و اجداد تمہارے بڑے بزرگ، مقدس اسلاف چلتے آئے ہیں، وہ طریقہ غلط ہے۔ میرا طریقہ صحیح ہے! یہ ایسا حربہ ہے کہ اس میں نہ کسی مادی قوت کی ضرورت پڑتی ہے نہ دلیل و برہان کی۔ انہوں نے عوام کے دلوں پر اسلاف پرستی کی عقیدت اس درجہ گہرے طریق پر نقش کر رکھی ہوتی ہے کہ ان کے جذبات فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس دعوت کی مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ قیصریت، برہمنیت کی اس قوت سے واقف ہوتی ہے، اس لئے وہ اس

کے ساتھ گہرا گٹھ جوڑ رکھتی ہے کھتری (راجہ) برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن اسے ایشور کا افتاد قرار دے کر اسے اشیر باد دیتا ہے۔ پادری، بادشاہ کو "ایمان کا محافظ"

DEFENDER OF FAITH قرار دے کر اس کے الوہیاتی حقوق DIVINE RIGHTS کا

مبلغ بنتا ہے اور بادشاہ، کلیسا کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے۔ ملا سلاطین کو غلّ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے کر محراب و منبر پر اس کے حق میں دعائیں کرتا ہے اور سلطان ان کو زینے مقرر کرتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ قیصریت، داعی انقلاب کے مقابلہ میں خود آگے نہیں بڑھتی، برہنیت کو پیش پیش رکھتی ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ صاحبِ ضربِ کلیم کے مقابلہ میں فرعون خود نہیں آیا۔ اس نے ہاتھ کے جیوش و عسا کر کو آگے کیا تھا۔

اس سے آپ نے یہ بھی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت سے مقصود فقط چند اخلاقی ضوابط کا پیش کرنا یا پوجا پاٹ (پرستش) کی چند رسومات کا رائج کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس پورے نظام کو الٹ دینا ہوتا ہے جس کی رُو سے مجرّمین کے گردہ انسانی حقوق کو غصب کئے ہوتے ہیں۔ وہ نوعِ انسانی کے غصب شدہ حقوق کو ان فاصصوں کے دستِ تغلب سے چھین کر اس مقام میں بطور امانت رکھ دیتے ہیں جہاں سے ان کی تقسیم صحیح عدل و انصاف کے خطوط پر ہوتی ہے۔ ورنہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت سے مقصود فقط اتنا ہو کہ لوگوں! جھوٹ نہ بولو، زنا مت کرو، ایک گوشہ میں بیٹھ کر یوں اللہ اللہ کر لیا کرو۔ تو دنیا میں کون ہے جو اس تعلیم کی یوں مخالفت کرے گا؟ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اخلاق کے ضوابط بھی سکھاتے ہیں۔ لیکن اس سے مقصد اسی قسم کے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جو اپنی سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی سے قوانینِ خداوندی کو دنیا میں عملاً رائج کرنے کے قابل ہو سکیں۔ چونکہ حضراتِ انبیاء کرام کو اس قسم کے سرکش مجرّمین کے تغلب و تسلط کو توڑ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے اس عظیم الشان مقصد کے لئے انہیں بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَ اذْكُرْ عِبَادَنَا اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولٰٓئِیْہِیْ
وَ الْاَوْبٰصَارِ ۝ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبر! کتاب میں) ہمارے مخلص، بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو جو صاحبِ قوت اور مالکِ بصیرت تھے۔

قوتوں کے مالک | اس میں کسے کلام ہے کہ جہاں تک سیرت و کردار کی قوتوں کا تعلق ہے حضراتِ انبیاء کرامؑ شرفِ انسانیت کے معراجِ کمال پر ہوتے تھے۔ لیکن وہ انقلاب

جوان کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آنے والا ہوتا تھا اس کے لئے خارجی (مادی) قوتوں کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ کیرکٹر کی قوت بہت بڑی قوت ہے۔ اور پھر ”کیرکٹر“ بھی محض مغربی اصطلاح میں نہیں بلکہ وہ سیرت جو تقویٰ سے مستحکم ہوتی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادی قوتیں بھی لاینفک ہیں۔ اگر یہ انقلاب محض سیرت کی قوتوں سے پیدا ہو سکتا تو حضراتِ انبیاء کرامؑ اور ان کے رفقاء کی مقدس جماعتوں کو اودی الودیٰ صاحبِ دست و بازو ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ان حضرات کا مسلک ایک عجیب و غریب امتزاج سامنے لاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر منتہائے نگاہ محض ”تزکیہ نفس“ کی رو سے انفرادی نجات سمجھا جائے تو یہ رہبانیت ہے۔ اگر مادی قوتوں کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر دیا جائے تو یہ چنگیزیٹ اور اگر ان دونوں کو یک جا کر دیا جائے تو یہ اسلام ہے۔ اس لئے حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کی رو سے تقویٰ اور مادی قوتوں دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری ہے۔

مادی قوتیں

ایسی مادی قوتیں جن کے متعلق فرمایا۔

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِیَاطِ الْخِیْلِ
شُرْهَبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخِرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ اَوْ
تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ط وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوفِّیْ اِلَیْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَظْلَمُوْنَ ۝ (۸/۶۰)

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمہ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے، نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر کبھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور (یا دشمنو!) اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا۔ ایسا نہ ہو گا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔

ۛۛۛ

برو بھر (خشی اور تری۔ حکومت اور مذہب) کی ان فساد انگیزوں میں خدا کا رسول اپنی دعوتِ انقلاب

لے کر اٹھتا اور مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کی اس یورش میں اپنی بیکار کو برابر جاری رکھتا اُس لئے کہ استقامت و استقلال اور ہمت اور حوصلہ ان حضرات کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ
لَهُمْ ۖ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۚ لَمْ يَلْمُزُوا
إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۚ بَلَّغْ ۚ فَهَلْ يَهْدِي إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۝
(۲۶/۳۵)

(تو اے پیغمبرِ سلام! تم بھی ان لوگوں کی مخالفت کے علی الرغم اسی طرح ثابت قدم رہو جیسے تم سے پہلے بہت سے اولوا العزم پیغمبر ثابت قدم رہے ہیں۔ ان کے لئے (مکافاتِ عمل میں) جلدی نہ کرو جس دن وہ عذاب انہیں نظر آئے گا جس سے انہیں آگاہ کیا گیا ہے تو ان کا اس طرح نام و نشان مٹ جائے گا، گویا وہ (دنیا میں) دن کے ایک گھنٹہ سے زیادہ ٹھہرے ہی نہیں۔ (یاد رکھو) یہ ایک اظہارِ حقیقت ہے (فرضی دھکی نہیں ہے) چنانچہ صرف نافرمان قومیں ہی ہیں جو ہلاک کر دی جایا کرتی ہیں۔

نصرت خداوندی | پاؤں میں استقامت اور ننگا ہیں قوانین خداوندی کے نتائج کی طرف۔ اسی کو خدا کی نصرت کہتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ
خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسْتَلَمُ الْبَاسَاءِ وَالضَّرَآءِ وَ زُلُوفَا
حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ
ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝ (۲/۲۱۳)

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعوے کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اور مومن ہونے کے لئے سعی و عمل کے میدان میں کامیاب ہونا ضروری نہیں؟) حالانکہ ابھی تو تمہیں ان تصادمات کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آچکے ہیں، ہر طرح کی سختیاں اور محنتیں انہیں پیش آئیں۔ شدتوں اور ہولناکیوں سے اُن کے دل دہل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے بیکار نہ تھے، نصرتِ الہی! تر اوقت

کب آئے گا؟ (اور اپنے وقت پر خدا کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہو گئی) "ہاں گھبراؤ نہیں، خدا کی نصرت تم سے دُور نہیں!"

قوم کی طرف سے مخالفت اور مزاحمت کی انتہا ہو جاتی (۱۴۰/۵۱)، لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہ آتی۔

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولًا مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبْرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَ
أَوْ ذُوا حَتَّىٰ أَتَهُمُ نَصْرًا وَلَا مَبْدَلَ لِّكَلِمَاتِ اللَّهِ ج
وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَايَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۴/۳۴)

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے، سو انہوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیت دینے پر استقامت کا ثوب دیا۔ یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد پہنچی۔ اور (یاد رکھو) یہ اللہ کا مقرر کردہ قانون ہے)۔ کوئی نہیں جو اس کی (تغیر آئی ہوئی) باتوں کو بدل دینے والا ہو۔ اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

مصالحات کی کوشش | جب مخالفت سے کام نہ چلتا تو مخالفین کی طرف سے کوشش کی جاتی کہ رسول اپنے اصولوں میں کچھ تبدیلی کر دیں اور ان کی غلط روش

کی کچھ رعایت رکھ دیں۔ کچھ وہ جھکیں، کچھ یہ بڑھیں اور یوں بین بین ان سے صلح کر لی جائے لیکن حق تو کہتے ہی اسے ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ اس لئے اس کی باطل سے مفاہمت کیسی؟ کیا آپ نے کبھی روشنی اور اندھیرے میں مفاہمت کا سنا ہے؟ حق اور باطل کی آمیزش ناممکن ہے۔ یعنی یہ اصول ہی غلط ہے کہ اگر ۵۱ فی صد حق اور ۴۹ فی صد باطل ہو تو اس کا نام حق ہوگا۔ ۵۱ تو ایک طرف، اگر ۹۹ فی صد حق اور ایک فی صد باطل ہو تو بھی وہ حق نہیں کہلا سکتا۔ حق کا دعویٰ ہے کہ دُور دُور چار ہوتے ہیں۔ باطل کہتا ہے کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے ان میں مفاہمت کی صورت نکالی جائے تو یہی کہہ سکیں گے کہ کچھ حق نیچے اترے کچھ باطل آگے بڑھے اور فیصلہ اس پر ہو کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ کہئے اس کا نام حق ہو یا باطل کا باطل ہی رہا؟ اس لئے حق اور باطل میں جب بھی مفاہمت ہوگی وہ باطل کی فتح اور حق کی شکست ہوگی۔ اس لئے کہ حق اسی وقت تک حق ہے جب تک اپنے مقام پر اٹل اور محکم قائم ہے۔ اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور باطل قرار پا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق میں کبھی یک نہیں ہوتی۔ وہ مدامت جانتا ہی نہیں۔ اگر اس نے کبھی

ایسا کر لیا تو اس کا نتیجہ فساد ہی فساد ہوگا۔ زمین، چاند، سورج اور دیگر اجرام سماوی کی ایک خاص اندازے کے مطابق گردش اور حرکت، حق ہے۔ اگر وہ باطل سے مفاہمت کر کے اپنی گردش اور رفتار میں تھوڑی سی تبدیلی بھی پیدا کر لیں تو جو نتیجہ برآمد ہوگا اُسے فساد کے علاوہ اور کیا کہیں گے؟ اور جب خارجی کائنات میں حق و باطل کی مفاہمت و مدامنت کا نتیجہ یہ نکلے گا تو کیا انسانوں کی دنیا میں اس کا نتیجہ کچھ اور نکل سکے گا؟ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے فرمایا:

وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِبَيِّنَاتٍ لَهُمْ فَهَمُّ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ۝ (۱۳/۴۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ حق لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کرتا، تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے یک قلم درہم برہم ہو جاتا۔ ہم نے اُن کے لئے ان کی نصیحت کی بات مہیا کر دی۔ تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے اعراض برت رہے ہیں۔

لہذا رسولِ باطل کی طاغوتی قوتوں کے ساتھ (خواہ وہ تاج شاهی ہو یا سندِ خانقاہی) کبھی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس کا اعلان یہ ہوتا ہے۔

إِنَّا بَرَاءٌ لِّمَنْكُم مِّمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ز
كُفْرًا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ
أَبَدًا حَتَّى تُوْمِلُوا بِأَمْرِ اللَّهِ وَحْدَكَ..... (۶/۴)

(یاد رکھو) ہم تم سے اور تمہارے ان آقاؤں اور حاکموں سے جن کی تم خدا کے علاوہ اطاعت و پیروی کرتے ہو (قطعاً) بری الذمہ ہیں۔ ہم تمہارے مسلک کا انکار کرتے ہیں اور ہمارے

(سابقہ صفحے کا فٹ نوٹ)۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:

”اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامعقول اور مردود ہے۔“ (مولانا حسین احمد کے نظریہ وطنیت کے جواب میں بیان)

تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لئے واضح اور آشکار ہو چکا ہے تا آنکہ تم لوگ

اپنی اس بکج روی سے باز آ کر خدا کے یگانہ دیکتا پر ایمان لے آؤ!

اس لئے کہ رسول کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ تمام انسانی قوانین سے منہ موڑ کر فقط ایک اللہ کے آئین کی محکومت اختیار کی جائے۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائے کہ کچھ معاملات میں خدا کا قانون اور کچھ میں انسانوں کا قانون نافذ العمل ہو تو یہ شرک ہے یعنی خدا کی حکومت میں دوسروں کو شریک کرنا ہے

وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ يَدُوٌّ إِلَىٰ أَذُنِهِمْ لِلْجَانِّ لَكُمْ ۖ وَإِنْ
أَطَعْتُمْ هُمْ إِنَّكُمْ لَعُشْرَكُونَ ۖ (۱۲۱/۴)

اور (دیکھو) شیطان تو اپنے مددگاروں کے دلوں میں دوسرے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج کبھی
کریں۔ اگر تم نے ان کا کہا مان لیا، تو پھر مجھ رکھو تم بھی شرک کرنے والوں میں ہو۔

اور اس کا نتیجہ جہنم۔

ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۖ وَلَا تَجْعَلْ
مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا (۱۴/۳۹)
اے پیغمبر! یہ اُن حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تیرے پروردگار کی جانب سے تجھ پر وحی
کی گئی ہیں اور تمام باتوں کی اصل یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ ٹھہرائے
کہ بالآخر دوزخ میں ڈالے جاؤ، ملامت کے مستوجب اور ٹھکرائے ہوئے!

سورہ شعراء میں ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقُونَ مِنَ الْمُعَذِّبِينَ ۝

(۲۶/۲۱۳)

چنانچہ اے پیغمبر! اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ ٹھہراؤ کہ اس طرح تم عذاب دینے
ہوئے لوگوں میں سے ہو جاؤ گے!

لَمْ يَلَمْ يَشْرِكْ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور مومن کا شیوہ

یہی ہے کہ — لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰)
وہ اپنے رب کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرے۔

لہذا رسول ان سرکش قوتوں سے کسی قسم کی مفاہمت نہ کرتا۔ وہ مصیبتوں کے ہجوم اور مخالفتوں کے سیلاب میں اپنی دعوت کو برابر جاری رکھتا، بے غل و غش اور بے کم و کاست۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلُّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ
يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفِّي كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ
أَوْ يُظْلَمُونَ ۝ (۳/۱۶۰)

اور (دیکھو) خدا کے نبی سے یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ (ادائے فرض نبوت میں) کسی طرح کی خیانت کرے (کیونکہ جو نبی ہو گا وہ خائن نہیں ہو سکتا) اور جو کوئی خیانت کرتا ہے تو جو کچھ اس نے خیانت کی ہے (اُسے دنیا میں لوگوں کی نظروں سے کتنا ہی چھپائے لیکن) قیامت کے دن نہیں چھپا سکے گا۔ وہ اس کے ساتھ آئے گی۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ یہ نہ ہو گا کہ کسی کے ساتھ بھی نا انصافی کی جائے۔

اور اس پر کسی سے معاوضہ یا "حق الخدمت" کا خواہاں نہیں ہوتا۔

معاوضہ نہیں مانگتا قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ

شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رِيبِهِ سَبِيلًا ۝ (۲۵/۵۷)

(اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو کہ میں اپنی اس خدمت پر اس کے سوائے اور کوئی اجر نہیں مانگتا کہ تم میں سے) جو چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنا لے۔

قوم اس کی دعوت کا انکار کرتی۔ انکار ہی نہیں بلکہ سخت ترین مخالفت کرتی تو اس پر اس کا دل کڑھتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی بات کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی نگہ حقیقت میں ان کے اس انکار و جھوٹ کے ہلاکت انگیز مال کو دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح جیسے ایک طبیب مشفق کسی ضدی مریض کی ضد پر اس کے دوائی پینے سے انکار اور پرہیز توڑنے پر اصرار سے افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ مریض اس کا حکم کیوں نہیں مانتا بلکہ اس لئے کہ وہ اس ضد اور انکار میں اس کی موت کو پہنچا دیکھتا ہے۔ رسول ان کے غم میں اپنی جان گھٹا لیتا اور چاہتا کسی نہ کسی طرح انہیں آنے والے

غمخواری

طوفان بلا سے بچالے۔

فَلَعَلَّكَ بَآخِمْ تَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِذَلِ

الْحَدِيثُ اَمْسَقًا ۝ (۱۸/۶)

(اسے پھینچنا) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال لے۔ لیکن ہدایت ایسی چیز نہیں جسے کسی کو گھول کر زبردستی پلا دیا جائے۔ اس کے لئے قلبِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے وہی اختیار کرتا ہے جو اپنے دل کو تمام تعصبات سے پاک اور صاف کر کے اس پیغام پر سکون و سکوت سے غور و فکر کرے۔ اور جب اس طرح اس پر اس کی صداقت واضح ہو جائے تو اسے دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ تسلیم کر لے۔ رسول کا فریضہ راستہ دکھا دینا ہوتا ہے، کسی کو راستے پر لگا دینا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول سے کہہ دیا جاتا ہے کہ

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (۲۴۲)

انہیں ہدایت پر لے آنا تمہارے ذمہ نہیں۔

تمہارے ذمہ فقط احکامات کا پہنچانا ہے۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ط (۲۴۳)

تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیغام حق پہنچا دینا ہے۔

رسول اپنا پیغام پہنچاتے چلا جاتا اور جس جس زمین میں بالیدگی کی صلاحیت ہوتی، وہ لالہ زار بنتی چلی جاتی۔ یوں چند دنوں میں زمین شور اور زرخیز خطے ایک دوسرے سے الگ الگ **معیار تفریق** دکھائی دینے لگ جاتے۔ بس یہ ہے وہ معیار تفریق جس کی بنا پر وہ انسانوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو خدائی نظام حکومت کے تابع لے آئیں (مؤمن) اور دوسرے وہ جو اس سے انکار کر دیں (کافر)۔ ان کے علاوہ آئین خداوندی میں انسانوں کی کوئی تیسری جماعت نہیں، کوئی قوم نہیں۔ اس تفریق پر جغرافیائی حدود و قیود، نسلی تعلقات، رنگ اور زبان کے اختلافات کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی تفریق، باپ کو بیٹے سے، بھائی کو بھائی سے، خاوند کو بیوی سے، دوست کو دوست سے یوں الگ کر کے رکھ دیتی ہے جیسے ریت کے ڈھیر سے لوہے کے ذرات مقناطیسی پتھر سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ ذرہ جو مقناطیس کا اثر قبول کر لے، ایک قوم کا فرد ہے اور جو یہ اثر قبول نہ کرے، دوسری قوم سے متعلق۔ پہلے رسول تنہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ قلبی ہم آہنگی رکھنے والے ذرات

جمع ہو کر ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ قرآن اس جماعت کو حزب اللہ کہتا ہے اور فریقِ مقابل کو حزب الشیطان۔

إِسْتَمَوْذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَهُمُ ذِكْرَ اللَّهِ ط أُولَئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ط أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۵۸/۱۹)
شیطان ان پر چھا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے خدا کی یاد سے انہیں غافل کر دیا۔ یہی لوگ شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہیں۔ یاد رکھو! شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہی خسارہ میں رہنے والے لوگ ہیں!

اور دوسری جماعت۔

لَوْ تَحَدَّ قَوْمًا يُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ وَ لَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ط أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَ آتَىٰ هُمْ بَرُوجٍ مِّنْهُ ط وَ يُلْٰ خِلْفُهُمْ جَنَّتِ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ط رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ ط أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ط أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۵۸/۲۲)

(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اس حال میں نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں خواہ یہ لوگ ان کے ماں باپ ہوں بیٹے ہوں، بھائی ہوں یا اہلِ خاندان۔ (درحقیقت) یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں خدا نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے خدا نے وحی کے ذریعہ سے ان کی مدد فرمائی ہے اور جنہیں وہ ایسے باغات میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ لوگ اُن باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا اُن سے راضی ہو گیا اور وہ لوگ خدا سے راضی ہو گئے۔ یہ ہیں خدا کی جماعت (کے لوگ) یاد رکھو! بے شک خدا کی جماعت والے ہی فلاح پالنے والے لوگ ہیں!

ان دونوں جماعتوں کا سلسلہ تصادم و تراحم بڑھتا جاتا۔ حق اور باطل کی کشمکش زیادہ ہوتی جاتی۔ مریض کی ضد اور اصرار شدت اختیار کرتے جاتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرض کے جراثیم بھی پھیلتے جاتے۔ کبھی کبھی مریض کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ خیال پڑتا کہ وہ طبیب کی طرف رجوع کر لے گا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا
بِالْبَأْسَاءِ وَ الضَّرَآءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ۝ (۴/۹۴)

اور ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو اس کے اربابِ دولت و قوت نے اس کی مخالفت کی۔ جب تک ان کی غلط روش اس نقطہ تک نہ پہنچ جاتی کہ وہ ان کی آخری تباہی کا موجب بن جائے، ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں اور مشکلات آئیں مقصود اس سے یہ ہوتا کہ وہ اپنی غلط روش کے نقصان رساں نتائج دیکھ کر اس سے باز آجائیں۔

لیکن تھوڑے سے عرصہ کے بعد وہ مریض پھر اسی انکار و سہ کشی پر اتر آتا۔ حتیٰ کہ مرض کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا اور اسے ہلاکت چاروں طرف سے یوں گھیر لیتی کہ اُسے محسوس بھی نہ ہوتا کہ وہ کب موت کے آغوش میں پہنچ جاتا (۴/۹۵)۔ اس کا نام عذاب ہے اور یہ سب کچھ ایک خاص قاعدہ اور قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے جسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں (۲۲-۲۵/۴۳)۔ رسول کے آنے سے حجت پوری ہو جاتی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے ہاں طبیب ہی نہیں تھا، ہم علاج کس سے کراتے؟

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ لِّعَلَّآ يَكُونُوا لِلنَّاسِ
عَلَى اللَّهِ حُجَّةً ۚ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا
حَكِيمًا ۝ (۴/۱۶۵)

یہ تمام رسول (صحیح اعمال کے نتائج کی خوش خبری دینے والے اور انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر نہ کر سکیں کہ راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا اپنے تمام کاموں میں سب پر غالب اور حکمت رکھنے والا ہے۔

اور یہ ہے کبھی نہایت ضروری۔ جب انسان کو ایسی فضا میں چھوڑا گیا جہاں ہر قسم کے مؤثرات اس پر

اثر انداز ہو کر اسے غلط راہوں پر لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو اسے ان راستوں کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس تنبیہ اور تنذیر کے بعد اگر کوئی دیدہ دانستہ ان ہلاکت کے عمیق گڑھوں میں گرنا چاہے تو اسے کون بچا سکتا ہے؟ اسی لئے فرمایا۔

ذٰلِكَ اَنْ تَمَّ يَكُنْ ذٰلِكَ مَهْلِكُ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا
غٰفِلُوْنَ ۝ (۱۳۱/۴)

یہ (پیغمبروں کا ظہور اور دعوتِ حق کا اعلان) اس لئے ہوا کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ ظلم و نا انصافی سے بستیوں کو ہلاک کر دے، درآں حالیکہ وہاں کے رہنے والے (راہِ حق سے) ابے خبر ہوں!

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر دور اپنے پر علی حروف میں راہ نما کھبے نصب کر دے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے سرفرازیوں اور کامرانیوں کی جنت کا راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے ذلت و رسوائی کے جہنم کی طرف چل دے۔

مَنْ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَنْفُسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى ۚ وَ مَا كُنَّا
مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (۱۵/۱۱) (نیز ۴۹-۵۰/۴۰)

جو سیدھے رستے چلا، تو اپنے ہی لئے چلا اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ بھی وہی اٹھائے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا (ہر جان کو خود اپنے ہی اعمال کا بوجھ اٹھانا ہے) اور ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ کسی قوم کو (عذاب دیں) مگر اسی وقت جبکہ اس میں ایک رسول پیدا کر دیتے ہیں (اور پھر بھی لوگ سرکشی و فساد سے باز نہیں آتے) تاکہ جہنم کی ہلاکت سامانیوں میں گھرنے کے بعد یہ گلہ نہ رہے کہ ہمیں راستہ بتانے والا ہی کوئی نہ تھا۔

یہ ہے مقصدِ بعثتِ انبیاء کرامؑ جو لوگ ان کے پیغام کے مطابق اور ان کے نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں دنیا بھر کی خوش بختیاں ان کے قدم چومتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے جوہرِ انسانیت میں ایسی جلا اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی میں بھی سرفراز و شاد کام رہتے ہیں۔ اس کے

برعکس جو ان کی تکذیب کرتے ہیں اُن کے فقط افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔

لَمَّا أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ۖ كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةٌ رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ
فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۖ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ
لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار ایک کے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا، معاوہ جھٹلانے پر آمادہ ہو گئی۔ پس ہم بھی ان کو ان کے اعمال کے نتیجے میں ایک کے بعد ایک کر کے تباہ کرتے گئے، تا آنکہ ان کی ہستیاں (در روایت کا) افسانہ بن گئیں کیونکہ ان کے لئے محرومی و نامرادی ہی ہے جو قوانین خداوندی پر یقین نہیں کرتے!

واضح رہے کہ اس عذاب کی صورت یوں نہیں ہوتی تھی کہ اللہ کا رسول آتا، یہ لوگ اسے جھٹلاتے،

اس پر (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا اور ان پر عذاب مسلط کر دیتا۔ یہ تصور ہی باطل ہے۔

عذاب بات بالکل سیدھی اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔ رسول کہتا کہ یہ سنکھا ہے۔ جو شخص اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ ایک شخص اس کی بات کو صحیح مانتا (ایمان) اور اس زہر سے اجتناب برتتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی ہلاکت سے محفوظ رہتا۔ دوسرا کہتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے (تکذیب) اس کی بات مست مانو (کفر) یہ سنکھا نہیں شکر کی ڈلی ہے اور یہ کہہ کر اسے نگل جاتا۔ انجام ظاہر ہے۔ اس انجام کا نام ہے عذاب۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے قرآن نے سورۃ یسین کی چند آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے،

یعنی (۱۳۶ - ۳۳/۳۶) میں۔ انہیں دیکھ لیا جائے، نیز آیات (۵۹ - ۴۱/۳۹)؛ (۵۳/۴)۔

سید روحول نے ان حضرات انبیاء کرام کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا
الرُّسُلِينَ ۚ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُّسْتَدْفِنُونَ
وَمَا لِي ۖ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي ۖ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝
أَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا ۖ إِنْ يَسِرُّنَ الرِّجْسُ بُضْرًا
لَّا تَنْفَعُنِي عَيْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا ۖ وَلَا يُنْقِذُنِي ۖ إِنْ يَئْتِ إِذَا

لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۲۰ - ۳۶/۲۴)

اور (دیکھو) شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ کہنے لگا "اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ ان کی پیروی کرو جو تم سے (اپنی راہنمائی کا) کوئی بدلہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہ یاب ہیں۔ (ہاں ہاں) مجھے کیا ہوا کہ میں اس خدا کی محکومیت اختیار نہ کر لیا جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اس کے علاوہ کچھ اور آقا اور حاکم ٹھہروں کہ اگر خدا مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ مجھ پر ان حاکموں اور آقاؤں کی سفارش ہی کچھ کام دے سکے اور نہ ہی وہ (خدا کے صواب سے) بچا سکیں؟ اگر میں ایسا کرنے لگوں تو پھر تو میں بڑی کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔ (نہیں، اے خدا کے فرستادہ پیغمبرو! میں تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ میرا یہ اقرار سن رکھو!

لیکن انہوں نے اس پکارنے والے کی پکار پر بلیک کہنے کے بجائے اسے قتل کر ڈالا۔ اس کا تو کچھ بگڑ نہیں اس لئے کہ اسے اس مقام سے بلند ترین مقام مل گیا۔

قَالَ اَدْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يٰلَیْتُ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا عَفَرْتُ رَبِّیْ ۚ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ ۝ (۲۶ - ۳۶/۲۷)

کہا گیا "جا" تو تو جنت میں داخل ہو جا۔ وہ بولا "اے کاشن! میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے میری حفاظت کر دی اور مجھے (اپنے نزدیک) معزز لوگوں میں سے کر دیا۔

لیکن اس قوم کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا۔ اس کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اترے۔

وَ مَا اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِہٖ مِنْۢ بَعْدِ ۙ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا کُنَّا مُنْزِلِیْنَ ۝ (۳۶/۲۸)

اور (یاد رکھو) ہم نے اُس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی (فرشتوں کی) فوج نہیں اتاری اور نہ ہی ہم اتارنے والے تھے۔

ایک آواز اور بس خاتمہ۔

اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَةٌ وَّ اَحَدًا ۙ فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ۝ (۳۷/۱)

ایک چیخ (کی آواز) کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سب یک بارگی بے حس و حرکت

پڑے تھے۔

کیا حسرتناک ہے یہ انجام۔

يَحْسِرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ (۳۶/۳۰)

ہائے رے افسوس ان بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول بھی آتا تھا یہ لوگ اس کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔

انجام ان لوگوں کا جنہوں نے اپنے سے پہلے گزرنے والی اقوام کے انجام و عواقب کی داستانوں (تاریخی شواہد) سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَتْلَهُمُ إِلَهُهُمْ
لَوْ يَجْعَلُونَ ۝ وَإِنْ كُلُّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ۝ (۳۶/۳۲-۳۱)
کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلیں (محض اسی وجہ سے) تباہ کر دی ہیں کہ وہ ان (رسولوں) کی طرف پلٹتے نہیں تھے اور بلاشبہ وہ سب کے سب ہمارے حضور میں جمع کئے جائیں گے!

اس آخری آیت پر غور فرمائیے۔ یعنی اس دنیا میں ایسا عبرت انگیز انجام اور اس کے بعد اگلی منزل کی کامرانیوں سے محرومی! یہاں بھی اصول و قانون کے مطابق، وہاں بھی آئین و دستور کے موافق۔

بَلَىٰ قَدْ جَاءَ نَشَأُ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا ۖ اِسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَشْرٰى الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
عَلٰى اِلٰهِهِمْ مُّجُوهٌ مُّسْوَدَّۃٌ ۚ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوٰى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (۳۹/۵۹-۶۰)

کیوں نہیں؟ تیرے پاس میری آیتیں آچکی ہیں، پس تو انہیں جھٹلا چکا، غور کا اظہار کر چکا اور نہ ماننے والوں میں سے بن چکا۔ (اور اے پیغمبر!) قیامت کے روز تم ان لوگوں کو دیکھو گے جو خدا پر جھوٹ بولتے تھے کہ ان کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے۔ کیا جہنم میں مغرور لوگوں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟ (ہے اور ضرور ہے)۔

یہ ہے مفہوم رسول کی تکذیب سے اور یہ ہے مقصود عذابِ خداوندی سے۔ محکمہ موسمیات کی طرف سے یہ انتظام ہوتا ہے کہ جو نہی انہیں معلوم ہو کہ دورِ سیکڑوں میل پر طوفان کے آثار ہیں اور پانی کی رفتار بتا رہی ہے کہ سیلاب اتنے وقت میں فلاں فلاں مقام تک آپہنچے گا تو وہ ان مقامات پر متعین شدہ اہلکاروں کو بذریعہ تار اس کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ اہل کار ارد گرد کے گاؤں والوں کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ فوراً اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اب جو لوگ ان کی بات کی تصدیق کر کے ان پر عمل پیرا ہوں گے وہ طوفان سے بچ جائیں گے۔ لیکن جو ان کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ یہ یونہی کہتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہ نذرِ سیلاب ہو جائیں گے۔ یہ ہے (تمثیلاً) تکذیبِ رسل۔ اگر وہ لوگ رسولوں کی تنذیر پر کان دھر کر اپنی غلط روش کو بدل دیں، تو ہلاکت سے بچ جائیں اور اگر رسول کی اس تنذیر کی ہنسی اڑائیں اور اپنی اُسی روش پر قائم رہیں، تو ہلاکت آمیز عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔



اس طرح یہ سلسلہٴ رشد و ہدایت قائم رہا۔ جب دنیا بمنور اپنے عہدِ طفولیت میں تھی، تو سلسلہٴ رسل و رسائل اور نامہ و پیام کا یہ انتظام نہ تھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے کی آواز بیک وقت دنیا کے ہر کنارے تک جا پہنچے۔ اُس وقت تو ایک بستی کی بات کا دوسری بستی تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لئے قریہ قریہ، بستی بستی، قبیلہ قبیلہ کی طرف الگ الگ رسول آئے۔

وَ لَکَ اُمَّةٌ رَّسُولٌ ۚ فَاِذَا جَاۤءَ رَسُوْلُهُمْ قَضٰی بَیْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۶۴/۱ نیز ۱۳۷/۳۴ ۱۱۴/۲۴ ۱۲۵/۲۵)

لے صرف اس لئے ہی نہیں کہ اُس زمانہ میں سلسلہٴ رسل و رسائل ایسا عالمگیر نہ تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ ابھی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ بین الاقوامی روابط سے ایک عالمگیر برادری کے افراد بن سکیں۔ اُس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی الگ الگ تربیت کر کے ان میں وحدتِ خلق و وحدتِ خالق کا صحیح تصوق پیدا کیا جائے اور اس طرح ان کی انسانیت میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

اور (یاد رکھو) ہر امت کے لئے ایک رسول تھا (جو اُن میں پیدا ہو کر انہیں دینِ حق کی طرف بلاتا تھا)۔ پھر جب کسی امت میں اس کا رسول ظاہر ہو گیا، تو (ہمارا قانون یہ ہے کہ) اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ نا انصافی ہو۔

ہر قریہ میں رسول | ہر قریہ میں
 وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرٌ مُّذَكَّرٌ (۲۶/۲۷)
 اور ہم نے کسی آبادی کو ہلاک و برباد نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لئے انکار و بد عملی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے!

اور جب دنیا ذرا اور آگے بڑھ آئی تو علاقہ کے صدر مقام میں رسول آتے رہے جہاں سے اُن کی آواز اپنے اپنے دائرہ تبلیغ میں پہنچتی رہی۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا
 يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَآهْلُهَا
 ظَالِمُونَ ۝ (۲۸/۵۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تمہارا پروردگار آبادیوں کو اُس وقت تک ہلاک و برباد کرنے والا نہیں جب تک اُن آبادیوں کے صدر مقام میں اپنا کوئی رسول نہ بھیج دے جو اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے۔ اور ہم آبادیوں کو بجز اس صورت کے ہلاک کرنے والے نہیں ہیں کہ اُن آبادیوں والے (خود) ہی ظالم ہوں (اور اس طرح اس سزا کے مستحق ہو جائیں)۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ وہ وقت آ گیا جس کے بعد انسانیت نے ایک نئے دور میں داخل ہو جانا تھا۔ یعنی اس سے پہلے ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا۔ اب اُسے صاحبِ شعور بن جانا تھا چنانچہ

لے ہر رسول کے پیغام کی زبان وہی ہوتی تھی جو اس قوم کی زبان تھی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۳/۴)
 اور ہم نے کوئی پیغامبر دنیا میں نہیں بھیجا، مگر اس طرح کہ اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغامِ حق پہنچانے والا تھا تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے۔

اس وقت اس نبی آخر الزمان کی باری آئی جسے تمام نوع انسانی کے لئے رسول بن کر آنا تھا اور جس کے ساتھ نبوت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا تھا (تفصیل اس اجمال کی ”معراج انسانیت“ میں ملے گی)۔ ایک رسول آتا اور اپنے مقصد رسالت کی تکمیل کے بعد چلا جاتا۔ جب جاتا تو اپنا پیغام یعنی **رسول کے بعد** وہ ضابطہ قوانین جس کے ماتحت انسانوں کو اپنی زندگی بسر کرنی تھی اپنے متبعین کے سپرد کر جاتا۔ کچھ عرصہ تک وہ اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے لیکن آہستہ آہستہ مختلف امیال و عواطف اور متنوع اسباب و علل کے ماتحت وہ اس نظام سے کنارہ کشی کرتے جاتے۔ ارباب قوت و اقتدار رفتہ رفتہ پھر اسی انسانی حکومت کو لوگوں پر مسلط کر دیتے جسے حکومت الہیہ میں بدلا گیا تھا۔ اراکین مذہب چپکے ہی چپکے اس ضابطہ قوانین (کتاب اللہ) میں تبدیلیاں کرتے رہتے جس کے وہ وارث بنائے گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ایسا وقت آ جاتا کہ کتاب (انسانی تحریف و الحاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجموعہ قوانین ارضی و سماوی حوادث کی نذر ہو جاتا اور دنیا میں اس کا اصلی وجود کہیں باقی نہ رہتا اور دین کی جگہ وہ رسومات و روایات لے لیتیں جو انسانی دماغوں نے وضع کر کے دین کا جزد بنا رکھی تھیں اور جو دلچسپ اور نظر فریب ہونے کے اعتبار سے عوام کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔

وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَ كَوْشَاءُ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝ (۱۴/۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) حضری اور بدوی آبادیوں کے سرکش سرغنوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے) پس (انکی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہوا) انہیں ان کی افتراء پر دانیوں میں چھوڑ دو۔

جب حالت یہ ہو جاتی کہ نہ وہ قوم آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی اور نہ ان میں وہ ضابطہ قوانین ہی اپنی اصلی شکل میں باقی رہتا تو پھر ایک اور رسول آ جاتا جو انہیں پھر سے آئین خداوندی کے مطابق

نیا رسول | زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتا اور سابقہ (محرف شدہ) مجموعہ قوانین سے (وحی الہی کی روشنی میں) انسانی تحریفات و تلبیسات کو الگ کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کرتا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَ لَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّيَ الْفَعَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَتِهِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ حق کی مخالفت قوتوں نے ان کی تلاوت کردہ (وحی) میں آمیزش کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے (ایک دوسرا رسول بھیج کر) ان کی آمیزش کو مٹا ڈالا اور اپنے قوانین کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ سب کچھ جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

اس کی پھر اسی طرح مخالفت ہوتی جس طرح رسول ماسبق کی ہوئی تھی۔ مسخ شدہ دین اور محرف کتاب پر جم کر بیٹھنے والے 'اس' نئے 'مسلم' کے خلاف شدید ترین محاذ قائم کر لیتے اور اس کے لئے دلیل یہ لاتے کہ یہ مسلم اس مسلم کے خلاف ہے جو ان میں ان کے اسلاف سے متواتر چلا آ رہا ہے (دیکھئے ۵۳-۲۲/۵۲)۔

جزئیات میں ارتقا | تحریف کے علاوہ اس سلسلہ تجدید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا اپنے ابتدائی ادوار طے کرتی ہوئی من حیث اکل او پر کو ابھرتی چلی آ رہی تھی اس لئے اگر انسانی حیات اجتماعیہ کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر سابقہ تعلیم کی بعض جزئیات کو بدلنا مقصود ہوتا تو انہیں منسوخ کر کے 'اس نئے رسول کی وساطت سے' دوسری جزئیات و تفصیل دے دی جاتیں۔

لے یہ ضروری نہیں کہ سابقہ تفصیل و جزئیات (شریعت کے احکام) کو بہ تمام و کمال بدل دیا جاتا۔ کسی ایک حکم کے بدلنے سے بھی سابقہ شریعت، جدید شریعت بن جاتی۔ اس لئے کہ جن احکام کو خود خدا نے نافذ فرمایا ہو وہ خدا ہی کے حکم سے بدلے جاسکتے ہیں اور خدا کا یہ حکم انبیائے کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا۔ لہذا اگر کوئی رسول کسی سابقہ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

مَا نَسَمْنَا مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۲/۱۰۶)

ان (اہل کتاب) کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں۔

ان سے کہہ دو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دئے گئے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے اور یہ نئے احکام پہلے احکام بہتر ہوتے ہیں جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کر دیتی ہیں یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲/۵۲) ان کی جگہ انہی جیسے احکام جدید وحی میں دئے دیئے جاتے ہیں (۱۱۶/۱۱) اور یہ سب کچھ ہمارے مقرر کردہ اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

انہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطہ حیات دیا گیا ہے جس میں تمام سابقہ پیمانے آگئی ہیں جو ہر طرح سے مکمل ہے (۵/۳۰، ۱۱۶/۴) اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا (۱۵/۹)۔

لیکن یہ نیا رسول خواہ اسی ضابطہ قوانین کی تجدید کرتا جو اس سے پیشتر نازل ہوا تھا یا اس میں کچھ رد و بدل ہو جانا بہر حال اب ایمان و اطاعت اسی کی واجب ہوتی، ان پر بھی جو اپنے آپ کو سابقہ رسول کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسروں پر بھی اس لئے کہ

(۱) یہ رسول بھی اُسی خدا کی طرف سے آیا تھا جس خدا نے سابقہ رسول بھیجا تھا۔ اگر سابقہ رسول کی طرف نسبت اور اس کی مرسومہ اطاعت ہی کافی ہوتی تو اس نئے رسول کی بعثت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اطاعت تو

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ)

تعلیم کے ایک حکم کو بھی بدلتا ہے تو وہ ایک نئی شریعت لاتا ہے اور اگر کچھ ضابطہ قوانین اپنی اصلی شکل میں موجود ہو اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل بھی متصور نہ ہو تو پھر کسی رسول (یا نبی) کے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

درحقیقت خدا کی ہے۔ جب خدا کا یہ حکم ہے کہ میری اطاعت اس ضابطہ کی رُو سے ہوگی جو اس رسول کی وساطت سے بھیجا گیا ہے تو خدا کی اطاعت کرنے والوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ نئے رسول سے انکار درحقیقت اس جذبہ پر مبنی ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے دعوائے رسالت میں (معاذ اللہ) جھوٹا ہے۔ یا (خاکم بدہن) اس خدا کا بھیجا ہوا نہیں جس خدا نے سابقہ رسول کو بھیجا تھا۔ اور یہی وہ تکذیب ہے جس کا آل (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہلاکت ہے۔

(ii) ہر نیا ضابطہ، گزشتہ ضابطہ قوانین کا نیا ایڈیشن ہوتا جس کا ہر حرف اور لفظ یقینی طور پر منجانب اللہ ہوتا۔ اس لئے یقین کو چھوڑ کر ظن کا اتباع حتیٰ پرستی نہیں، باطل پر اڑے رہنا ہے۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ذَٰلِكُمْ عَنْهُمْ إِذَا يَخْزُصُونَ ۝ (۶/۱۱۷)
وہ پیروی نہیں کرتے مگر محض گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

(iii) تبدیلی و تجدید کا یہ سلسلہ خود مشیتِ خداوندی کے ماتحت واقع ہوتا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی ضابطہ قوانین کو اللہ تعالیٰ دستبردِ انسانی اور حوادثِ ارضی و سماوی سے محفوظ و مصون رکھنا چاہے اور کوئی قوت اس میں رد و بدل پیدا کر دے! کس میں یہ قوت ہے کہ ایسا کر سکے؟ اس لئے اگر ایک ضابطہ قوانین اپنی اصلی شکل میں دنیا میں نہیں رہا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ابد الابد تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا ہی نہیں گیا تھا۔ اس لئے دوسرا ضابطہ آتا ہی اس وقت تھا جب پہلے کا نافذ العمل رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ لہذا ایک جدید رسول کی آمد پر کسی سابقہ رسول اور اس کی کتاب سے تمسک، اس نظامِ رشد و ہدایت کی مخالفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے تجویز فرمایا ہے۔

(۷) اس نئے رسول کی وحی میں سابقہ رسول کی وحی کا وہ تمام حصہ موجود ہوتا ہے جسے علیٰ حالہ رکھا جانا اللہ کو مقصود تھا۔ سابقہ وحی کا جو حصہ منسوخ کیا جاتا، اس کی جگہ اس سے بہتر احکام و ضوابط دیئے جاتے اور

لے قرآن کو ہمیشہ تک کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا اور آج تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکی کہ اس کے ایک حرف کو کبھی اپنی جگہ سے بدل دے۔ قرآن کس طرح قیامت تک کے لئے نصابِ زندگی ہے، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اُس (سابقہ وحی) میں سے جو حصہ دست برد زمانہ کے ہاتھوں سے ضائع ہو چکا ہوتا، اُسے اس نئی وحی میں دوبارہ دیدیا جاتا۔ لہذا وحی خداوندی کا یہ نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن کے مقابلہ میں بہر نوع ہوتا اور یہ سب کچھ خدا کی طرف سے کیا جاتا۔

(۷) اور پھر یہ کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ایک رسول، صرف قانون کی کتاب دینے کے لئے ہی نہیں آتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اُسے عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور اس کی عملی تشکیل کی صورت فقط ایک ہے کہ سب سے پہلے مرکز حکومت الہیہ کی اطاعت کی جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ...

(۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا تو اسی لئے کیا کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

لہذا اس رسول کے متعین فرمودہ نظام زندگی کی موجودگی میں اپنے نظام کہن پر قائم رہنا حکومت الہیہ کے متوازی ایک دوسری حکومت PARALLEL GOVT قائم کرنا ہے جو صریحاً شرک ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ایک نئے

کیا تمام مذاہب سچے ہیں

رسول کی بعثت پر کسی سابقہ رسول کی طرف نسبت یا (برغم خویش) اس کی شریعت کا اتباع میزان خداوندی میں کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ روش تدبیر خداوندی کی کھلی ہوئی تکذیب ہے جس کے ماتحت اُس نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے۔ یہ روش اس امر کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل (معاذ اللہ) بے سود اور لا حاصل تھا۔ لہذا آج یہ کہنا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں، کھلی ہوئی گمراہی، قرآن کے عظیم الشان اصول کی تین تکذیب اور سلسلہ رشد و ہدایت کی تدبیر خداوندی کے بے سود و لا حاصل ہونے کا واضح اعلان ہے۔ ہر مذہب میں اپنے اپنے وقت میں عالمگیر سچائیاں موجود تھیں۔ لیکن جب ان سچائیوں کا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہا اور مشیت ایزدی کو منظور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرا ضابطہ قوانین بھیج دے تو اب سچائیاں جدید

لے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) میں یہی کہا ہے۔

ضابطہ میں محصور ہو کر آگئیں۔ یعنی یہ دوسرا ضابطہ آیا ہی اس وقت جب مشیت کو یہ منظور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرا ضابطہ قوانین بھیج دے۔ تو اب سچائیاں جدید ضابطہ میں محصور ہو کر آگئیں۔ یعنی یہ دوسرا ضابطہ آیا ہی اس وقت جب مشیت کو یہ منظور ہوا کہ دوسرا ضابطہ پہلے کی جگہ لے لے۔ ورنہ اگر پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے کافی سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے اسے ہمیشہ تک محفوظ رکھنے میں کوئی دقت تھی؟

دنیلے مذاہب میں عام طور پر دو ہی قسم کے نظریے پائے جاتے ہیں۔

(i) یا تو ہر مذہب کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائیاں صرف انہی کو ملی تھیں۔ کسی دوسرے مذہب کو سچائیاں ملی ہی نہ تھیں۔ یعنی ان کے باقی مذاہب کے علاوہ کوئی اور مدعی رسالت نبوت (معاذ اللہ) سچا نہ تھا۔ اور

(ii) یا ہر مذہب سماجی قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عالم گیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کار بند ہو جائیں تو منشاء خداوندی پورا ہو جائے گا۔

لیکن قرآن کو ماننے والا ان میں سے کسی نظریہ کی بھی تائید نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک پہلا نظریہ اس لئے غلط ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ تمام حضرات انبیائے کرام اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے وہ سچے تھے۔ ان کی تعلیم سچی تھی اور ان کے پیرو سچے تھے۔

اور دوسرے نظریہ کی اس لئے تائید نہیں کی جاسکتی کہ دوسرا رسول بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب پہلے رسول کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی اور مشیت ایزدی کو منظور ہوتا تھا کہ پہلے ضابطہ کی تجدید

لے ہم نے یہ لکھا ہے کہ ایک جدید ضابطہ قوانین اس وقت آتا جب پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس سبب ہم نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ دوسرا ضابطہ اس لئے آتا کہ پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہا تھا۔ بلکہ یہ کہ چونکہ پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا اس لئے دوسرا ضابطہ بھیجا جانا ضروری تھا۔ یہ تمام وقتی ضوابط تھے جن کی جزئیات و تفصیل میں انسانی داعیات و مقتضیات کے ساتھ ساتھ ارتقائی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ آخری ضابطہ قوانین (قرآن مجید) انسان کے تمام مقتضیات کو سامنے رکھ کر عطا کیا گیا اس لئے اس کے بعد کسی اور تجدید کی ضرورت نہیں رہی اس میں وہ سب کچھ بھی ہے جو پہلے ضوابط میں تھا اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ بھی جس کی تکمیل کی شرف انسانیت کے لئے ضرورت ہے۔

اور اس میں مناسب حک و اضافہ کے بعد ایک نیا ایڈیشن بھیجا جائے۔ اس لئے دوسرے رسول (یا ضابطہ) کی آمد پر اس پر ایمان اور اس کے پیغام کی اطاعت ضروری ہو جاتی۔ چونکہ ان سب کے آخر میں محمد رسول اللہ صبحوت ہوئے اس لئے ہر ایک کے لئے آپ پر ایمان لانا اور آپ کے آوردہ ضابطہ قوانین کی اطاعت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اور چونکہ مشیت کی اسکیم کے مطابق اس آخری ضابطہ قوانین کو ہمیشہ کے لئے نصاب زندگی رہنا تھا اسے اس انداز سے محفوظ و مصنون رکھا گیا کہ اس کا ایک نقطہ بھی ادھر ادھر نہیں ہو سکا نہ ہو سکے گا۔ اس اجمال کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ تفصیل اپنے مقام پر آئیں گی۔ سر دست انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ ہر رسول اپنے اپنے وقت میں خدائی ضابطہ قوانین اپنے ساتھ لاتا تھا (اسے الذین کہتے ہیں) اور اس کی عملی تشکیل سے بتا دیتا تھا کہ اس نظام کی اطاعت سے حکومت الہیہ کا قیام کس طرح ہوگا (اسے الاسلام کہتے) لہذا دین خداوندی شروع سے ایک ہی تھا۔ لیکن رسول کے بعد اس کے پیرو اس میں اختلافات پیدا کر دیتے تھے اس لئے دوسرے رسول کے ذریعے (مناسب تغیرات کے ساتھ) اسی ضابطہ سیات کی تجدید کرا دی جاتی تھی۔ اسی حقیقت کبریٰ کو قرآن کریم ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ قَدْ مَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ
أَوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا
بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۶۴)

بلاشبہ ”الدين“ (یعنی اصل دین) اللہ کے نزدیک ”الاسلام“ ہی ہے (اس ایک دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور یہ جو اہل کتاب لے باہر گم اختلاف کیا (اور گروہ بن دیاں کر کے الگ الگ دین بنائے) تو یہ اس لئے نہیں ہو کہ اس دین کے سوا انہیں کسی دوسرے دین کی راہ دکھلائی گئی تھی یا دین کی راہ مختلف ہو سکتی ہے؛ بلکہ اس لئے کہ علم (وحی) کے حصول کے بعد وہ آپس کی ضد اور عناد سے الگ الگ ہو گئے۔ اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کے قوانین سے انکار کرتا ہے (اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے) تو اللہ کا قانون جزا بھی حسا

لینے میں سست رفتار نہیں!

دوسرے مقام پر ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِيمَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ
وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا
بَيْنَهُمْ ط (۱۳ - ۱۴/۱۳)

دیکھو خدا نے تمہارے لئے الدین سے وہ سب کچھ واضح کر دیا ہے جس کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جو کچھ ہم نے (اسے پیغمبر اسلام!) تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور (اسی کے ساتھ ساتھ) وہ سب کچھ بھی جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (جس کا بنیادی اصول یہ ہے) کہ الدین کو قائم رکھو اور اس کے بارہ میں فرقہ فرقہ نہ بن جاؤ۔ یہ بات جس کی طرف تم لوگوں کو بلارہے ہو ہمیشہ کہیں کو بڑی گراں گزر رہی ہے کہ خدا نے ہمیں چھوڑ کر اس کام کے لئے محمد کا انتخاب کیوں کیا۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف، رگزیہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔ اور (دیکھو یہ لوگ فرقوں فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (خدا کی طرف سے) علم (کا نور) آچکا تھا (اور وہ بھی کیوں؟) محض آپس کی عداوت کی وجہ سے!

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد قرآن کریم کی اس مرکزی تعلیم کا مفہوم آسانی سمجھیں آسکے گا۔ فرمایا۔
أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے طوعاً و کرہاً سب اسی کے حکم کے فرمانبردار ہیں اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں!

یہاں ایک اصول بیان فرما دیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُذُنِي
مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَاللَّيْسِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَلَقَدْ فَرَّقْنَا بَيْنَ
آخِذٍ مِنْهُمْ وَتَحَنُّنٍ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ (۳/۸۴)

(اے پیغمبر! تم کہہ دو) ہماری راہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا تھا، اس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو (بہ حیثیت منصب رسالت) دوسروں سے جدا نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اوجس کی زبانی بھی آئی تھی، سچائی تھی) اور ہم اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں!

یہ ہے وہ سلسلہ رشد و ہدایت جو نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم ہوا۔ اس لئے ہر اس شخص کے لئے جو اس آئین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اقرار کرتا ہے، اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تمام انبیائے کرام کا سرچشمہ تعلیم ایک ہی تھا اور وہ سب اپنے دعوائے رسالت و نبوت میں پہنچتے تھے۔ ان کی تعلیم بھی سچی تھی، لیکن وہی تعلیم جو ان پر نازل ہوئی تھی، نہ وہ جو دوسرے رسول کے آنے کے وقت رسول ماسبق کے نام لیواؤں کے پاس تھی۔ اسی لئے مَا أُنْزِلَ عَلٰی اِبْرٰہِیْمَ (جو کچھ ابراہیم پر نازل کیا گیا تھا) اور مَا أُوْتِیَ مُوسٰی وَ عِیْسٰی (جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا تھا) پر ایمان ضروری ہے نہ کہ اس تعلیم پر جو ان حضرات کی طرف بعد میں منسوب کر دی گئی۔ اگر ان کی نسخ کردہ تعلیم پر ایمان ضروری (یا کافی) ہوتا تو کسی جدید رسول کے آنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ ہے الدین اور یہ ہے الاسلام۔ لہذا

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْهُ ۚ
وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (۳/۸۵)

اور (دیکھو) جو کوئی اسلام کے سوا (جو خدا کی طرف سے نصاب زندگی کا آخری ایڈیشن اور مکمل نصاب زندگی ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے!

اور یہ اسلام! اب قرآن کی دفتین کے باہر کہیں نہیں۔

یہ ہے وہ سلسلہ رسالت جو اس زمانہ سے شروع ہوا جب انسانی شعور نے اپنی آنکھ کھولی اور جادہ بجادہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہوا حضرت عیسیٰ تک پہنچا۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ^(۲۳)

بس ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔

آنے والے کی تصدیق | یہ سلسلہ یوں تھا کہ ہر جانے والا رسول اپنے متبعین کو تاکید کر جاتا کہ اس کے بعد جو رسول آئے اس کا اتباع کرنا کیونکہ دہر چند تمہیں اس کی تعلیم اس مسخ شدہ تعلیم سے جو اس وقت تمہارے پاس ہوگی مختلف نظر آئے گی لیکن وہ درحقیقت میری ہی تعلیم کی تصدیق کرے گا اور اسی سلسلہ الذہب کی اگلی کڑی ہوگا۔

وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّنْ كِتَابٍ
وَ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ
بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ ؕ أَقْرَبُ لَكُمْ ؕ أَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ
إِصْرِي ۖ قَالُوا ؕ أَقْرَبُنَا ۚ قَالَ ؕ فَاشْهَدُوا ؕ إِنَّا مَعَكُمْ مِّنَ
الشَّاهِدِينَ ۝ (۳/۸۱)

یہ سلسلہ ہدایت کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ایک ہی پیغام ہے جو شروع سے اخیر تک مسلسل چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ انبیاء کے ذریعے ان کی امتوں سے عہد کر لیا کرتا تھا کہ تمہیں یہ کتاب و حکمت دی گئی ہے لیکن اس کے بعد جب ہم (عند الضرورت) کوئی دوسرا رسول بھیجیں جو اس تعلیم کو سچا کر دکھائے جو تمہیں دی گئی تھی تو تم نے گروہ بندانہ تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت نہ شروع کر دینا بلکہ اس کی صداقت پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

یہ اس قدر اہم اصول تھا کہ اللہ ان سے بتا کہ پوچھتا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور مجھ سے اس کا عہد کرتے ہو کہ ایسا ہی کرو گے؟ وہ کہتے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں یعنی یہ چیزیں ان کا جزو ایمان ہوتی تھیں۔ اس پر اللہ ان سے کہتا کہ اب تم اپنے اس عہد اقرار کی نگرانی کرنا اور میں بھی اس کی نگرانی کروں گا (کہ تم اسے نبھاتے ہو یا نہیں)۔

یہ اقرار اُمم سابقہ سے لیا جاتا تھا ایک اقرار خود انبیاء سے بھی لیا جاتا تھا جس کا ذکر

(۳۳/۷) میں آئے گا۔

سورۃ انعام میں اس داستانِ زریں کو ایک ہی مقام پر یوں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جیسے آسمان آنکھ کے تل میں۔ فرمایا۔

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ
مَّن نَّشَاءُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ (۶/۸۳)

اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اُسے علم و بصیرت دے کر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے!

اس کے بعد۔

وَ هَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ ۖ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوحًا هَدَيْنَا
مِّن قَبْلُ ۚ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ أَيُّوبَ ۚ وَ يُوسُفَ
وَ مُوسٰى وَ هَارُونَ ۚ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَ زَكَرِيَّا
وَ يَحْيٰى وَ عِيسٰى وَ إِلْيَاسَ ۚ كُلًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَ إِبْرٰهِيْمَ
وَ الْيَسَعَ وَ يُوسُفَ وَ هَارُونَ ۚ وَ كَذٰلِكَ فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (۶/۸۴-۸۳)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی اور ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں۔

اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (یہی) راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح نیک کرداروں کو ان کی نیک کرداری کا بدلہ دیتے ہیں۔

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔ اور نیز اسمعیل، الیسع، یونس اور لوط کو کہ ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔

پھر تفصیل سے ہٹ کر اجمال آگیا۔

وَ مِنْ آبَائِهِمْ وَ ذُرِّيَّتِهِمْ وَ إِخْوَانِهِمْ وَ اجْتَبَيْنَاهُمْ
وَ هَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (۶/۸۵)

اور ان کے آبار و اجداد اور ان کی نسل اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں ہی کو ہم نے اسی راہ پر چلا دیا۔ ان سب کو ہم نے برگزیدہ کیا تھا اور (فلاح و سعادت کی سیدھی راہ ان کو کھول دی تھی۔

یہ تمام حضرات اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آئے تھے۔

ذٰلِكَ هُدًى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحِطَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۸۸)

یہ اللہ کی ہدایت ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کی روشنی دکھا دے۔ اور اگر یہ لوگ (توحید کی راہ کو چھوڑ کر) شرک کرتے، تو (یقین کرو) کبھی فلاح و سعادت کی راہ نہ پاتے اور ان کا سارا کیا دھرا ضائع ہو جاتا۔

انہیں کتاب اور حکومت عطا ہوئی تھی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَتَيْنٰهُمْ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النَّبُوَّةَ ؕ فَاِنْ
يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكَافِرِيْنَ ۝ (۷/۸۹)

(ایسے مغیر!) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکومت اور نبوت (کی نعمت عطا فرمائی) پھر اگر یہ (مشرکین عرب) اس نعمت سے انکار کرتے ہیں تو انکار کریں۔ ان کے انکار سے کچھ بگڑنے والا نہیں) ہم نے اس کی پیروی و حفاظت ایک ایسے گروہ کے حوالے کر دی ہے جو (ان لوگوں کی طرح) سچائی سے انکار کرنے والا نہیں (بلکہ اس کا شناسا اور قدر شناس ہے)۔

یہی وہ ضابطہ ہدایت ہے جس کی اقتدار آج بھی ضروری ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ فَبِهٖدْهُمْ اٰمَنُوْا ؕ حٰثِرًا
اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۙ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷/۹۰)

(ایسے مغیر!) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے راہ حق دکھا دی۔ پس انہی کی راہ کی تم بھی پیروی کرو۔ تم کہہ دو "میں اس (راہنمائی) پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام دنیا کے لئے (ایک فراموش کردہ حقیقت کی) یاد دہانی ہے) اور جب صورت یہ ہے تو تم مجھے کتنی ہی تکلیف و اذیت دو، میں اولے فرض سے باز آنے والا نہیں)۔

اب یہ ضابطہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے، اس کے باہر صفحہ ہستی پر اور کہیں نہیں پہلی کتابوں کی اصلی تعلیم بھی اسی کے اندر محفوظ ہے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ
فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلِّ جَعَلْنَا
مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لَيَبْلُوَكُمْ فِي مَا
أَشْكُرْتُمْ فَاسْتَثْبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ
جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵/۴۸)
اب ان تمام کتب سابقہ کے بعد (جب وہ اپنی اصلی حالت پر نہ رہیں
اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آگیا کہ تمام نوع انسان کے
لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات دے دیا جائے جو ہمیشہ تک انکی راہ نمائی
کرے) ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو
اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ ان تمام وعدوں اور دعوؤں کو سچ کر کے
دکھانے والی ہے جو کتب سابقہ میں کئے گئے تھے اور اس اصولی تعلیم
کی جامع اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی
رہی اور جس کا ہمیشہ کے لئے غیر تبدیل رکھنا مقصود ہے۔

یہ ہے اس کتاب عظیم کی پولیش۔ لہذا اب تم لوگوں کے معاملات
کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے
بعد لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو۔

اس مقام پر ممکن ہے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خدا
نے تمام انسانوں کے لئے شروع سے اخیر تک اصولاً ایک ہی ضابطہ حیات

تجویز کیا تھا، تو ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا کہ تمام لوگ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہتے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ انسانوں کو حیوانوں اور پتھروں کی طرح مجبور کر دیتا اور وہ اس کی طرف سے مقرر کردہ روش پر طوقاً و کرہا چلتے رہتے۔ لیکن اس کے قانونِ مشیت کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم تم میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے اختیار کردہ منہاج اور طریقے پر چھوڑ دیتے ہیں اور سب کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ انسان کا اختیار و ارادہ ہی ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ وہ نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں اور اس طرح خود ان کی ذات میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

لیکن انسان کے اختیار و ارادہ کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ غلط راستے پر چلتا رہے گا۔ غلط راستوں پر چلنے کے تباہ کن نتائج جنہیں زلزلے کے تقاضے کہہ کر پکارا جاتا ہے اور وحی خداوندی سے متاثر فضا اسے رفتہ رفتہ بتدریج صحیح راستے کی طرف لئے چلے جائیں گے اور یوں لوگوں کی خود ساختہ مختلف روشیں زندگی کی صحیح شاہراہ میں آکر ملتی جائیں گی۔

یہ طریق کار جسے عقل کا تجرباتی طریق کہتے ہیں بہت طویل طویل ہوتا ہے اور اس طرح انسان کو صحیح راستے تک پہنچنے کے لئے بڑی بڑی جانکاه مصیبتوں اور جگر پاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں میں سے گزرے بغیر بخیر و خوبی منزل مقصود تک پہنچ جائے تو اس کا طریق یہ ہے کہ وہ وحی خداوندی کا اتباع کرے اور اپنے معاملات کے فیصلے اسی کے مطابق کرے۔

یہ ہیں اس شجر طوبیٰ کے برگ و بار جس کی جڑیں پامال ہیں محکم و مضبوط اور شاخیں عرش کے کنگروں کو چھو رہی ہیں۔ نوع انسانی کے وہ مشفق و غم گسار جنہوں نے ساری دنیا کی مصیبتیں اور مشکلیں اپنے سر پر لیں تاکہ دنیا بھر کے مصیبت زدوں کی مصیبتیں اٹھ جائیں، انہوں نے اپنے نالہ نیم شبی اور آہ سحرگاہی سے کائنات کی روح کو تھر تھرا دیا تاکہ جاہل اور ظالم انسان ہلاکتوں اور بربادیوں کے چہرے سے بچ جائے۔ انہوں نے اپنی مضطرب و عاؤں اور بے تابانہ التجاؤں سے رحمت الہی کے سحابِ کرم کو کھینچ کھینچ کر بلایا کہ انسانیت کا حاصلِ نزرع جو روستبداؤ کی بادِ سموم سے جھلس کر نہ رہ جائے۔ انہوں نے سرِ مژگاں چمک جانے والے ستاروں اور مقدس رخساروں پر ڈھلک آنے والی آبشاروں سے انسانی بد بختیوں کے ظلمت ناک دھبوں کو دھو ڈالنے کی کوشش کی لیکن جب سرکش اور متمرد انسانوں نے اپنی روشِ تغلب و استیلا کو کسی طرح نہ چھوڑنا چاہا تو وہ جلالِ آسمانی کی آتشیں شمشیر لے کر آگے بڑھے اور ہر طاغوتی قوت پر برقی خاطف بن کر گرے اور یوں ان کمزور و ناتواں انسانوں کو جنہیں زمانہ اس جرم کی پاداش میں ہدفِ جوہر و ستم بنا رہا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے کیوں جھکے ہیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ دنیا میں انسانی قوانین کی جگہ خدائی نظامِ زندگی نے لے لی جس کے سایہِ عاطفت میں انسانیت بڑھتی، پھولتی، پھلتی اس مقام کی طرف رواں دواں جادہ پیمایا ہوئی جو اس کا منتہی و مقصود تھا۔ خدا کی رحمت ہواں برگزیدہ سالوں پر جنہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ زمین پر اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

مُتَّبِعِينَ رَبِّكَ الْعِزَّةَ عَمَّا يَصِفُونَ ۚ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۚ
وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۱۸۰ — ۱۸۲/۳۷)

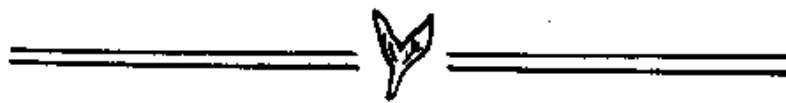
(اے پیغمبرِ اسلام!) تیرا پروردگار پروردگارِ عزت بہت بلند ہے، اُس سے بھی بڑھ کر جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ اور (اس کے) رسولوں پر سلامتی ہو اور ہر قسم کی تعریفیں خدا، ربِّ العالمین ہی کو سزاواں ہیں۔

حضور خاتم النبیین کے بعد (کوئی رسول اور نبی نہیں آسکتا)۔ یہ سلسلہ حکومتِ خداوندی کس طرح آگے

لے "ابلیس و آدم" عنوانِ رسالت میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے رسول اور نبی میں کوئی فرق نہیں اور شریعی (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

چلے گا اور کس طرح قرآن کریم تمام ذرع انسانی کے لئے عملی زندگی بنے گا، اس کی تفصیل ”معراج انسانیت“ میں ملے گی۔

اُمّت آگے بڑھنے سے پہلے ایک ضروری نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ الدین تو شروع سے ایک ہی چلا آتا ہے لیکن انسانوں کی اُمّت اُس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جسے وہ خدا کا آخری رسول مانتے ہیں۔ مثلاً عیسائی یہودیوں کی طرح تمام انبیائے بنی اسرائیل کو بھی مانتے ہیں لیکن وہ یہودیوں سے الگ اور متمیز اُمّت اس لئے قرار پاتے ہیں کہ وہ آخر میں حضرت عیسیٰ پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اس ایمان کی جہت سے ایک الگ اُمّت قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح ایک عیسائی جب نبی اکرمؐ پر ایمان لا کر مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ اُمّتِ نصاریٰ کا فرد نہیں رہتا، اُمّتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ کے بعد ایک اور رسول پر بھی ایمان لے آیا ہے۔ ہم اُمّتِ محمدیہ تمام انبیائے سابقہ کے بعد نبی اکرمؐ پر ایمان کی رو سے قرار پاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اگر کوئی شخص نبی اکرمؐ سمیت تمام انبیائے سابقہ پر بھی ایمان رکھتا ہے لیکن نبی اکرمؐ کے بعد کسی اور کو بھی نبی تسلیم کرتا ہے تو وہ (اوپر بیان کردہ اصول کے مطابق) اُمّتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا، اس نئے نبی کی نسبت سے ایک الگ اُمّت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کو خاتم الانبیاء تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے دینے گئے الدین کی رو سے اُمّتِ محمدیہ خاتم الامم بھی ہے: قرآن خدا کی آخری کتاب، محمدؐ رسول اللہ خدا کے آخری رسول اور اُمّتِ محمدیہ آخری اُمّت۔



(گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ)۔

اور غیر شرعی کی تفریق بھی ذہن انسانی کی خود ساختہ ہے۔ ہر رسول یا نبی خدا کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہی پیغام اس کی کتابِ شریعت ہوتا ہے۔

فَانْفُخْ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ (۳۹)

دکھ مسیحا

(اُحیائے بنی اسرائیل کی آخری کوشش)



اگر ایک قطرہ خون داری، اگر مِشتِ پرے داری
بیسا من باتو آموزم طریق شاہبازی را

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اُمم سابقہ کے احوال و ظروف پر جن کا تذکرہ جوئے نور اور برقی طور میں آچکا ہے، نگاہ ڈالئے ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ جب کسی قوم کی سرکشی و عدوان اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچے تو ان کی آخری ہلاکت اور بربادی سے پیشتر اتمامِ حجت کیا جاتا ہے۔ **لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُخْيِي مَنْ خَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ** ط (۸/۴۲) تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کے ساتھ زندہ رہے اور اس طرح دنیا پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ قوموں کی موت و حیات یونہی اتفاقہ نہیں بلکہ خاص قوانین کے مطابق واقع ہوا کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کی خود فریبی اور خدا فراموشی کی داستان برقی طور میں گزر چکی ہے۔ جس طرح اس شوریدہ بخت قوم نے خدا کی نعمتوں کو ٹھکرایا اور اس کے قوانین کی جگہ انسانی رسوم و ضوابط کو آئین زندگی بنالیا، اس کی مثال ان سے پیشتر بہت کم دکھائی دے گی۔ (ان سے پیشتر اس لئے کہ ان کے بعد مسلمانوں نے تو اس باب میں کمال کر دکھایا ہے)۔ بخت نصر کا طوفان سلب و نہب ایک بہت بڑی تہذیب تھی جس کے بعد یہ کچھ سنبھلے۔ لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ پھر وہی روش اختیار کر لی۔ اب ان کی آخری تباہی کا وقت آچکا تھا۔ (لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس آخری تباہی سے پہلے اتمامِ حجت ضروری تھا۔ اس کے لئے خدا کا ایک عظیم المرتبت رسول، درخشاں دلائل اور تابندہ براہین کے ساتھ ان کی طرف مبعوث ہوا جس کے نفسِ مسیحائی کو یہ قوت

آخری حجت | عطا کی گئی تھی کہ وہ ان کے عروقی مُردہ میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیتا۔ اس اولوالعرا پیغمبر نے اپنی حقیقت کش تعلیم اور مجاہدانہ سعی و عمل سے ”خدا کی بادشاہت“ کے فراموش کردہ تصور کو پھر سے اجاگر کیا۔ لیکن اس قوم نے جس کی شامت اعمالِ خدا کے اٹل عذاب کی شکل میں ان کے سر پر منڈلا رہی تھی، نہ صرف آپ کی زندگی بخششِ تعلیم ہی کی مخالفت کی بلکہ رومی حکام سے سازش کر کے ان کی جان تک کے درپے ہو گئے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی کوئی تدبیر خدا کے عذاب کو ان سے نہ ٹلا سکی۔ چنانچہ اس حادثہ المیہ کے تھوڑے عرصہ بعد (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) یروشلم کی دوسری اور آخری تباہی ظہور میں آئی۔

اس جوشِ مخالفت میں یہودیوں نے قانونِ احترامِ انسانیت کی ہر شق کو توڑا اور خدا کے اس برگزیدہ رسول کی شانِ اقدس کے خلاف ایسے ایسے مکروہ اتہامات ترلٹے جن کے تصور سے روح کا نپ اُٹھے۔ آپ کی پیدائش کو (معاذ اللہ، معاذ اللہ، نقلِ کفر، کفر نباشد) ناجائز تعلقات کا نتیجہ بتایا۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کو عجیب و غریب افسانوں کا مجموعہ بنا کر پیش کیا اور آخر الامر آپ کی (بزرگم خویش) وفات کو (خاکِ بدین) ایک ملعون (مصلوب) کی موت کا نقاب اڑھا دیا۔ اس تفریط کا لازمی ردِ عمل افسراط تھا۔ چنانچہ آپ کے متبعین (عیسائیوں) نے تقابلیں کی ضد میں آپ کو ابن اللہ (خدا بیٹا) قرار دیا۔ اور آگے بڑھے تو آپ کو مقامِ الوہیت تک ہی پہنچا دیا اور واقعہٴ تصلیب کو نوعِ انسانی کے درمیان

افراط و تفریط کا گہوارہ | گناہوں کا کفارہ قرار دے کر شرک اور کفر کے ایک ایک

گوشے کو اپنا بھدا، آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ نزولِ مشرآن کے وقت خدا کا یہ مقرب بندہ اسی افراط و تفریط کے گہوارہ کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ خدا کا پیغام ہونے کی جہت سے مشرآن کا اولین فریضہ تھا کہ اس مقدس رسول کے صحیح مقام سے دنیا کو آشنا کر لے اور مخالفت و معاندت کے گھناؤنے پردوں اور فرطِ عقیدت کے نگاہِ فریبِ نقابوں کو الگ کر کے حقیقت کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مشرآن کریم میں کسی اور رسول کی پیدائش، ذاتی کو الٰفِ حیات اور زندگی کے آخری مراحل

لے یہودی سمجھتے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب دے کر ختم کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ سرے سے غلط ہے۔
تفصیل آئندہ سامنے آئے گی۔

کے متعلق اس شرح و بسط سے تذکرہ نہیں آیا جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حضرت عیسیٰ کی ذات اقدس یہودیوں کے خوشناتقام اور عیسائیوں کے دُفور عقیدت کی افسانوی چادروں میں اسی طرح لپٹی رہتی جس طرح ان کے لٹریچر میں آج تک لپٹے چلی آرہی ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ آپ کی حیات طیبہ کو خود اناجیل میں کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت خود بخود اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ قرآن نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے وہ کس قدر بلند اور خدا کے ایک سچے رسول کے شایان شان ہے۔

اناجیل کی تفصیل | اناجیل اربعہ (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) عیسائیوں کے نزدیک مستند و صحیف مقدس ہیں۔ یہ اناجیل کس طرح وجود پذیر ہوئیں اور ہم تک کس طرح پہنچیں، یہ تفصیل طویل ہے۔ اس کے متعلق میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ دیکھئے جس میں تمام مزعومہ کتب مسادی کی مفصل تاریخ سامنے آگئی ہے۔ سر دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اناجیل کو نہ حضرت عیسیٰ نے خود لکھا اور نہ لکھوایا، بلکہ آپ کے بعد آپ کے شاگردوں (حواریوں) نے از خود روایتا مرتب کیا۔ یعنی یہ کتابیں حضرت عیسیٰ کی زندگی کی تاریخ ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے بھی یہ مجموعے اس قدر ناقابل اعتماد ہیں کہ خود عیسائی مؤرخین و محققین ان کے بیانات پر بھروسہ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اس دعوے کو بھی محل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ اناجیل جن حواریوں کی طرف منسوب ہیں درحقیقت انہی کی تالیف ہیں۔ بایں ہمہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوائف حیات کے متعلق عیسائیوں کے ہاں سب سے معتبر یہی مآخذ ہیں اس لئے ہمیں لامحالہ انہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اناجیل اربعہ کے علاوہ (جن کی طرف ادھر اشارہ کیا گیا ہے) آئندہ اوراق میں کہیں کہیں آپ کو ایک اور انجیل (برناباس) کا بھی حوالہ ملے گا۔ یہ انجیل ان متروک اناجیل میں سے ہے جنہیں عیسائیوں نے ایک عرصہ تک دنیا کے سامنے نہیں آنے دیا کیونکہ اس کا اکثر حصہ دیگر اناجیل سے مختلف اور عیسائیت کے مسلمات کے خلاف ہے۔ اس کا ایطالوی نسخہ وائٹا کے کتب خانہ میں موجود ہے جو شروع بیسویں صدی میں بعض مشفقین کی کوششوں سے دنیا کے سامنے آگیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو گئے۔ (برناباس حضرت مسیح کے ایک حواری تھے)۔

اناجیل کی روئے حضرت عیسیٰ کے مختصر کوائف زندگی حسب ذیل ہیں۔ لوقا کی انجیل میں اس تذکرہ کی ابتدا یوحنا، بپتسمہ دینے والے کی بشارت سے ہوتی ہے جس کے بعد مذکور ہے کہ حضرت زکریا کی بیوی (الیسبہ) کے حمل کے پانچویں مہینے حضرت مریم کو ولادت حضرت مسیح کی بشارت ملی۔ جس کی تفصیل (متی کی انجیل میں) یوں مذکور ہے۔

پیدائش اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ وہ بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام یسوع رکھنا، کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ ۵

”دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل رکھیں گے۔“

(متی ۲۳-۱۸/۱)

لوقا کے بیان کے مطابق آپ کی پیدائش بیت لحم کے شہر میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں ایسا ہوا کہ قیصر اوگوستس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ یہ پہلی اسم نویسی سواریہ کے حاکم کورنیلیس کے عہد میں ہوئی۔ اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے۔ پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرو سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے۔ اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا تاکہ اپنی منگیت مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے۔ جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اُس کے جننے کا وقت آ پہنچا۔ اور وہ پہلوٹا بیٹا جنی اور اس کو کپڑے میں پیٹ کر چرنی میں رکھا کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی۔ ۵ (لوقا ۲-۱)

اسی انجیل میں ذرا آگے چل کر مذکور ہے۔

جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا جو فرشتے نے اس کے پیٹ میں پڑنے سے پہلے رکھا تھا (۲/۲۱)

انجیل متی میں اس کے بعد لکھا ہے کہ جب حضرت مسیح پیدا ہوئے تو پورب کے کچھ مجوسی یہ کہتے ہوئے یروشلم کی طرف آتے کہ "یہودیوں کا جو بادشاہ پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے۔" یہ سنکر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھی گھبرا گئے۔ ہیرودیس نے مجوسیوں سے کہا کہ جب تم اس مولود کو دریافت کرو مجھے اطلاع دینا۔ لیکن وہ ہیرودیس کے پاس واپس نہ لوٹے کیونکہ اس بچے کے متعلق اُس کی نیت میں انہیں شبہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انجیل میں لکھا ہے :-

مصر کی طرف روانگی | جب وہ روانہ ہو گئے تو دیکھو خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اٹھ اچھے اور

اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا اور جب تک میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا کیونکہ ہیرودیس اس بچے کو تلاش کرنے کو ہے تاکہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا تاکہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ مصر میں سے میں نے اپنے بیٹے کو بلایا

(متی ۱۳ — ۲/۱۵)

چنانچہ یوسف اپنی بیوی اور بچے کو لے کر مصر چلا گیا اور اس وقت واپس لوٹا جب بچے کی عمر سات برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن انجیل برناباس میں ہے کہ

جب یسوع عمر کے بارہویں سال تک پہنچا وہ مریم اور یوسف کے ہمراہ یروشلم میں آیا تھا کہ وہاں خدا کی مومنوں کی کتاب میں لکھی ہوئی شریعت کے موافق سجدہ کرے۔ (فصل ۹)

لہٰذا انجیل متی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہیرودیس نے بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے تمام بچوں کو جن کی عمر دو برس یا اس سے کم تھی قتل کرا دیا تھا۔

واپسی | مصر سے واپسی پر یہ کنبہ، گلیل کے علاقہ میں ناصروہ کی بستی میں جابسا (متی ۲۳/۲)۔ لوقا کی انجیل میں ہے کہ:

اس کے ماں باپ ہر برس عیدِ فصح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔ جب وہ ان دنوں کو پورا کر کے لوٹے تو وہ لڑکا ایسے یروشلم میں رہ گیا اور اس کے ماں باپ کو خبر نہ ہوئی مگر یہ سمجھ کر کہ وہ قافلہ میں ہے ایک منزل نکل گئے اور اُسے اپنے رشتہ داروں اور جان پہچانوں میں ڈھونڈنے لگے جب نہ ملا تو اسے ڈھونڈتے ہوئے یروشلم تک واپس گئے اور تین روز پیچھے ایسا ہوا کہ انہوں نے اسے ہیکل میں استادوں کے بیچ میں بیٹھے ان کی سنتے اور اُن سے سوال کرتے ہوئے پایا اور جتنے اس کی سُن رہے تھے اُس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے۔ وہ اُسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اُس سے کہا بیٹا! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔

(لوقا ۴۱ - ۲/۴۸)

تعلیم | انجیل برناباس سے بھی اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد لوقا کی انجیل میں مذکور ہے کہ آپ نے یوحنا سے پتسمہ لیا اور تیس برس کی عمر میں آپ خود تعلیم دینے لگے (۳/۲۳)۔ یہ سلسلہ دو تین برس تک جاری رہا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں یہودی آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس لئے کہ آپ کی تعلیم ان کی اسلاف پرستی کی اندھی تقلید کے خلاف جاتی تھی۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ بے شک یسوع نے بزرگوں کی رسم و رواج کا خاکہ اڑایا ہے۔

تو ان کے دل میں سخت عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ (برناباس فصل ۳۳)

سازش | چنانچہ یہودیوں نے آپ کے خلاف سازش کی اور رومی حکام کو آمادہ کر لیا کہ آپ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ آپ کے بارہ شاگردوں (حواریوں) میں سے ایک (یہودا اسکریوتی) نے مخبری کی اور آپ کو گرفتار کر لیا۔ بہتر ہو کہ تفصیل خود انجیل کی زبان سے سنئے۔

اُس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا کہ

یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر دعا مانگوں اور پطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین و بے قرار ہونے لگا۔ اُس وقت اُس نے اُن سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جا گئے رہو پھر تھوڑا آگے بڑھا اور مُنہ کے بل گر کر یہ دعا مانگی کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے اٹل جائے۔ تاہم جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو وہ پھر شاگردوں کے پاس آکر انہیں سوتے پایا اور پطرس سے کہا کیا تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے جاگو اور دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے پھر دوبارہ جا کر اُس نے یہ دعا مانگی کہ اے میرے باپ! اگر یہ میرے بغیر پتے نہیں اٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو اور آکر انہیں پھر سوتے پایا۔ کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں اور انہیں چھوڑ کر پھر چلا گیا اور وہی بات پھر کہہ کر تیسری بار دعا مانگی تب شاگردوں کے پاس آکر اُن سے کہا آ سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے حوالے کیا جاتا ہے اٹھو چلیں۔ دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آپہنچا ہے وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہود اور ان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اس کے ساتھ ایک بڑی بھیر تلواریں اور لاکھٹیاں لئے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آپہنچی اور اس کو پکڑوانے والے نے یہ بتا دیا تھا کہ جس کا میں بوسوں وہی ہے اسے پکڑ لینا اور فوراً اس نے یسوع کے پاس آکر کہا اے ربی! سلام! اور اس کے بوسے لئے یسوع نے اس سے کہا میاں! جس کام کو آیا ہے وہ کر لے۔ اس پر انہوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا اور اسے پکڑ لیا وہ دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن کے نوکر پر چلا کر اس کا کان اڑا دیا یسوع نے اس سے کہا اپنی تلوار کو میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے آیا تو نہیں سمجھتا کہ میں اپنے باپ سے

سنت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کے بارہ ٹمن سے زیادہ میرے پاس ابھی موجود کر دے گا۔ میرے وہ نوشتے کہ یونہی ہونا ضرور ہے کیونکہ پورے ہوں گے؟ اُسی گھڑی یسوع نے بیڑے سے کہا کیا تم تلواریں اور لاثیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے کہ نبیوں کے نوشتے پورے ہوں۔ اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(متی ۳۶ — ۲۴/۵۶)

تصلیب | اس کے بعد مقدمہ کی تفصیل اور فیصلہ کا ذکر ہے اور پھر آپ کے صلیب دیئے جانے کا واقعہ۔

اُس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک دہننے اور ایک باتیں اور راہ چلنے والے۔ سر بلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے: اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے: اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ یہ تو اسرائیل کا بادشاہ ہے۔ اب صلیب پر سے اتر آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں۔ اس نے خدا پر بھروسہ رکھا ہے۔ اگر وہ اسے چاہتا ہے تو اب اس کو چھڑالے کیونکہ اس نے کہا تھا میں خدا کا بیٹا ہوں۔ اسی طرح ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ صلیب پر چڑھائے گئے تھے، اس پر لعن طعن کرتے تھے۔

اور دو پہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا۔ بارہ اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: ایلہی، ایلہی، لما شبتقنی یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا یہ ایلہا کو پکارتا ہے۔ اور فوراً ان میں سے ایک شخص دوڑا اور اسفنج لے کر سر کہ میں ڈبو دیا اور سر کنڈے پر رکھ کر اسے چھایا۔ مگر باقیوں نے کہا ٹھیک جاؤ۔ دیکھیں تو ایلہا اسے بچانے آتا ہے یا نہیں؟ یسوع پھر بڑی آواز سے چلا اور جان دے دی اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا اور زمین

لرزی اور چٹانیں تڑک گئیں۔

(متی ۲۸ - ۵۱/۲۷)

تدفین اس کے بعد لکھا ہے کہ شام کے وقت سیلاطس (گورنر یروشلم) کی اجازت سے یوسف نامی ایک دولت مند آدمی نے آپ کی لاش کو دفن کر دیا اور ایک بڑا سا پتھر قبے کے سر پر رکھ دیا۔ پھر مذکور ہے۔

اور سبت کے بعد ہفتے کے پہلے دن پو پھٹتے وقت مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر دیکھنے آئیں اور دیکھو ایک بڑا بھونچال آیا کیونکہ خداوند کا فرشتہ آسمان سے اُترا اور پاس آکر پتھر کو لڑھکا دیا اور اس پر بیٹھ گیا اس کی صورت بجلی کی مانند تھی اور اس کی پوشاک برف کی مانند سفید تھی اور اس کے ڈر کے مارے نگہبان کانپ اٹھے اور سڑہ سے ہو گئے فرشتے نے عورتوں سے کہا تم نہ ڈرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو ڈھونڈتی ہو جو مصلوب ہوا تھا وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ اپنے کہنے کے موافق جی اٹھا ہے۔ آؤ یہ جگہ دیکھو جہاں خداوند پڑا تھا اور جلد جا کر اس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور دیکھو وہ تم سے پہلے گلیل کو جاتا ہے وہاں تم اسے دیکھو گے۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا کہ وہ خوف اور بڑی خوشی کے ساتھ قبر سے جلد روانہ ہو کر اس کے شاگردوں کو خبر دینے دوڑیں اور دیکھو یسوع انہیں ملا اور اس نے کہا سلام! انہوں نے پاس آکر اس کے قدم پکڑے اور اسے سجدہ کیا اس پر یسوع نے اُن سے کہا ڈرو نہیں جاؤ میرے بھائیوں کو خبر دو تاکہ گلیل کو چلے جائیں۔ وہاں مجھے دیکھیں گے۔

(متی ۱۰ - ۲۸/۱۰)

ازال بعد۔

اور گیارہ شاگرد گلیل کے اُس پہاڑ پر گئے جو یسوع نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور انہوں نے اسے دیکھ کر سجدہ کیا مگر بعض نے شک کیا کہ یسوع نے پاس آکر اُن سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو اور انہیں یہ تعلیم دو کہ اُن سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا اور دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ

(متی ۱۴۔ ۲۸/۲۰)

تمہارے ساتھ ہوں۔

آسمان پر اٹھایا جانا | متی کی انجیل میں صرف اتنا ہی ہے، لیکن مرقس کی انجیل میں ہے

غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی دہنی طرف بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے نکل کر ہر جگہ منادی کی اور خداوند ان کے ساتھ کلام کرتا رہا اور کلام کو ان معجزوں کے وسیلے سے جو ساتھ ساتھ ہوتے تھے ثابت کرتا رہا۔ آمین

(مرقس ۱۶۔ ۱۹/۲۰)

اسی طرح لوقا کی انجیل میں ہے۔

پھر وہ انہیں بیت عنیاہ کے سامنے تک باہر لے گیا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر انہیں برکت دی وہ جب وہ انہیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اُن سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا اور وہ اس کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے بروشلیم کو لوٹ گئے اور ہر وقت ہیکل میں حاضر ہو کر خدا کی حمد کیا کرتے تھے۔

(لوقا ۵۰۔ ۲۴/۵۳)

انجیل برناباس کا بیان | یہ تو ہے اناجیل اربعہ کی بیان کردہ داستان، لیکن انجیل برناباس میں ان آخری مراحل کے متعلق ایک اور بیان ہے جو ان سے مختلف

ہے۔ اس میں مذکور ہے۔

اور جبکہ سپاہی یہوداہ کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا، یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سنا، تب اسی لئے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا اور گیارہ (شاگرد) سو رہے تھے۔ پس جبکہ اللہ نے اپنے بندہ کو خطرہ میں دیکھا۔ اپنے سفیروں جبرئیل اور میکائیل اور رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو اس دنیا سے لے لیوں تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اس کو اٹھالے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا جو کہ ابد تک اللہ کی تسبیح کرتے رہیں گے۔ (فصل ۲۱۵)

اور یہود اور زور کے ساتھ اس کمرہ میں داخل ہو جس میں سے یسوع اٹھایا گیا تھا۔

اور شاگرد سب کے سب سو رہے تھے۔ تب اللہ نے ایک عجیب کام کیا۔ یسہوداہ بولی اور چپکے میں بدل کر یسوع کے مشابہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اعتقاد کیا کہ وہی یسوع ہے۔ لیکن اس نے ہم کو جگانے کے بعد تلاش کرنا شروع کیا تاکہ دیکھے معلم کہاں ہے اس لئے ہم نے تعجب کیا اور جواب میں کہا اے سید! تو ہی تو ہمارا معلم ہے۔ کیا ثواب ہم کو بھول گیا؟

مگر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ”کیا تم احق ہو کہ یہوداہ اسکرپتی کو نہیں پہچانتے اور اسی اشارہ میں کہ وہ یہ بات کہہ رہا تھا سپاہی داغل ہوئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ یہوداہ پر ڈال دیئے اس لئے کہ وہ ہر ایک وجہ سے یسوع کے مشابہ تھا۔

لیکن ہم لوگوں نے جب یہودی کی بات سنی اور سپاہیوں کا گروہ دیکھا تب ہم دیوانوں کی طرح بھاگ نکلے اور یوحنا جو کہ ایک کتان کے لحاف میں لپٹا ہوا تھا جاگ اٹھا اور بھاگا۔ اور جب ایک سپاہی نے اسے کتان کے لحاف کے ساتھ پکڑ لیا تو وہ کتان کا لحاف چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس لئے کہ اللہ نے یسوع کی دعا سُن لی اور گیارہ (شاگردوں) کو آفت سے بچا دیا۔ (فصل ۲۱۶)

پس سپاہیوں نے یہوداہ کو پکڑا اور اس کو اس سے مذاق کرتے ہوئے باندھ لیا۔ اس لئے کہ یہوداہ نے ان سے اپنے یسوع ہونے کا انکار کیا بحالیکہ وہ سچا تھا۔ تب سپاہیوں نے اسے چھڑ کرتے ہوئے کہا ”اے ہمارے سید! تو ڈر نہیں۔ اس لئے کہ ہم تجھ کو اسرائیل پر بادشاہ بنانے آئے ہیں اور ہم نے تجھ کو محض اس واسطے باندھا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تو بادشاہت کو نامنظور کرتا ہے۔“ یہوداہ نے جواب میں کہا ”شاید کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔ تم تو ہتھیاروں اور چراغوں کو لے کر یسوع ناصری کو پکڑنے آئے ہو گویا کہ وہ چور ہے تو کیا تم بھی کو باندھ لو گے جس نے تمہیں راہ دکھائی ہے تاکہ مجھے بادشاہ بناؤ۔“

اس وقت سپاہیوں کا صبر جاتا رہا اور انہوں نے یہوداہ کو منکوں اور لائقوں سے مار کر ذلیل کرنا شروع کیا اور غصے کے ساتھ اسے یروشلم کی طرف کھینچتے لے چلے

یوحنا اور پطرس نے سپاہیوں کا دُور سے پہنچا کیا اور ان دونوں نے اس لکھنے والے کو یقین دلایا کہ انہوں نے وہ سب مشورہ خود سنا جو کہ یہود اہل کے بارے میں کاہنوں کے سردار اور ان فریسیوں کی مجلس نے کیا کہ یہ لوگ یسوع کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ تب وہیں یہود اہل نے بہت سی دیوانگی کی باتیں کیں۔ یہاں تک کہ ہر ایک آدمی نے تسخیر میں انوکھا پن پیدا کیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ (یہود اہل) حقیقت یسوع ہی ہے اور یہ کہ وہ موت کے ڈر سے بناؤٹی جنوں کا اظہار کر رہا ہے۔ اسی لئے کاہنوں نے اس کی دونوں آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی اور اس سے ٹھٹھا کرتے ہوئے کہا "اے یسوع ناصریوں کے نبی! (اس لئے کہ وہ یسوع پر ایمان لانے والوں کو یہی کہہ کر پکارا کرتے تھے) تو ہمیں بتا کہ تجھ کو کس نے مارا؟" اور اس کے گال پر تھپڑ مارے اور اس کے منہ پر تھوکا۔
(انجیل برناباس فصل ۲۱۷)

اس کے بعد مذکور ہے۔

اور ہر ایک آدمی اپنے گھر کو پلٹ آیا اور یہ جو لکھتا ہے اور یوحنا اور یعقوب اس (یوحنا) کا بھائی یسوع کی ماں کے ساتھ ناصرہ کو گئے۔ رہے وہ شاگرد جو اللہ سے نہیں ڈرے تو وہ رات کے وقت گئے اور یہود اہل کی لاش چڑا کر اسے چھپا دیا اور خبر اڑادی کہ یسوع جی اٹھا ہے۔ تب اس فعل کے سبب سے ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ پس کاہنوں کے سردار نے حکم دیا کہ کوئی آدمی یسوع ناصری کی نسبت کلام نہ کرے ورنہ وہ محسوم کرنے کی سزا کے تحت میں آئے گا۔ اس لئے بڑی سختی ظاہر ہوئی۔ پس بہت سے آدمی سنگسار کئے گئے اور تازیانوں سے مارے گئے اور ملک سے جلا وطن کر دیئے گئے کیونکہ انہوں نے اس بارہ میں خاموشی کو لازم نہیں پکڑا۔

اور ناصرہ میں یہ خبر پہنچی کہ کیونکر یسوع ان کے شہر کا ایک باشندہ جی اٹھا ہے، اس کے بعد کہ وہ صلیب پر مر گیا تھا۔ تب اس نے جو کہ لکھتا ہے یسوع کی ماں سے منت کی کہ وہ براہ کرم رونے سے باز آئے کیونکہ اس کا بیٹا جی اٹھا ہے۔ پس جب کنواری مریم نے اس بات کو سنا وہ رو کر کہنے لگی "تو اب ہمیں یروشلم چلنا چاہیے"

تاکہ میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈوں۔ اس لئے کہ اگر میں اس کو دیکھ لوں گی تو آنکھیں ٹھنڈی کر کے مروں گی۔“ (فصل ۲۱۸)

تب کنواری مع اس لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب کے اسی دن یروشلم میں آئی جس روز کہ کاہنوں کے سردار کا حکم صادر ہوا تھا۔ پھر کنواری نے جو اللہ سے ڈرتی تھی اپنے ساتھ رہنے والوں کو ہدایت کی کہ وہ اس کے بیٹے کو بھلا دیں، باوجود اس کے کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کاہنوں کے سردار کا حکم ظلم ہے اور ہر ایک آدمی کا انفعال (تأثر) کس قدر سخت تھا۔ اور وہ خدا جو کہ انسانوں کے دلوں کو جا بختا ہے کہ بے شبہ ہم لوگ یہوداہ (جس کو کہ ہم اپنا معلم یسوع سمجھتے تھے) کی موت پر رنج و الم اور اس کو جی اٹھتا دیکھنے کے شوق میں محو ہو گئے تھے۔ اور وہ فرشتے جو کہ مریم پر محافظ تھے تیسرے آسمان کی طرف چڑھ گئے جہاں کہ یسوع فرشتوں کی ہمراہی میں تھا اور اس سے سب باتیں بیان کیں۔ لہذا یسوع نے اللہ سے منت کی کہ وہ اس کو اجادت دے کہ یہ اپنی ماں اور شاگردوں کو دیکھ آئے۔ تب اس وقت رحمان نے اپنے چاروں نزدیک فرشتوں کو جو کہ جبرائیل اور میخائیل اور رافائیل اور ادائیل ہیں، حکم دیا کہ یہ یسوع کو اس کی ماں کے گھر اٹھا کر لیجائیں اور یہ کہ متواتر تین دن کی مدت تک وہاں اس کی نگہبانی کریں اور سوائان لوگوں کے جو اس کی تعلیم پر ایمان لائے ہیں اور کسی کو اسے نہ دیکھنے دیں۔ پس یسوع روشنی سے گھرا ہوا اس کمرہ میں آیا جس کے اندر کنواری مریم مع اپنی دونوں بہنوں اور مٹھا اور مریم مگدالینی اور لعزر اور اس کے لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب اور پطرس کے مقیم تھے۔ تب یہ سب خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑے گویا وہ مڑے ہیں۔ پس یسوع نے اپنی ماں کو اور دوسروں کو یہ کہتے ہوئے زمین سے اٹھایا ”تم نہ ڈرو اس لئے کہ میں ہی یسوع ہوں اور نہ روؤ کیونکہ میں زندہ ہوں نہ کہ مردہ۔“ تب اُن میں سے ہر ایک دیر تک یسوع کے آجانے کی وجہ سے دیوانہ سا رہا۔ اس لئے کہ انہوں نے پورا پورا اعتقاد کر لیا تھا کہ یسوع مر گیا ہے۔ (انجیل برناباس فصل ۲۱۹)

اس کے بعد لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے آکر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہوداہ

کی اصلی صورت بدل کر حضرت مسیحؑ کے مشابہ بنادی تھی اور اس طرح آپ کو صلیب سے محفوظ رکھا تھا۔
 ازاں بعد حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اور
 پھر اس کو چاروں فرشتے ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان کی طرف اٹھالے گئے۔
 (فصل ص ۲۲۱)

انخیر میں برناباس نے لکھا ہے۔

اور یسوع کے چلے جانے کے بعد شاگرد، اسرائیل اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پراگندہ
 ہو گئے۔ رہ گیا حق (جو) شیطان کو پسند نہ آیا، اس کو باطل نے دہالیا جیسا کہ یہ ہمیشہ کا
 حال ہے۔ پس تحقیق شیروں کے ایک فخر نے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یسوع کے
 شاگرد ہیں، یہ بشارت دی کہ یسوع مر گیا اور وہ جی نہیں اٹھا۔ اور دوسروں نے یہ تعلیم
 پھیلانی کہ وہ درحقیقت مر گیا تھا مگر پھر جی اٹھا۔ اور اوروں نے منادی کی اور برابر منادی کرتے
 ہیں کہ یسوع ہی اللہ کا بیٹا ہے۔ اور انہی لوگوں کے شمار میں پولس نے بھی دھوکا دیا۔ اب
 رہے ہم تو ہم محض اسی کی منادی کرتے ہیں۔ یہ میں نے ان لوگوں کے لئے لکھا ہے کہ
 وہ اللہ سے ڈرتے ہیں تاکہ انخیرون میں جو اللہ کی عدالت کا دن ہوگا، چھٹکارا پائیں۔ آمین۔
 (انجیل برناباس، فصل ص ۲۲۲)

یہ ہیں اناجیل کی بیان کردہ تفصیل۔ لیکن (جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں) ان بیانات
 کی تاریخی حیثیت محلِ نظر ہے اور خود عیسائی مؤرخین ان کے بیشتر حصوں کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں۔
 چنانچہ اور تو اور، حضرت مسیحؑ کی جائے پیدائش اور سن ولادت جیسی ابتدائی باتوں کے متعلق بھی ابھی
 تک یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا۔ حالانکہ آپ کی بعثت اس زمانہ میں ہوئی جب ان علاقوں میں
 تاریخ نویسی کا عام رواج ہو چکا تھا اور اس عہد کی کتب تاریخ جنوی
رینان کی تحقیق تفصیل تک کو بیان کرتی تھیں۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ رینان
 (RENAN) اپنی کتاب 'حیات مسیح' (THE LIFE OF JESUS) میں ان تمام امور پر تنقید کرتا اور
 اناجیل کے اکثر بیانات کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش ناصرو میں ہوئی (ص ۴۶)

اور بیت لحم میں پیدائش کا قصہ محض افسانہ ہے (ص ۴۷) جسے خاص مقصد کے پیش نظر وضع کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ:

(اُس زمانے میں) عام عقیدہ یہ تھا کہ (آنے والا) مسیح داؤد کی نسل میں سے ہوگا اور اس کی طرح بیت لحم میں پیدا ہوگا۔ (ص ۴۸)

اس کے بعد رینان لکھتا ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ آپ کی پیدائش مروج شماری کے سال ہوئی۔ یہ مروج شماری اس سال کے جس سال میں متی اور لوقا کے بیان کے مطابق (حضرت) مسیح کی پیدائش ہوئی ہے، کم از کم دس سال بعد واقع ہوئی تھی۔ (ص ۴۹)۔ چنانچہ رینان کے بیان کے مطابق ”آپ کی صحیح تاریخ پیدائش متعین نہیں ہو سکتی۔ یہ آگسٹس کے عہد میں مسیح رومی کے قریب ہوئی ہوگی (اس لحاظ سے) سن عیسوی کی ابتدا سے بھی چند سال پہلے۔ حالانکہ تمام مہذب دنیا ہی حساب لگائے بیٹھی ہے کہ سن عیسوی (حضرت) مسیح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے“ (ص ۵۰)۔ یعنی تمام عیسائی دنیا جس سال (ابتداءً) سن عیسوی (کو حضرت مسیح کی پیدائش کا سال قرار دیتی ہے، آپ کی پیدائش اس سے کئی برس بیشتر ہو چکی تھی۔ رینان اس کے بعد لکھتا ہے:-

آپ طبقہ عوام سے متعلق تھے۔ آپ کے والد یوسف اور آپ کی والدہ مریم، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے۔ دستکاری (دن کا پیشہ تھا..... (حضرت) مسیح کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑے آپ ہی تھے۔ مادری زبان آپ کی آرامی تھی۔ یونانی زبان سے آپ واقف نہ تھے آپ کے والد کا انتقال جلد ہی ہو گیا اور اس کے بعد (حضرت) مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ (حضرت) مسیح عام طور پر ”ابن مریم“ کے نام سے مشہور ہوئے یعنی جب آپ کو آپ کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو ”یسوع (بن مریم)“ کہا جاتا تھا..... آپ کی ابتدائی زندگی ناصرہ میں ہی بسر ہوئی لیکن شوہر کی وفات کے بعد آپ کی والدہ

لے خود اناجیل میں حضرت عیسیٰ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے اس کی تفصیل میں بھی اختلاف ہے۔ یعنی ایک انجیل میں کچھ اور ہے اور دوسری میں کچھ اور۔

اپنے کنبہ سمیت قانا کی بستی کی طرف منتقل ہو گئیں جو نامرہ سے دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی..... آپ نے اپنے والد کے اتباع میں تجارتی کا پیشہ اختیار کیا۔
(ص ۲۶ لغایت ص ۷۹)

قرآن کریم کی تصریحات | اب قرآن کریم کی طرف آئیے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نزول قرآن کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی افراط و تفریط انتہائی گوشوں تک پہنچ چکی تھی اور اس طرح کثرت تعبیر سے یہ خواب کچھ ایسا بے طرح پریشان ہو چکا تھا کہ جب عصر حاضر کا مورخ اس زمانے کے لٹریچر پر نگاہ ڈالتا ہے تو مجحوظ رہ جاتا ہے کہ اس "بھول بھلیاں" سے اپنے آپ کو باہر کیسے نکالے! کوائف و سوانح حیات سے قطع نظر، آپ کے متعلق عیسائی اور یہودی ایسے متضاد نظریے لئے بیٹھے تھے کہ اس حقیقت کا باور کرنا مشکل تھا کہ ایک ہی شخصیت کے متعلق تاریخ اس قسم کے متضاد و متباہن نتائج بھی پیش کر سکتی ہے؟ عقائد کے لحاظ سے عیسائی :-

- (۱) حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ مانتے تھے۔
 - (۲) ابن اللہ ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی۔
 - (۳) تثلیث کے آفانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) پر عقیدہ رکھتے تھے۔
 - (۴) آپ کے اور حضرت مریم کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔
 - (۵) آپ کی تصلیب کو نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ تصور کرتے تھے۔
 - (۶) آپ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔
 - (۷) اور آپ کی واپسی کے منتظر بھی تھے۔
- اس کے برعکس، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودی (معاذ اللہ، معاذ اللہ) حضرت مریم صدیق کے خلاف بہتان باندھتے اور چونکہ ان کے یہاں کسی کو صلیب دیا جانا اس کے لعنتی ہونے کے مرادف سمجھا

لے یہودیوں کے ہاں ارتداد کی سزا سنگساری تھی جسے وہ لعنت کی موت قرار دیتے تھے۔ (دیکھئے اجبار ۱۴/۲۴)
(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جاتا تھا، اس لئے وہ آپ کی پیدائش کی طرح آپ کی وفات کو (حاکم بدہن) ایک لعنتی کی موت تصور کرتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے متعلق ان کے خیالات یہ ہوں وہ اسے خدا کا رسول کیسے مان سکتے تھے؟ ان حالات میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ ان خاردار جھاڑیوں میں اُبھے ہوئے دہن مریم اور قبائے مسیحی کو صمیم و سالم نکال کر لے آنا کس قدر مشکل کام تھا۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل ترین فریضہ سے جس معجزانہ انداز سے عہدہ برآ ہوا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے (اور قرآن کی نظیر اس آسمان کے نیچے ہو کوئی سکتی ہے؟)۔

(۱۰۰)

پیدائش حضرت مریم | چونکہ قرآن کریم کے سامنے سب سے پہلے حضرت مریم کی عفت و عصمت کی شہادت پیش کرنا تھا، اس لئے اس نے حضرت عیسیٰ کے تذکارِ جلیلہ سے پہلے حضرت مریم کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے پھر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي
مُحَرَّرًا ۖ فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۖ فَلَمَّا
وَضَعَهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ
بِمَا وَضَعْتُ ۖ وَ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا
مَرْيَمَ ۖ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ
الرَّجِيمِ ۝ (۳۵-۳۴/۳)

اس داستان کا آغاز اس واقعے سے کیا جاتا ہے جب آل عمران کی ایک عورت نے اپنے رب کی سنت مانی کہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے کو، تمام دنیاوی علالت سے آزاد کر کے، تیرے لئے وقف کرتی ہوں (کہ وہ تیرے مقدس گھر ہیکل کی خدمت کرے) اے میرے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ) (استثنا ۱- ۱۳/۹)۔ رومی حکومت کے ماتحت سنگساری کی جگہ صلیب نے لے لی۔ صلیب کی موت کے متعلق بھی ان کا یہی عقیدہ تھا کہ ”جو پچھانسی پا جاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہو جاتا ہے“ (استثنا ۲- ۲۱/۲۲)

پروردگار! تو میری اس نذر کو شرف قبولیت عطا فرما۔ تو سب کچھ سننے والا اور جانتے والا ہے۔ اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس حسن نیت سے یہ منت مانی ہے۔

اس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہوگا جو ہیکل کا راہب بن جائے گا اور اپنی پوری عمر اس کی خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ لیکن اس کے ہاں پیدا ہوئی لڑکی! اس سے اُس کے دل میں خیال گزرا کہ لڑکا پیدا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ لیکن خدا کو خوب معلوم تھا کہ اس کے ہاں جو لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ کن خوبیوں کی مالک تھی اور اس نے آگے چل کر خالقابیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑنے میں کتنے بڑے انقلاب کا موجب بننا تھا۔ لہذا اگر وہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر حال اس کی ماں نے کہا کہ میں اس کا نام مریم رکھتی ہوں اور اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرتی ہوں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے اور جب یہ بعد میں شادی کر لے تو اس کی اولاد کو شیطان مردود کے وساوس سے محفوظ رکھے۔

یہودیوں کے ہاں ایک فرقہ تھا جسے نذریین یا منذورین کہتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو خدا کے لئے نذر کر دیتا تھا یا اس کے اہل خاندان اسے نذر کر دیتے تھے۔ بعض اوقات والدین ایک بچے کو اس کی ولادت سے قبل ہی نذری بنا دیتے تھے اور وہ ساری عمر نذری رہتا تھا۔ نذری کے متعلق سمجھایا جاتا تھا کہ عہد شباب ہی میں اس کا مرتبہ انبیاء کے برابر ہو جاتا ہے۔ ولادت حضرت مسیح کے زمانے میں نذریوں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ _____ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے والدین اسی فرقے سے متعلق تھے۔

یہودیوں کے ہاں خالقابیت کا رواج شروع میں نہیں تھا۔ یہ بعد کی اختراع ہے۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہاں یہ رواج حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا۔ ابتداءً ہیکل کی خانقاہ میں صرف مرد راہب تھے۔ پھر راہبات کا سلسلہ شروع ہوا تو انہیں صرف زمانہ قبل از حیض تک وہاں رہنے کی اجازت تھی۔ پھر اس میں یہ ترمیم ہوئی کہ راہبات کی شادی ہیکل کے پیشواؤں کی جماعت کے اندر ہو سکتی تھی۔ آخر کار یہ راہبات عیسائی (NUNS) کی طرح ساری عمر عجز و کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دی گئیں۔ حالانکہ نذریوں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ساری عمر تہجد کی زندگی

سہ کریں۔

سورۃ آل عمران کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے اس سے متشریح ہوتا ہے کہ جب حضرت مریم کی والدہ نے منت مانی ہے اس وقت راہب کے لئے شادی کا دروازہ کھلا تھا، جیسی تو ان کی والدہ نے دُعا مانگی تھی کہ ”اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطان سے محفوظ رکھا جائے“ لیکن راہبہ اپنی شادی صرف ہیکل کے راہبوں میں سے کسی کے ساتھ کر سکتی تھی۔

حضرت مریمؑ نے اس غیر خداوندی رسم خالقابیت کو توڑا تھا اور یہی ان کا جرم تھا جس کی وجہ سے ہیکل کے پیشوا ان کے خلاف ہو گئے تھے (تفصیل اس کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔
بہر حال، حضرت مریمؑ کو ہیکل کی نذر کر دیا گیا جہاں آپ کی کفالت حضرت زکریا جیسی جلیل القدر اور بزرگ ہستی کے سپرد ہوئی۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَ أَتَمَّتْهَا فَبَآئًا حَسَنًا ۖ وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ فَسَأَلَ يَمْرُؤُا اٰتٰى لَكَ هٰذَا ۙ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اَمَلَهُ يَزِدُّكَ مِنْ يَّشَاءُ ۖ فَبَدَّلَ كَسْبًا ۝ (۳۶/۳)

سو اس کے رب نے اس کی منت کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور مریم کی پرورش کا نہایت عمدہ انتظام کر دیا، یعنی اُسے زکریا (جیسے نیک انسان) کی کفالت میں دیدیا۔ مریم اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر اس درجہ مرجع امام بن گئی کہ اس کے پاس نذر و نسیا کی چیزیں آلی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب کبھی زکریا عبادت گاہ (قربان گاہ) میں آتا تو مریم کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتا۔ وہ (بر بنائے احتیاط) اس سے پوچھتا کہ اے مریم! تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں۔ (کیونکہ اس کی کفالت تو زکریا کے ذمے تھی)۔ وہ اس کے جواب میں کہہ دیتیں کہ (انہیں یہ چیزیں ہیکل کا کوئی آدمی نہیں دیتا بلکہ یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں) (یعنی جو لوگ اللہ کی نذریں مانتے ہیں وہ دے جاتے ہیں)۔ اللہ اپنی مشیت کے پیالوں کے مطابق اس طرح رزق کا سامان مہیا کر دیتا ہے جو عام طوع پر لوگوں کے خیال میں نہیں ہوتا (مریمؑ کا مقبولِ غلاق ہو جانا اس کا ذریعہ بنا)۔

اس آیت میں دو تین باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس نذر (یعنی حضرت مریمؑ) کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ دوسرے یہ کہ آپ کی پرورش و تربیت نہایت عمدگی سے ہوئی۔ تیسرے یہ کہ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت زہد و انزوا کی طرف مائل تھی جس کی وجہ سے آپ محراب ہیکل کی زندگی (قربان گاہ) کے قریب معتکف رہتیں اور آپ کے خورد و نوش کا عمدہ توین سامان وہیں پہنچ جاتا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق دریافت کرنے پر حضرت مریمؑ نے فرمایا کہ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (یہ منجانب اللہ ہیں) ضروری نہیں کہ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے مراد یہ ہو کہ یہ اشیاء ذریعہ اور واسطہ کے بغیر براہ راست خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ بلکہ (جیسا کہ برقی طور میں حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ جلیلہ کے آخر میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے)، ذرائع و وسائل سے حاصل شدہ اشیاء کے متعلق بھی اللہ کے بندہ سچی کہا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے زہد و تورع کی شہرت عام ہو گئی تھی۔ اس لئے لوگ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بطور نذر و منت از خود لئے چلے آتے تھے جیسا کہ آج بھی خانقاہوں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ ہیکل کی راہبانہ زندگی اس قسم کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جب حضرت مریمؑ ہیکل میں آئیں تو اس وقت حضرت زکریاؑ نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور اس پر ہیکل کے متولیوں میں کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ بڑھ کر جوان ہوئیں تو اس وقت ان کی کفالت کے اور دعویٰ دار بھی پیدا ہو گئے اور اس منازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا گیا۔

چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ (۳/۴۳)

(اے رسول!) تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ مریم کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اور نہ ہی تو اس وقت ان کے پاس تھا جب وہ اس کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔

۱۔ حضرت مریمؑ کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات مروجہ اناجیل اربعہ میں نہیں ہیں لیکن متروک اناجیل میں یہ حالات بہ صراحت ملتے ہیں۔ بالخصوص ایک انجیل اولادیت مریم (تو مشتمل ہی انہی حالات پر ہے۔

فُتْدَانِ کریم نے صرف اتنی بات کہہ کر کہ ”پجاری ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے“ ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہیکل کے قانون کے مطابق، راہبہ صرف ہیکل کے راہبوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کر سکتی تھی۔ جب تک حضرت مریم بچی تھیں وہ حضرت زکریا کی کفالت میں رہیں لیکن جب وہ جوان ہوئیں تو (جیسا کہ عام طور پر خاتقا ہوں میں ہوتا ہے) راہبوں کی دلچسپی ہوئی نظریں ان کی طرف اٹھنی شروع ہوئیں۔ حضرت مریم ان راہبوں کی اندرونی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھیں۔ وہ بڑی پاک پازتھیں اور پاک باز رہنا چاہتی تھیں۔ اس لئے وہ ہیکل کی زندگی سے بیزار ہو گئیں۔ وہ وہاں سے نکل کر عام (پاکباز) انسانوں جیسی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے اس ارادے کے راستے میں وہ درسم خاتقا بیت کی (انسانوں کی خود ساختہ) شریعت حائل تھی۔ اس سے وہ دن رات ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہنے لگیں۔ آپ سوچئے کہ ایک راہبہ کے لئے یہ کشمکش کس قدر جانگسل اور درسم خاتقا بیت کے خلاف فیصلہ کرنا کس قدر ہمت طلب تھا۔ اس وقت انہیں توفیق ایزدی کی بڑی ضرورت تھی جو انہیں اس قسم کے انقلابی اقدام کے لئے آمادہ کر دیتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ان کے دل میں خدا کی طرف سے یہ اطمینان پیدا کروایا گیا کہ وہ گھبراتے نہیں۔ ایسے سامان پیدا کر دیئے جائیں گے کہ وہ ہیکل کی ہوس آلود فضا سے نکل کر اپنی منشا کے مطابق، گھر کی پاک اور صاف زندگی بسر کرے اور اس طرح (درسم خاتقا بیت کے خلاف جہاد کر کے) اپنے دور کی تمام عورتوں سے ممتاز ہو جائے (۴۲ — ۳/۴۳)۔ حضرت مریم کو ملائکہ کی وساطت سے یہ اطمینان اسی طرح دلایا گیا جس طرح تمام مومنین کو ملائکہ کے ذریعے بشارتیں ملتی ہیں (دیکھئے ۳۰/۴۱) اور اس طرح ان کے سکونِ قلب کا سامان پیدا کروایا جاتا ہے (۸/۱۲؛ ۹/۲۶)۔

بشارتِ حضرت عیسیٰ | انہی بشارتوں میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا بھی ذکر تھا۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يَبَشِّرُ

بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ قَالَتْ اَنۡتُمۡ جُنۡهُدٍ ۙ اِنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۝۱۰

وَالْاٰخِرَةُ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيۡنَ ۝۱۱ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَ

كَهَلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۱۲ (۳/۴۵ — ۴۴)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریمؑ سے کہا تھا کہ خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیحؑ (اور عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ دنیا میں صلیب و جاہلیت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

تندرست و توانا۔ چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا) (۱۱/۵) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاک باز انسان۔ (اس سے ان توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ خالقِ ہیت کی شریعت کے علی الرغم، متاثر زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ یا اس کا بچہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ بچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ضروری تھا)۔

کلمہ کی تشریح عنوان زیرِ نظر کے اخیر میں ملے گی اور چھوٹی عمر میں باتیں کرنے کی تصریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بشارت میں ہی حضرت عیسیٰؑ کو دنیا اور آخرت میں آبرو مند، خدا کا مقرب اور صالح انسان قرار دیا ہے۔ اس بشارت پر حضرت مریمؑ نے عرض کیا۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ ۚ قَالَ كَذَٰلِكَ قَالَهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۳/۴۶)

اس پر مریمؑ نے (ذکر یا کی طرح ۳/۳۹) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ اس کے جواب میں اُس سکوہی کچھ کہا گیا جو زکریاؑ سے کہا تھا (۳/۳۹) کہ یہ خدا کے اُس قانونِ مشیت کے مطابق ہوگا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے۔ وہ قانون جو اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی اس اسکیم کا آغاز ہو جاتا ہے (۲/۱۱۷)۔

یہی الفاظ انجیل برنابا میں آئے ہیں۔

اس کنواری نے جواب دیا، اور میں بیٹا کیونکر پیدا کروں گی بجا لیکہ میں کسی مرد کو جناتی تک نہیں۔ (فصل اول)

قرآن کریم میں سورہ مریم میں 'یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جہاں فرمایا۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذْ اُنْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۚ فَارْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ
لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ (۱۶ — ۱۹/۱۹)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں، لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر اور سلسلہ کلام کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ خالقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر (اپنے گاؤں، ناصرہ میں) چلی گئی تھی جو وہاں سے مشرق کی سمت واقع تھا۔

(خالقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لئے اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق) تقویت بخش اشارہ کیا جو (اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت مریم ہیکل کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن ناصرہ میں تشریف لے جا چکی تھیں جو یروشلم سے شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ لوقا کی انجیل میں ہے۔

چھٹے بیسے جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ (لوقا ۲۸ — ۱۱/۲۹)

آیت (۱۹/۱۶) میں فَتَمَثَّلَ لَهَا آیا ہے۔ عربی لغت 'متمثلی الادب' میں اس کے ایک معنی 'داستان زدن' بھی بیان ہوئے ہیں یعنی کیفیت بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس پیغام رساں نے مریم سے اس کے ہاں ہونے والے تندرست و توانا بچے کی کیفیت بیان کی۔

دوسرے مقام پر اس آنے والے کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ صلیک تھا (۳/۴۴) اور ملائکہ کسی کو نظر نہیں آیا کرتے (۹/۲۶)، اگرچہ ان کا نزول مومنین پر بھی ہوتا ہے (۴۱/۳۰)۔ اس لئے اگر وہ پیغام رساں "فرشتہ" تھا تو وہ حضرت مریم کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ لہذا، یہ واقعہ خواب کا ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ نظر آیا تھا تو وہ کوئی انساں پیغام رساں ہو سکتا ہے۔ خود لفظ صلیک کے معنی پیغام رساں بھی ہیں۔ بہر حال اب

ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اِنِّي اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ (۱۹/۱۸)
مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ بولی، ”اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے
خدا سے رحمان کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں۔

اس نے والے نے جواب دیا۔

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ رَّبِّكَ قَدْ اِيْتٰكَ الْكِتٰبُ وَالْحَبْلُ مُتَمٰثِلًا ۝ (۱۹/۱۹)
اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تیرے پروردگار کی طرف سے ایک پیغام
لے کر آیا ہوں (۱۳/۴۲) اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کرے گا۔

اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اَنۡتِ اِنۡتِ يَكُوْنُ لِيْ غُلَمٌ وَّ لَمْ يَمَسِّنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ
بَغِيًّا ۝ (۱۹/۲۰)

اس پر مریمؑ نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تک میں بیگل میں رہی، پاک بازاراہبہ کی
زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں۔ وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے
شادی نہیں کی کیونکہ یہ چیز ضابطہ خالقائیت کے خلاف ہے (۱۳/۴۶؛ ۱۹/۲۸)۔

اور اللہ کے فرستادہ نے جواب دیا۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلٰی هٰذَا ۚ وَ لَجَعَلَكَاۤ اٰیَةً
لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضٰیًّا ۝ (۱۹/۲۱)

اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانون تخلیق کے مطابق ہی ہوگا (۱۳/۴۶)۔ یہ اس
کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو مواعیات تیرے ذہن میں ہیں اور تمہیں اس طرح
پریشان کر رہے ہیں) انہیں دور کر دے (۱۹/۹)۔ خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کچھ عام بچوں
جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لئے، موجب رحمت اور حق و باطل کے
پرکھنے کی نشانی ہوگی۔ (جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا، وہ حق پر سمجھا جائے گا۔
جو اس سے انکار کرے گا، وہ باطل پر ہوگا) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ کچھ ہمارا پیغمبر

بنے گا (۳/۴۷)۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

پیدائش حضرت عیسیٰ

فَلَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتَنِي مِتُّ
قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَنْسِيًّا ۝ (۲۲ — ۱۹/۲۳)

(چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہوتے گئے۔ ادھر مریم کے دل سے خاتقا بیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دور ہو گیا۔ ادھر ایک شخص 'ہیکل' کے اجبار و رہبان کی تہذیب و توفیق کے باوجود، مریم کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو گیا)۔ مریم کو ہونے والے بچے کا حمل قرار پا گیا۔ اس پر ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گاؤں سے کہیں دور چلے جائیں تاکہ بچے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو اور یوں وہ 'اجبار و رہبان' کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ رہیں)۔

وضع حمل کا وقت آیا تو دروازہ کا اضطراب، مریم کو ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ آئین خاتقا بیت کے خلاف متبادل زندگی، پہلے بچے کی ولادت، پردیس کا معاملہ، بے سوسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت تک بھی نہیں۔ مریم گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل بھولی بھری ہو چکی ہوتی!

غور کیجئے۔ قرآن نے "يَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَنْسِيًّا" کے ایک مختصر سے ٹکڑے میں جذبات و احساسات کی ایک پوری دنیا کے نسیات کو کس نادرہ کاری سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے بھرت مریم کی اس قلبی کاوش کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا۔

فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا خَظْنِي فَمَا جَعَلَ رَبُّكَ تَحْتَكِ مَرْيَمَ ۝ (۱۹/۲۴)

(اس کرب و یاس کے عالم میں اُسے، اس مقام کے انشیب کی طرف سے آواز آئی کہ اے مریم! گھبراؤ نہیں۔ اس طرف ایک (خوشگوار) پانی کی ندی ہے (اور اوپر کھجور کے درخت میں بنی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں)۔

اور طبعی کرب و اضطراب کے لئے۔

وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسْقِطُ عَلَيْهِ رُطْبًا جَنِيًّا ۝ (۱۹/۲۵)
تو کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر
گرنے لگیں گے۔

ان حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ کی پیدائش ظہور میں آئی۔ حضرت مریم سے کہا گیا کہ
فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرِينِ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا
فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ
إِنْسِيًّا ۚ (۱۹/۲۶)۔

تو ان تازہ کھجوروں کو کھا۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پی۔ (پھر بچے کے نظارے سے اپنی آنکھیں
ٹھنڈی کر۔) باقی رہا تیرا یہ اضطراب کہ لوگوں کی باتوں کا کیا جواب دوں گی، تو تم منت کا
روزہ رکھ لینا، اور اگر کوئی آدمی تجھ سے کچھ پوچھے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے خدا کے
رحمان کے لئے اپنے اوپر روزہ واجب کر رکھا ہے اس لئے میں آج کسی شخص سے بات چیت
نہیں کر سکتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس بخشش و عنایت کے لئے بطور شکر و امتنان روزہ رکھیں (جیسا کہ حضرت زکریا کے تذکرہ
میں لکھا جا چکا ہے، یہودیوں کے ہاں روزہ کی حالت میں بات چیت نہیں کی جاتی تھی)۔
حضرت عیسیٰ کی ولادت کا تفصیلی ذکر انہی مقامات پر آیا ہے۔ باقی جگہ اس کا محض ضمنی تذکرہ ہے۔ لیکن
اس ضمنی تذکرہ میں بھی اس اصلی غایت کو سامنے لایا گیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، یعنی حضرت
مریم کی عفت و ناموس کی شہادت۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا
وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ (۲۱/۹۱)

اور ان کے ساتھ ہی اس عفت و آب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے (یہودیوں کی
خود ساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰ جیسا بیٹا عطا کیا اور جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی
توانائی کا شمع ڈال کر اسے صاحب اختیار و ارادہ انسان بنا دیا جاتا ہے اسے بھی ایسا ہی بنایا۔

(۳۲/۹ : ۱۹/۱۷ : ۳/۲۴) وہ دونوں اقوامِ عالم کے لئے اس بات کی نشانی تھے کہ احکامِ خداوندی اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ یہودیوں کی خود ساختہ شریعت نے انہیں — معاذ اللہ — مردود و ملعون قرار دیا اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھہرایا۔

یہی الفاظ سورۃ تحریم میں بھی آئے ہیں (دیکھئے ۱۲/۱۶۲)۔ سورۃ نسا میں خود حضرت عیسیٰ کو ”رُوحٌ مِّنْهُ“ اللہ کی طرف سے روح، کہہ کر پکارا گیا ہے (۲/۱۷۱)۔ روح کے متعلق ابلیس و آدم (عنوانِ طاغوت) میں بحث ہو چکی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ روح اللہ کا امر (حکم) ہے یا اس کی طرف سے وحی۔ اس لئے ان مقامات میں ”روح پھونکنے“ سے مراد یہ نہیں کہ سچ بچ کوئی شے پھونک دی گئی تھی، بلکہ یہ خدا کا امر (حکم) تھا جو مشیت کے مطابق ظہور میں آگیا۔ (اس سلسلہ میں آیات ۱۹/۲۱ : ۲۱/۹۱ : ۵۰/۲۳ بھی دیکھئے)۔ یہ چیزیں اس وقت محض ضمناً سامنے آگئی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق تفصیلی بحث آگے چل کر ملے گی۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ قرآن کریم نے حضرت مریم کی عفت و عصمت کی شہادات اس تکرار و اصرار کے ساتھ پیش کئے کہ انہیں یہودیوں کی تہمت تراشیوں سے بلند ثابت کیا ہے۔

اس مقام پر ضمناً اس کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق سن عیسوی حضرت عیسیٰ کے سالِ پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اب تحقیقات نے یہ بتایا ہے کہ جو سال حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا تصور کیا جاتا ہے، آپ کی پیدائش اس سے چھ سات یا (کم از کم) چار برس پہلے ہو چکی تھی۔ یہ بات محض ضمناً بیان کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر نہیں آیا، نہ ہی قرآن ایسی تفصیل بیان کیا کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد وقائع نگاری نہیں، اہم حقائق کو سامنے لانا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی پیدائش دسمبر کے مہینے میں ہوئی تھی۔ لیکن اب تحقیق کا رخ اس طرف ہے کہ یہ نظریہ بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ آپ کی پیدائش سردی کے موسم میں نہیں ہوئی تھی۔ قرآن کریم کے بیان کے مطابق آپ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے تھے (جنہیں حضرت مریم نے ہلا کر کھجوریں کھائی تھیں)۔ یہ زمانہ سخت سردی کا نہیں ہوتا۔

مصر کی طرف روانگی | ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ اناجیل کے بیان کی رو سے یوسف مصر کی طرف روانگی اور بچے کو لے کر مصر کی طرف چلا گیا تھا جہاں یہ کنبہ سات سال تک رہا۔ جب یہ لوگ وطن واپس آئے تو ہر سال 'بڑے تیوہار کی تقریب پر یروشلم آیا کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو انہوں نے ہیکل کے راہبوں سے وعظ و نصیحت اور بحث و تذکیر شروع کر دی۔ جیسا کہ ظاہر ہے 'تہ آن کریم ایک تاریخی کتاب کی طرح تمام واقعات کو مسلسل بیان نہیں کرتا بلکہ وہ داستان کی انہی کڑیوں کو لیتا ہے جن سے استنباط نتائج مقصود ہو اور ان میں سے بھی بعض کی طرف محض اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اولین مخاطب (عرب) ان واقعات کی تفصیل و جزئیات سے واقف تھے 'تفصیل ابلیس و آدم میں رسالت کے عنوان میں گذر چکی ہے، چنانچہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کے نقل مکانی کے متعلق بھی صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ أُمَّةً آيَةً وَ أَوْصَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَ مَعِينٍ ۝ (۲۲/۵۰)

اور (اسی طرح) ابن مریم (یعنی مسیح) اور اس کی ماں کو (اپنی سچائی کی) ایک بڑی نشانی بنایا اور انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھا۔

قیاس یہ ہے کہ اس سے مراد نیل کا وہ بالائی حصہ ہے، جہاں حضرت عیسیٰ کا بچپن گذرا۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا) ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قانا کا وہ علاقہ ہو جہاں ریتان کے بیان کے مطابق یہ کنبہ منتقل ہو کر گیا تھا۔ اگر یہ کنبہ مصر کی طرف گیا تھا تو وہاں سے مراجعت وطن کے زمانہ میں آپ کی عمر (اناجیل کے بیان کے مطابق) سات برس کی تھی یا زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہیکل کے اجبار و رہبان کی پُر فریب زندگی اور ان کی وضعی رسومات کے خلاف آپ کی صدائے احتجاج اُس صلاحیت کی بنا پر تھی جو آپ کو چھوٹی عمر ہی میں حاصل تھی۔ لیکن گمان غالب یہی ہے کہ آپ نے یہ سلسلہ رشد و ہدایت اور وعظ و تذکیر شرف نبوت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد ہی شروع کیا تھا

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نقل مکان واقعہ صلیب کے بعد کی ہو (اس کے متعلق تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا)۔

(جوانا جیل کی رُو سے قریب تیس برس کی عمر کا زمانہ ہے)۔ رینان کا بیان ہے کہ آپ نے پہلے گلیل کے صومعوں میں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور اگرچہ یروشلم میں آپ قریب ہر سال آتے تھے لیکن یہاں اس میں سب سے پہلا اہم واقعہ ہوا جب ہیکل کے اجارور یہاں سے آپ کا تصادم ہوا (رینان صفحہ ۱۵۸-۱۱۹)۔ قرآن کریم میں البتہ ایک اور واقعہ کا ذکر آیا ہے (جوانا جیل میں مذکور نہیں اور) جسے اس نے تحکم فی اٹلہد (گہوارہ میں گفتگو) کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ کب اور کیسے ہوا، اس کے متعلق پیدائش حضرت عیسیٰ کے ضمن میں ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا۔

تیس برس تک کی زندگی | حضرت عیسیٰ کی بارہ برس سے تیس برس تک کی زندگی کے کوائف و احوال متعلق بانا جیل خاموش ہیں۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اکتیس برس کی تھی جب آپ شرف نبوت سے سرفراز ہوئے۔ ”جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو قریباً تیس برس کا تھا“ (لوقا ۳/۲۳)۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تیس برس لکھا ہے۔ یہ اتنا لمبا عرصہ اس قدر خاموشی اور گمنامی میں کس طرح گزرا، اس کے سمجھنے کے لئے اس زمانے کی ایک عظیم الشان تحریک انوث پر (جو فرقہ ایسینی (E S S E N E S) سے متعلق تھی) نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ یہ علمائے فطرت کا ایک عجیب و غریب فرقہ تھا جس کے احوال و ظروف عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے جاتے تھے

لے یہ تفاوت تو خیر کچھ ایسا نہیں۔ حضرت عیسیٰ کی سیرت مقدسہ کی دیگر تفصیل کے متعلق عیسائی لٹریچر میں ایسے الٹے متضاد و متخالف بیانات موجود ہیں کہ پڑھنے والا محو حیرت رہ جاتا ہے کہ ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟“ مغربی محققین ہاں ہمہ ادعائے تحقیق و کاوش ابھی تک حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا زمانہ بھی صحیح طور پر متعین نہیں کر سکے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ”کرسس“ کا عنوان دیکھئے۔ آپ ایسا محسوس کریں گے گویا کسی طلسم کد حیرت میں جا نکلے ہیں جہاں پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہر حال انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ کی عمر تیس برس کی تھی جب آپ نے پبلک لائف اختیار کی اور اس کے قریب اٹھارہ ماہ بعد واقعہ تصلیب ظہور میں آگیا۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی کل مدت نبوت قریب ڈیڑھ سال تھی اور بعض بیانات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین برس۔

لیکن جس کی شاخیں اس زمانہ کی قریب قریب تمام مہذب دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس فرقہ کا تفصیلی تعارف تو میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں دیکھئے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس کی رکنیت بڑی بڑی سخت ریاضتوں، زہرہ گداز مجاہدوں اور جانکاه آزمائشوں کے بعد نصیب ہوتی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا نصب العین اور تزکیہ نفس ان کا مطمح نگاہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے رکن جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے، ضبط نفس کے لئے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ علم الاشیاء کے مختلف شعبوں میں تحقیق و کاوش کرتے اور جڑی بوٹیوں اور دیگر نباتات و معدنیات کے خواص دریافت کرتے تحصیلِ علومِ فطرت میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتے اور بلا مزہ و معاوضہ بیماروں کا علاج کرتے اور محنت جوں کی اسداد کو پہنچتے۔ لیکن یہ پہاڑوں کے غاروں میں ہوتے یا جنگلوں میں، صحراؤں میں پھرتے یا بستیوں میں، سب ایک نظام سے وابستہ ایک مرکز سے ملحق رہتے۔ جاننے والے ان کے کیریئر کی پختگی، سیرت کی بلندی، زہد و عبادت، علم و عمل اور خدمتِ خلق کے بے پناہ جذبے کی قدر کرتے لیکن متغلب اور مستبد قوتیں ان کے عظیم الشان نظام سے خائف بھی رہتیں۔ فلسطین اور مصر اس فرقہ کے مراکزِ خصوصی تھے۔ اس فرقہ کے متعلق تاریخی قیاس آرائیاں شروع سے ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ لیکن حال ہی میں فلسطین کے علاقہ قرآن کے غاروں سے جو پرانی دستاویزات (SCROLLS) برآمد ہوئی ہیں، انہوں نے ان حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ دینی احکام کے معاملہ میں بڑا متشدد تھا اور مسیح موعود کے ظہور کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا تھا۔ یہ دیگر اسرائیلی فرقوں کے مقابلہ میں زیادہ پاک باطن تھا۔ یہ لوگ زندگی میں صرف ایک بار قسم کھاتے تھے جس میں وہ یہ عہد کرتے تھے کہ وہ دیانت و امانت کو شعار بنائیں گے اور جماعت کے رازوں کو سرِ بستہ رکھیں گے۔ اس کے بعد قسم اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مادہ (MATTER) تمام برائیوں کا سرچشمہ تھا اور اس سے لذت اندوز ہونا گناہ تھا۔ ان میں باہمی اخوت اور بھائی چارہ کا رشتہ تھا۔ یہ

لے ازمنہ قدیمہ میں آپ بالعموم دیکھیں گے کہ اس قسم کی زہد و پارمائی کی زندگی بسر کرنے والے لوگ خواہ لادو کے بڑے ماہر اور چٹکوں سے علاج کرنے میں بڑے حاذق ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں یوگی اور سنیا سی آج بھی اس قسم کے صحراوند اور دشت پیمائارک الدنیا فرقوں کی یاد دلاتے ہیں اور غالباً انہی کے پسماندہ ہیں۔

سفر میں کبھی اکیسے نہیں نکلتے تھے۔ دودو کر کے ہمراہ نکلتے تھے۔ ان کے مذہب میں ایک آدمی کے لئے ایک وقت میں، دو کپڑے یا دو جوتے رکھنا یا مال و دولت جمع کرنا جائز نہیں تھا۔ ازدواجی رشتہ بھی صرف ان کے لئے جائز تھا جبہیں اس کی اجازت دی جاتی تھی۔ ان میں سے جو لوگ زہد و ریاضت کی آخری منزل میں پہنچ جاتے تھے انہیں ”واصلین“ کہا جاتا تھا۔ انہیں نیلے رنگ کا ایک خرقہ، ایک رشتی اور ایک کپڑا عطا ہوتی تھی یہی الکاتام ساز و سامان حیات ہوتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ”ایسینی“ کا شتق لفظ ”آسی“ ہے جس کے معنی طبیعت کے ہیں۔

قرآن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ جب (زمانہ قبل از نبوت میں) تلاش حقیقت میں مصروف تگ و تاز تھے، تو انہوں نے اس فتنہ کی طرف بھی اپنا رخ کیا تھا۔ اس قیاس کی تائید ایک ایسے کتبہ سے بھی ہوتی ہے جو مصر کے محکمہ آثار قدیمہ کو ایسینی فرقہ کے ایک قدیمی مسکن سے ملا اور جو جسمانی کی ایک علمی جماعت کے قبضہ میں ہے۔ ہم (ابلیس و آدم) وحی کے عنوان میں بالتفصیل دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کسی قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی محتاج نہیں ہوتی، نہ وہ اس قسم کے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جسے مشیت کی طرف سے منصب نبوت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، اس کی شرح ہی سے کیفیت یہ ہوتی کہ وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اس کے لئے وہ عالم نفس و آفاق کے ایک ایک گوشے میں پھرنکلتا اور اس کی یہ خلش و کاوش کہیں

ایک خصوصیت کبریٰ | بھی تسار پذیر نہ ہوتی حتیٰ کہ وحی کی تجلیات ربانی حقیقت کو بے نقاب سامنے لے آتیں۔ قبل از نبوت، تلاش حقیقت میں اس کی سیما بیت کی کیفیت یہ ہوتی کہ

دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے	چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام درسا زد
تپداں زماں دلِ من پئے خوب تنہ نگارے	چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
سر من سرِ ندارم کہ بمیرم از قرارے	ز سرِ ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
بہ نگاہِ ناشیکے بہ دلِ امید دارے	طلسم نہایت آں کہ نہایتے ندارد

۱۔ بحوالہ عباس محمود العقاد مصری کی کتاب ”حیات مسیح“۔

۲۔ بحوالہ تذکرہ (عنایت اللہ خاں المشرقی) اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس (ہیٹنگلز)

یہ ہوتی تھی کیفیت اس متجسس حقیقت، قلبِ بے قرار کی جس میں نقاب کشائی حقائق کی تڑپ ہر آن قیامت خیز طوفان برپا رکھتی لیکن جس کی نگاہ کو کوئی سراب آساؤ خشنہ گی فریب نہ دے سکتی۔ اس لئے کہ وہ (ہنوز) حقیقت کو بے نقاب نہ دیکھ سکے کے باوجود کسی ”من دون حقیقت“ مقام سے مطمئن نہ ہوتا۔ لہذا منزل سے ورے اس کا قدم رگ ہی نہ سکتا۔

تلاش حقیقت کی یہی غلش و کاوش اور تب و تاب تھی جو حضرت مسیحؑ کو (غالباً) ان وادیوں میں کھینچ کر لے گئی جہاں (اُس زمانہ کے فی الجملہ) بہترین افراد، بقدرِ ظرف مصروفِ تجسس تھے۔ تا آنکہ وحیِ خداوندی نے آپؑ کا ہاتھ پکڑ کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں کوئی انسان اپنی سعی و عمل اور کسب و مہنت سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تھی وہ منزل جسے لوگ انے ”خود تعلیم دینے کا مقام“ اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے ”پبلک لائف“ کا آغاز قرار دیا ہے۔ سچ ہے۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ دوست

رسالت | یہ تو صرف قرآنِ کریم سے جو ان مقامات کا صحیح تعارف کرا سکتا ہے کیونکہ مقامِ نبوت و رسالت کی صحیح فہم اور کیفیت سے وہی ذات واقف ہو سکتی ہے جس سے یہ شرف و مجہ عنایت ہوتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَرَسُولُهُ إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ ۚ (۲۸-۳۴) نیز (۵۴/۲۶-۵۶/۲۶)

اور (اے مریم!) اللہ اُس (ہونے والے لڑکے) کو کتاب اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا، نیز تورات اور انجیل کا اور اُسے بنی اسرائیل کی طرف بہ حیثیت رسول بھیجا جائے گا۔

﴿۵۴﴾

یوحنا سے تعارف | ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مصر میں ایسینی فرقے سے متمسک ہوئے لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) رینان کا خیال ہے کہ آپؑ مصر کی جانب تشریف نہیں لے گئے بلکہ ناصرہ سے وصال کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ اس لئے آپؑ کا ایسینی فرقے سے متمسک بھی فلسطین کے گرد و پیش کے صحراؤں (لے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

میں ہی ہوا۔ اس باب میں رینان کا بیان قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

۲۸ء کے قریب، تمام فلسطین میں یوحنا نامی ایک نوجوان کی شہرت عام طور پر پھیل گئی۔ یہ ایک نوجوان زاہد تھا جس کا دل جوش و خروش سے بھر پور تھا۔ وہ بجا ریوں کے خاندان سے تھا۔ (JUDEA) کے صحرا کے قریب اس کا مسکن تھا۔ بچپن ہی سے راہبانہ زندگی کی طرف اس کا میلان تھا۔ اس صحرا میں وہ اس قسم کی تہجد کی زندگی بسر کرتا تھا جیسے ہندوستان کے یوگی۔ کھال یا اونٹ کے بالوں (کے کبل) اس کا لباس اور شہد اور جنگل کی ٹڈیاں اس کی خوراک۔ کچھ چیلے اس کے گرد و پیش رہتے تھے جو اس قسم کی مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسے ہی سمجھتے جیسے برہمنوں کے گرد (اوپیلے)۔ اصل یہ ہے کہ یوحنا کی جائے پیدائش کے قریب بحر میت کے مشرقی کنارے پر ایسینی فرقہ کے لوگ رہتے تھے (انہی کا اثر یوحنا پر تھا) اندازہ یہ ہے کہ اس فرقہ پر بدعت کی تعلیم کا اثر غالب تھا۔ (صفحہ ۹۳-۹۴)

یہ تھے ایسینی فرقہ کے اثرات، فلسطین کے گرد و نواح میں اور ان کی تعلیم کا مرکز یوحنا پتھر دینے والا۔

آگے چل کر رینان لکھتا ہے:-

اگرچہ یوحنا کی تعلیم کا مرکز (JUDEA) میں تھا لیکن اس کی شہرت بہت جلد گلیل تک بھی جا پہنچی اور اس طرح حضرت مسیح تک۔ اس وقت آپ کی ابتدائی تعلیم کے زیر اثر چند ایک لوگ آپ کے گرد جمع ہو چکے تھے..... اس خواہش کے تحت کہ ذرا اس شخص کو چل کر دیکھیں تو سہی جس کی تعلیم آپ کی تعلیم سے اس قدر مشابہ تھی۔ آپ اپنے

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ لے)۔ اس نقل مکانی کے متعلق قرآن کریم کی آیت پہلے لکھی جا چکی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے کسی مقام کا نام نہیں لیا۔ صرف اس مقام کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ لے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہی یوحنا دراصل حضرت یحییٰ ہیں۔ اس صورت میں آپ کی تعلیم کسی غیر خدائی تعلیم سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

متبعین سمیت یوحنا کے پاس تشریف لے گئے۔ (ص ۹۸)

اس کے بعد ریمان نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کس طرح یوحنا کی تعلیم کے پرجوش مبلغ بن گئے اور ان دونوں نے اس صحرائیں کیسا انقلاب انگیز نظام روحانیت قائم کر لیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ ۲۹ء میں یوحنا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد چالیس دن کے ایک خاص چلہ سے فارغ ہو کر حضرت مسیح مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

اُس وقت کے معاشرہ کی حالت | اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کس قسم کی تھی۔ لیکن آپ کی تعلیم کی اہمیت واضح طور پر سامنے نہیں آسکتی جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ جس قوم میں آپ کی بعثت ہوئی خود اس کی اُس وقت حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قوم سے مراد یہودی (یا بنی اسرائیل) ہیں لیکن اس علاقہ پر حکومت رومیوں کی تھی۔ اس لئے اس پس منظر کو دیکھنے کے لئے ہمیں ایک طرف یہودیوں کی مذہبی زندگی کو سامنے لانا ہوگا اور دوسری طرف وہاں کے نظام حکومت و تمدن اور انداز معاشرت و معیشت کو پہلے یہودیوں کی مذہبی زندگی کو دیکھئے۔

اُس زمانے میں یہودی پانچ بڑے بڑے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ صدوقی، فریسی، ایسینی، غالی اور سامری۔ ان میں سے صدوقیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ لوگ حکومت وقت کے حامی اور صاحبِ شہمت و جاہ تھے۔ مذہبی امور میں انتہائی قدامت پسند تھے اور ہیکل کے احبار و رہبان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ توریت میں سے صرف صحیفہ موسیٰ کو مستند تسلیم کرتے تھے اور باقی سب کتابوں کو محرف کہتے تھے۔ جیسا کہ حکومت کے طرفدار مذہبی فرقوں کی کیفیت ہوتی ہے، ان کی زندگی عیش پرستی میں گذرتی تھی۔ یہ حیات آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یہی وہ فرقہ تھا جو حضرت عیسیٰ کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔

صدوقیوں کے مقابلہ میں فریسی فرقہ تھا۔ اس کے متبعین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہ قدرے وسیع المشرب بھی تھے۔ جاہ و منصب میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس لئے یہ اقتدار کی ہمیشہ مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ ہیکل کی مذہبی پیشوائیت کا ہویا ملک کی حکومت کا۔ ان میں صدوقیوں کے مقابلہ میں خوبیاں زیادہ تھیں لیکن اپنی افضلیت اور برتری کا احساس اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ کسی دوسرے

کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔ ان کا یہی بے جا تکبر اور غرور تھا جس کی حضرت عیسیٰ نے سختی سے تنقید کی تھی۔

تیسرا فرقہ ایسینی تھا جس کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے۔ چونکہ فرقہ غالبین کا تھا۔ انہیں جلیلی بھی کہتے تھے۔ شروع میں یہ ایسینی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اپنے متشدّد نظریات کی بنا پر ان سے الگ ہو گئے۔ حکومت کے معاملہ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قیصر کی اطاعت بُت پرستی کے مترادف ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قیصر جو مردم شماری کرانا چاہتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ انہیں فرداً فرداً اپنی اطاعت پر مجبور کرے گا۔ اس لئے انہوں نے مردم شماری کی مخالفت کی اور حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ چنانچہ حکومت ان کی شورشوں سے ہمیشہ خائف رہتی تھی لیکن ان کی اس انتہا پسندی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل سے قانون کا احترام ہی اٹھ گیا تھا اور وہ کسی قسم کی حدود و قیود کو بطیب خاطر گوارا نہیں کرتے تھے۔

سامریوں کا فرقہ، یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ یہ قدیم یہودی مذہب کے خلاف تھے چنانچہ انہوں نے بیت المقدس کے ہیکل کے علی الرغم اپنا ہیکل الگ تعمیر کر رکھا تھا۔ یہ ہمیشہ دوسرے یہودیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہتے اور اس وجہ سے ملک میں فساد اور خون ریزی کا دور دورہ رہتا۔ یہ تھے یہودیوں کے فرقہ۔ لیکن یہ ہیئت مجموعی، یہودی قوم کا مرکز ہیکل ہی تھا اور ہیکل کی حیثیت حکومت کے ایجنٹ کی ہو چکی تھی۔ ہیکل کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے حقدار صرف وہ کاہن قرار پاتے تھے جو حضرت ہارون کی نسل سے ہوں۔ ان کے سوا یہودیوں کا کوئی قبیلہ ہیکل کا متولی نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک کے عوام دوہری غلامی میں ماخوذ تھے، ایک غلامی حکومت کی اور دوسری غلامی ہیکل کی مذہبی پیشوائیت کی۔ اور یہ دونوں حکومتیں خالصتہً استبداد پر مبنی تھیں۔ اس استبداد کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں ایک نجات دہندہ کا تصور ابھرتا۔ چنانچہ یہ نظریہ بڑی شدت سے ابھرا اور اس نے ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے ہاں ”نجات دہندہ“ سے مراد ایک مذہبی راہنما ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسی ہستی تھا جو انہیں حضرت داؤد کی چھنی ہوئی مملکت کو بھی واپس دلادے۔ اس اعتبار سے ان کے ہاں یہ نظریہ زیادہ شدت سے راسخ تھا کہ آلے والاسیح بادشاہ

بھی ہوگا۔ زیتون کا تیل ملنا یہودیوں کے ہاں ایک مبارک مذہبی رسم تھی۔ (مسیح کا لفظ مسح سے ماخوذ ہے جس کے معنی جسم پر کوئی چیز ملنے کے ہیں)۔ اس آنے والے کو اسی اعتبار سے مسیح کہا جاتا تھا لیکن اس کی ہم اس سے زیادہ گہری تھی۔ اُس زمانہ میں بادشاہوں کی تاج پوشی کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں ان میں اولین رسم زیتون کے تیل کا مسح تھا۔ یہودیوں کے ہاں مسح کی رسم اسی فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کے لئے رکھی کہ آنے والا مسیح، بادشاہ ہوگا اور (حضرت) داؤد کی نسل سے ہوگا۔

(۰۰)

اب آپ اُس زمانے کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی طرف آئیے۔ قیصریوں تو بادشاہ ہی تھا، لیکن اسے مقام الوہیت تک پہنچا دیا گیا تھا۔ قیصر اعظم آگسٹس کی باقاعدہ پرستش ہوتی تھی۔ اس کے جانشین بھی اسی طرح اپنی پرستش کراتے تھے۔ شاہنشاہ مطلق العنان تھا، اس لئے آئین اور قانون کا نام ہی نام باقی رہ گیا تھا۔ خود بیررو نے اپنی بہن کو اپنی بیوی بنا رکھا تھا اور اس کا خاوند بھی زندہ موجود تھا۔ حکام کا طبقہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا اور عوام فقر و فاقہ کا شکار ہو رہے تھے۔ فلسطین کا علاقہ قریب بیس برس تک رومیوں اور ایرانیوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس سے وہاں کے باشندوں کی جو حالت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ خود دو فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ رومیوں کا حامی تھا اور دوسرا ایرانیوں کا اور ان کی باہمی مخالفت اس درجہ شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس قدر کشت و خون، بیرونی دشمنوں کی تلوار سے نہیں ہوتا تھا جس قدر باہمی خانہ جنگی میں ہوتا تھا۔ خود مذہبی ادارے بھی اس تفریق کا شکار ہو چکے تھے۔

مختلف قسموں کے ٹیکسوں سے رعایا کا کچھ مر نکل رہا تھا۔ خود ٹیکس کا جس قدر بوجھ تھا اس سے کئی گنا زیادہ بوجھ ٹیکس وصول کرنے والوں کا تھا۔ ان تمام خرابیوں کی وجہ سے لوگ جس بُری طرح فقر و فاقہ کا شکار اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے ان کی تفصیل اناجیل کے مطالعہ سے سامنے آسکتی ہے۔

یہ تھے مختصر اودہ حالات جن میں حضرت عیسیٰ کی بعثت ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا

ہے کہ آپ کی دعوت کیسے عظیم انقلاب کی علمبردار ہوگی اور آپ کو معاشرہ کے کس کس گوشے سے جنگ کرنی پڑی ہوگی۔ لیکن اناجیل اور دیگر عیسوی لٹریچر میں سیرت مسیح کی جو تصویر پیش کی گئی ہے آپ کی تعلیم کیسی تھی؟ اس سے عام طور پر بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ خود بھی ایک مرہاں مرنج درویش، تارک الدنیا فقیر اور عاجز و ناتواں زاہد گوشہ نشین تھے اور اپنے متبعین کو بھی سکینی و عاجزی، فروتنی و بے چارگی، محکومیت و مغلوبیت، غربت و افلاس، نکبت و ادبار کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ مثلاً

اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔ شاگرد یہ سن کر بہت ہی حیران ہوئے اور بولے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے؟

(متی ۲۵-۱۹/۲۲)

اور مندرجہ ذیل وعظ تو دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے جسے ہر صاحبِ تغلب و استیلا اپنے محکوموں کے لئے بطور افیون استعمال کرتا اور ہر فریب کار اپنے زہر آلود خنجر کو چھپانے کے لئے نرم و نازک ریشمیں رومال کی شکل میں ہاتھ میں رکھتا ہے۔ یہی وہ نسیمِ سحری ہے جسے خاص طور پر اس مقصد کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ اس کی تھپکیاں مغلوب و مقبور، کمزور و ناتواں انسانوں کو کبھی خوابِ غلامی و محکومی سے بیدار نہ ہونے دیں، یعنی پہاڑی کا "حسین و جمیل" وعظ جسے اناجیل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس

(متی ۳۸-۵/۲۲)

سے مُنہ نہ موڑے

اور

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت نہ
لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے
لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر بے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدلوں اور
نیکیوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے

(متی ۲۳ — ۵/۲۵)

اس میں شبہ نہیں کہ رافت اور محبت، حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور آپ کے متبعین کی نمایاں خصوصیت
تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تائید کی ہے اس لئے کہ رافت و محبت کو ہر صحیح تعلیم کا ایک
جزو ہونا چاہیئے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ
مَرْيَمَ وَاتَيْنَاهُ الْوَحْيَ الْبَيِّنَاتِ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ
الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَافَةً وَرَحْمَةً ۖ (۵۴/۲۴)

پھر اُن کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے بعد ہم نے اپنے
رسول، مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (بھی) بھیجا اور اسے انجیل عطا فرمائی اور ان لوگوں کے دلوں
میں جنہوں نے اس کی پیروی کی، ہم نے نرمی اور مہربانی پیدا کر دی۔

لیکن شریر کا مقابلہ نہ کرنا، جو کوئی کرتا لینا چاہے اُسے چُغہ اتار کر خود دے دینا، جو ایک کو س بیگار
میں لے جائے اس کے ساتھ دو کو س تک چلے جانا، دشمن سے محبت کرنا (انصاف نہیں بلکہ محبت!)
کس طرح تعلیم خداوندی ہو سکتی ہے؟ ہر چند یہ الفاظ بڑے خوش آئند اور نگاہ فریب ہیں، لیکن جن
کی نگاہیں زندگی کے حقائق پر ہیں وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں
ہو سکتی (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ حضرات انبیائے کرام دنیا سے فتنہ و فساد،
جور و ستم، ظلم و استبداد، تغلب و قہرمانیت مٹانے کے لئے آتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مقصد
عظیم شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور کُرتہ مانگنے والے کو چُغہ اتار کر دے دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔
تمام سابقہ انبیائے کرام کی تعلیم اور عملی کوائف گزشتہ مہلکات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

غور کیجئے کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کو یہ تعلیم ملتی ہے! خود اس جہود افزا اور تعطل انگیز وعظ کی ابتدا (جسے حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ”تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت“ اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ تعلیم حضرت مونسؑ کی ہے جو آج بھی تورات میں موجود ہے، بلکہ اس اضافہ کے ساتھ کہ زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ“ (دیکھئے خروج ۲۴ - ۲۵/۲۱)۔ تو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کردہ محولہ بالا تعلیم اس تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ حالانکہ خود حضرت عیسیٰ کا اعلان ہے کہ:

یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔ (متی ۲۰-۲۱/۵)

اس سے ظاہر ہے کہ ”پہاڑی کے وعظ“ کی تعلیم حضرت عیسیٰ کی تعلیم نہیں ہو سکتی بلکہ بعد میں آپ کی طرف منسوب کر کے اناجیل میں شامل کر دی گئی ہے (ایسا کیوں کیا گیا تھا اور اناجیل کب مرتب ہوئی تھیں، ان امور کی تفصیل آگے چل کر ملے گی)۔ قرآن کریم نے جہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی دیگر مفتریات کی علانیہ تردید کی وہاں اس حقیقت کا بھی صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم بھی وہی آپ کی سچی تعلیم کچھ اور تھی۔

تھی جو انبیاء سابقہ کی تھی اور ان کی بعثت بھی اسی مقصد کے لئے ظہور میں آئی تھی جس کے لئے یہ سلسلہ رشد و ہدایت قائم کیا گیا تھا، یعنی زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ آپ نے بھی اسی دعوت کو دہرایا کہ

..... فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاطِيعُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ سَرِيبٌ وَرَبُّكُمْ

فَاعْبُدُوهُ ۖ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۵۰ - ۵۱/۵۹ نیز ۶۳ - ۶۴/۶۳)

..... تم قانون خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو۔ یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار (وہی) اللہ ہے۔ سو اسی (ایک) کی محکومیت اختیار کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

اللہ کی محکومیت اختیار کرو جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی حکومت کے مرکزِ اولین (داعی انقلاب) مامور من اللہ (رسول) کی اطاعت کرو۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا ۝ وہی حقیقت کشا اور محکومیت شکن تعلیم جو اس سے پیشتر ہمارے سامنے آتی رہی ہے۔ شرائع سابقہ کے جزئی احکام میں تبدیلیاں ہو سکتی تھیں اور ہوتی چلی آرہی تھیں، لیکن اس کے اصل الاصول میں حتماً اور یقیناً کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر رسول اسی تعلیم کے اصل و اساس کی تائید و تصدیق کے لئے آتا تھا۔ یہی حضرت عیسیٰ نے کیا (دیکھتے ۳/۴۹ : ۵/۴۶ : ۱۶۱/۴) آپ کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو وہ راہ دکھائی جائے جس سے وہ اس عذابِ الیم سے نجات حاصل کریں جس کی وجہ سے ذلت و مسکنت (محکومی اور جہود) کی لعنت ان پر مسلط ہو رہی تھی۔ یہی آپ کی تعلیم تھی اور یہی وعظ۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم المرتبت مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسی قوم کی ضرورت تھی جس کے جگر میں خونِ گرم، نگاہوں میں بصیرت، بازوؤں میں قوت، سر میں سودائے عشق اور دل میں تقویٰ ہو اور جو بڑی سے بڑی مصیبت کا استقبال نہایت خندہ پیشانی اور ہنسنے پر آمادگی سے کریں۔ حضرت عیسیٰ تشریف لائے، قوم تک اپنا پیغام پہنچا یا لیکن دیکھا کہ قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اب یہی صورت باقی تھی کہ اس راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو یک جا کر کے انہی سے کچھ سامانِ حرارت فراہم کیا جائے۔ آپ نے دعوت دی اور سرفروشنوں کی اس جماعت نے بڑھ کر اس پر لبیک کہا۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟
قَالَ الْحَوَارِيُّونَ كُنْ أَنْصَارُ اللَّهِ ۖ آمَنَّا بِاللَّهِ وَآشْهَدُ
بِآَنَا مُسْلِمُونَ ۝ (۳/۵۱)

جب کہ عیسیٰ نے بنی اسرائیل میں اپنی دعوت کے خلاف انکار کا احساس کیا،
تو وہ پکارا اٹھا ”کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ اس پر حواریوں نے یہی

چند راست باز انسانوں نے جو مسیح پر ایمان لائے تھے، اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا ”ہم اللہ کے (کلمہ حق کے) مددگار ہیں۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور (اے داعی حق) تو گواہ رہیو کہ اس کی فرمانبرداری میں ہمارا سر جھک گیا ہے۔
دوسرے مقام پر ہے۔

وَ إِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْخَوَارِجِ أَنْ امْنُوا بِي وَ بِرَسُولِي
قَالُوا اٰمَنَّا وَ اَشْهَدُ بِاَنَّكَ مُسْلِمُونَ ۝ (۵/۱۱۱)

اور جب میں نے خواریوں کی طرف (یعنی اس جماعت کی طرف جو حضرت مسیح پر ایمان لائی تھی) بوساطت عیسیٰ حکم بھیجا تھا کہ مجھ پر اور میرے رسول (مسیح) پر ایمان لاؤ اور انہوں نے کہا تھا ”ہم ایمان لائے اور خدایا! تو گواہ رہیو کہ ہم مسلم (یعنی فرمانبردار) ہیں۔

خدا کے مخلص بندوں کی اس جماعت نے جب اپنے آپ کو اس مقصد کی خاطر یوں وقف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی معیشت کا ایسا انتظام فرمادیا کہ اس کی فکر ان کی تک و تازا اور سعی و عمل کی راہ میں دھنگیر نہ ہو۔

اِذْ قَالَ الْخَوَارِجُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبِّيْكَ
اَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اَتَقُوْنَ اللّٰهَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوا نُرِيدُ اَنْ تَاْتَا كُلَّ مِثْمَا وَ
تَطْبُخُنَاْ قُلُوْبُنَاْ وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَّقْتَنَا وَ نَكُوْنُ عَلَيْهَا
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۵/۱۱۳ — ۱۱۲)

اس کے بعد اس جماعت مومنین نے تم سے کہا تھا کہ کیا ہمارا نشوونما دینے والا ہماری اس آرزو کو پوری کر دے گا کہ ہم معاش کے لئے انفرادی سہاروں کے محتاج نہ رہیں اور ہمارے لئے سامان نشوونما خدا کے نظام ربوبیت سے ملا کرے۔ یعنی معیشت کے موجودہ ”ارضی نظام“ کی جگہ ”سماوی نظام“ قائم ہو جائے۔ اس کے جواب میں تم نے ان سے کہا تھا کہ جب تم نظام خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو

اس کا وہ نظام قائم ہو جائے گا جس میں رزق کی ذمہ داری خود نظام کے سر ہوگی، افراد پر نہیں ہوگی۔

انہوں نے کہا کہ ہماری فحش خواہش یہی ہے کہ ہم بلا منت غیس کے نظام ربوبیت ہی سے رزق حاصل کریں تاکہ اس طرف سے ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے اور ہمیں یقین آجائے کہ جو کچھ تو ہم سے کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کی شہادت دیں۔

مَآئِدَہ کے معنی | ”مَآئِدَہٌ مِّنَ السَّمَآءِ“ کے معنی یہ نہیں کہ اوپر سے کوئی چنا چنایا خوان اُترتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لئے انتظام ہوا تھا یا جیسا نظام ربوبیت کی رو سے ہوتا ہے، اسی قسم کا انتظام اس جماعت مومنین کے لئے کیا گیا تھا۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ قَالَ اللَّهُ إِلَيْنَا مَنَزِلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ (۵/۱۱۵-۱۱۴)

اس پر تم نے (اے عیسیٰ!) ہمارے حضور التجا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان، نظام ربوبیت کی رو سے عطا ہو جائے تاکہ یہ چیز، اس جماعت کے السابقون الاولون (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) کے لئے جشنِ مسرت کا بھی موجب ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔ نیز یہ تیرے قانون کی صداقت کی عملی نشانی بن جائے۔ تو ہمیں اس طرح سامانِ زیست عطا فرما۔ اس لئے کہ جو رزق تیرے نظام کی رو سے ملے وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے جو انسانوں کی وساطت سے حاصل ہو۔ (انسانوں کے ہاتھ سے ملنے والے رزق سے تو پر واز میں سخت کوتاہی آجاتی ہے۔ اس رزق سے تو موت اچھی ہے)۔

اس پر ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہارے رزق کا اسی طرح انتظام کر دیں گے۔ لیکن اپنے متبعین سے کہہ دو کہ اگر تم نے اس نظام کی صحیح صحیح قدردانی نہ کی اور جن بنیادوں پر اسے قائم کیا گیا ہے، تم ان سے پھر گئے، تو اس کی ایسی سخت سزا ملے گی جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ ملی ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس جماعت میں کھلے بندوں شامل تو نہ تھے لیکن انہیں ان کے مشن سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور مؤیدین کی یہ جماعت، مجاہدین کی جماعت کی ضروریات زندگی کی کفیل تھی۔ مجاہدین کی یہی جماعت تھی جسے مسلمانوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَصْوَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَصَارُ اللَّهِ فَأَمْنَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ۝ (۱۵۱/۶۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے رسول کے) مددگار بن جاؤ (بالکل اسی طرح) جیسے مریم کے بیٹے عیسیٰ نے حواریوں سے (خطاب کر کے) کہا تھا "خدا (کے دین) کی طرف میرا کون مددگار ہے؟" تو حواریوں نے کہا تھا "ہم اللہ (کے دین کے) مددگار ہیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے) بنی اسرائیل کی ایک جماعت

لے اناجیل میں "عشائے ربانی" کے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا اس واقعہ سے کچھ تعلق نہیں۔ عشائے ربانی وہ آخری کھانا تھا جو حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کے ساتھ کھایا اور جس میں یسوع نے روٹی لی اور برکت چاہ کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا کہ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دے کر کہا کہ تم سب اس میں سے پی لو کیونکہ یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے۔" متی ۲۶-۲۹

عیسائیت میں اس عشائے ربانی نے عجیب و غریب معتقدات کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ایمان لے آئی اور ایک جماعت (پھر بھی) انکار پر جمی رہی۔ بالآخر ہم نے اُن کے دشمنوں کے برخلاف پیروان دعوت ایمانی کی تائید کے سامان کر دیئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ (ان پر) غالب آ گئے۔

ان حواریوں کے متعلق اناجیل کی تصریحات | ان حقائق سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ جماعت کس قسم کی تھی اور ان کے پیش نظر کونسا عظیم الشان مقصد تھا۔ یہ تو قرآن کریم کا بیان ہے۔ اب اس کے مقابلے میں ان ہی حواریوں کے متعلق اناجیل کا بیان دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ کونسی تعلیم آسمانی ہو سکتی ہے؟ اناجیل کی رُو سے ان حواریوں (شاگردوں) کی تعداد بارہ تھی جن میں پطرس بہت زیادہ مقرب نظر آتا ہے۔ لیکن اس پطرس کے متعلق متی کی انجیل میں لکھا ہے۔

اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یرושلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں اور تیسرے دن جی اٹھوں ۱۵ اس پر پطرس اس کو الگ لے جا کر اسے ملامت کرنے لگا کہ اے خداوند! خدا نہ کرے۔ یہ تجھ پر ہرگز نہیں ہوئے گا ۱۶ اس نے پھر پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے ۵ (متی ۲۱-۲۳/۱۶)

اسی انجیل کے چھبیسویں باب میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کی صدر عدالت میں پیش کیا گیا تو آپ کے حواریوں کی بھی تلاش ہوئی۔ جب پطرس سے پوچھا گیا کہ وہ جناب مسیح کو جانتا ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

اور پطرس باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لونڈی اس کے پاس آ کر بولی تو بھی یسوع گیلی کے ساتھ تھا ۱ اس نے سب کے سامنے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں نہیں جانتا تو کیا کہتی ہے ۲ اور جب بے ڈیوڑھی میں چلا گیا تو دوسری نے اسے دیکھا اور جو وہاں تھے ان سے کہا یہ بھی یسوع ناصری کے ساتھ تھا ۳ اس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا ۴ تھوڑی دیر کے بعد جو وہاں کھڑے تھے انہوں نے پطرس کے پاس آ کر کہا کہ بے شک تو بھی ان میں

سے ہے کیونکہ تیری بولی سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس پر وہ لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا

کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا اور فی الفور مرغ نے بانگ دی ۵ (متی ۶۹-۷۴/۷۳)

حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ”اگر تیرے (حضرت مسیحؑ کے) ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا ہرگز انکار نہیں کروں گا اور سب شاگردوں نے بھی اسی طرح کہا“ (متی ۲۶/۳۵)۔ ایک اور شاگرد یہود تھا جس نے (اناجیل کے بیان کے مطابق) چند سکوں کے عوض غداری کی اور یہودیوں سے سازش کر کے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر دیا۔ باقی رہے دس، سوان کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے“ (متی ۲۶/۵۶)۔ یہ ہیں وہ ”شاگرد“ جنہیں عیسائیت میں ”رسول“ مانا جاتا ہے، جو اناجیل کے مؤلف ہیں اور جن سے مذہب عیسائیت آگے چلتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ذرا قرآن کریم کی کشادہ دامن اور اظہار حقیقت پر غور فرمائیے کہ اس نے انہی حواریوں کی سیرت کس قدر بلند پیش کی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم کی رُو سے یہ انبیاء کرامؑ اور ان کی مومن جماعتیں کوئی غیر نہ تھے، ایک ہی سیح کے دلنے اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔

ایسی تصویر کیوں؟ | تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی جماعت کی صحیح تصویر وہ نہیں جو اناجیل میں ملتی ہے اور

جس کی رُو سے یہ حضرات مفلوک الحال فقیروں کی در بدر پھرنے والی ٹولی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتے۔ اناجیل میں ایسی تصویر کیوں پیش کی گئی ہے، اس کی وجہ بادی تدبیر سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، حضرت عیسیٰؑ پر حکومت کے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس جرم کے لئے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور (اناجیل کی رُو سے) سزائے موت دی گئی۔ اس تمام کارروائی میں خود بنی اسرائیل (یہودیوں) کے اربابِ حل و عقد شامل تھے بلکہ انہی کی سازش اور اشتعال سے حکومت نے ایسا اقدام بھی کیا تھا۔ ورنہ اگر یہ شوریدہ بخت قوم خدا کے اس برگزیدہ رسول کا ساتھ دیتی تو مستبد رومیوں کی سلطنت کا تختہ الٹ جاتا اور بنی اسرائیل کی چھنی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی سطوت و حکومت پھر سے واپس مل جاتی۔

لے اناجیل میں اس قسم کی باتیں کیوں داخل کی گئیں اس کی وجہ چند سطور آگے چل کر ملے گی۔

حضرت عیسیٰ کی تبلیغ کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہودیوں کی مخالفت نے انتہائی شدت اختیار کر لی اور ان کے اہبار و رہبان نے رومی حکام سے ساز باز کر کے اس تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کی ٹھان لی حالانکہ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ”یہوا“ (خدا) کے سوا حق حکومت کسی کو حاصل نہیں۔ اور وہ ایک ایسے نجات دہندہ کی آمد کے منتظر تھے جو یہوا کی اس حکومت کو عملاً قائم کر کے دکھائے۔ لیکن بُرا ہو مذہبی پیشوائیت کا کہ وہ محض اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس انقلابی تحریک کی مخالف ہو گئی اور حکومت کے ساتھ مل کر اسے کچلنے کے درپے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ کے متبعین کی جماعت ہنوز بہت دانی حالت میں تھی کہ یہ حکومت کے زیرِ عتاب آگئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس انقلابی جماعت کا اس طرح شیرازہ بکھرنے کے بعد، حکومت (اور یہودیوں) کی طرف سے ان پر کیا کیا سختیاں نہ کی گئی ہوں گی؟ اس وقت محض عیسائی ہونا ہی ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہوگا! یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد اس جماعت کے اراکین کی کوئی تفصیلی تاریخ نہیں ملتی۔ اس ابتلاء اور سختی کے زمانہ میں ان کے ہی خواہوں کی سب سے بڑی خواہش (اور کوشش) یہی ہوگی کہ ان کی طرف سے حکومت کے دل میں جو شبہات پیدا ہو چکے تھے، انہیں کسی نہ کسی طرح رفع کر دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر سب سے بہتر طریق کار یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ ظاہر کیا جاتا یہ تو بچارے مرغاں مرنج درویشوں کی ایک کمزور و ناتواں سی جماعت تھی جسے حکومت و ثروت سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ دشمن سے محبت کرو۔ شریر سے انتقام نہ لو۔ جو کرتہ مانگے آئے چُغہ بھی اتار کر دے دو۔ یہ تھی ان غریبوں کی تعلیم اور ”کوئی دولت مند خدا کی بادشاہت میں بار نہیں پاسکتا“ یہ تھا ان کا مسلک۔ اس سے ثابت کیا جاتا ہوگا کہ جو جماعت ”ایک کال پر ٹپا پٹہ کھا کر دوسرا کال سامنے کر دینے“ کی روش پر ایمان رکھے اس کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ حکومت سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی تھی، محض اتہام اور بہتان تراشی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ”خدا کی بادشاہت“ اور ”آسمانی حکومت“ کے الفاظ کی بھی ایسی تاویلیں کی جاتی ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہو کہ اس سے مفہوم محض روحانی بادشاہت ہے، دنیاوی حکومت سے اسے کچھ علاقہ نہیں، اسی غرض سے مذہب اور سیاست اور دین اور دنیا کو دو الگ الگ شعبے قرار دیا گیا اور حضرت مسیحؑ کی طرف اس قسم کے واقعات منسوب کئے گئے جن سے ظاہر ہو کہ وہ سیاست اور حکومت کے معاملات میں کبھی دخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

مسیح کی انجیل میں ہے۔

اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنساتے ہیں؟ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے کہا اے اُستاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ تو کسی آدمی کا طرفدار نہیں ہے پس ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اریا کارو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اس کے پاس لے گئے اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے اس سے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے ان سے کہا پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو وہ انہوں نے یہ سن کر تعجب کیا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ (متی ۱۵ - ۲۲/۲۱)

لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ خود یہی واقعات حقیقت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب حضرت مسیحؑ کو معاملاتِ حکومت و سیاست سے کچھ واسطہ نہ تھا تو ان سے ان معاملات کے متعلق استفسار و استصواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایک تارک الدنیا جوگی سے کون پوچھتا ہے کہ حکومت کو ٹیکس دینا چاہیے یا نہیں؟ بہر حال یہ ہیں وہ قرآن جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی جماعت کی طرف اس قسم کی تعلیم اور ایسے واقعات کیوں منسوب کئے گئے۔ لیکن خود انا جیل

حقیقت کی چلمنی جھلک | میں ایسی شہادات بھی موجود ہیں جن سے اصل حقیقت کی کچھ جھلک سامنے آجاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صرف نبی اسرائیل کی

لے انا جیل اربعہ ۶۵ء سے ۶۷ء تک کے زمانہ میں مرتب کی گئیں، یعنی جب حالات نے ذرا مساعیت کی اور اس عجات کے منتشر افراد کو قدرے سکون میسر ہوا، اس وقت جو روایات حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں انہیں اکٹھا کیا گیا۔ روایات کے ان مجموعوں کا نام انا جیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں وہ باتیں بھی ہوں گی جن کے متعلق حواریوں کو خود علم ہوگا اور وہ بھی جو اُس وقت زبانِ زندہ خلائق ہوں گی اور جنہیں بہ تقاضائے مصلحت (جس کا ذکر پہلے لکھا جا چکا ہے) ان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ شروع شروع میں وہی فروتنی اور بے کسی کی روایات داخل کی گئی ہوں گی۔ بعد میں جب حالات بہتر ہوتے گئے تو اصل تعلیم اور واقعات کا بھی اضافہ ہوتا گیا۔ انا جیل سب قیاسی ہیں لہذا یہی کوئی نہیں۔

طرف مبعوث ہوئے تھے۔ متی میں ہے۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سلام پوچھنے کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر لے کر کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا
(متی ۶ - ۱۰/۵)

خود قرآن کریم بھی اس پر شاہد ہے جہاں فرمایا کہ

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ ؕ (۳۳) ذٰلِكَ

بنی اسرائیل کی طرف رسول۔

اور یہ کوئی نہیں بات نہیں۔ ہم اس سے پیشتر (سابقہ مجلدات میں) دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ تمام انبیائے سابقہ کسی نہ کسی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ عالمگیر بعثت تو اس رسول خاتم الانبیاء ہی کی ہے جو خدا کا آخری اور مکمل پیغام لے کر آیا اور یوں سلسلہ نبوت قیامت تک کے لئے مکمل و مختتم ہو گیا۔ بہر حال حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کی جو حالت اُس زمانہ میں ہو چکی تھی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ رومیوں کی حکومت میں یہودیوں کو عبادت اور مذہبی رسوم کی آزادی حاصل تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کا مقدمہ بھی پہلے یہودیوں ہی کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ یہودیوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ یہی تھی کہ ان پر خدا کی بجائے انسانی قوانین کی حکومت مسلط تھی، یعنی ایک طرف ان کے احبار و رہبان کے قوانین کی حکومت ان کے قلب و دماغ پر اور دوسری طرف رومیوں کی حکومت ملک و وطن پر۔ حضرت مسیح کی بعثت کی غرض یہی

آپ حکومت الہیہ کا قیام چاہتے تھے

تھی کہ اس خدا فراموش اور محکوم و مغلوب قوم کو روح اور بدن دونوں کی فلامی سے نجات دلا کر آزادی کا صحیح راستہ دکھایا جائے۔ مسٹر (CECIL ROTH) اپنی مشہور کتاب

A SHORT HISTORY OF

THE JEWISH PEOPLE

میں لکھتا ہے۔

(حضرت مسیح) ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی ارباب حکومت نے اس جسم کی پاداش میں حوالہ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرات کی تھی۔ (حضرت یسوع) کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ اس مسیح موعود ہونے

کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسری طرف انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

یعنی ایک طرف بنی اسرائیل کو رومیوں کی غلامی و محکومی سے نجات دلانا اور دوسری طرف ان کے معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔ یہ تھی غایت حضرت مسیحؑ کی بعثتِ مقدسہ کی حقیقت یہ ہے کہ جس شدت و تکرار سے ”خدا کی بادشاہت“ کا اعلان حضرت مسیحؑ کی زبانِ اقدس سے ہوا ہے، آپ سے پیشتر (کتبِ تورات میں) اس انداز سے کہیں نہیں ملتا۔ اس حقیقت کو انجیل برنابا اس بڑے واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ اس کی فصل ۱۳۸ میں ہے۔ ”تب ملک کے لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیے۔“ اس سے آگے فصل ۱۳۹ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ عنقریب کاہنوں کے سردار اور قوم کے شیوخ مجھ پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور رومی حاکم میرے قتل کا حکم طلب کریں گے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کا ملک غصب کر لوں گا۔

رومی حاکم تو مخالف تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کے ہاتھ سے حکومت چھین جائے گی۔ لیکن یہودی احبار و رہبان بھی اسی لئے مخالف تھے | علماء و مشائخ کو بھی ان سے کچھ کم خوف و ہراس نہ تھا۔ اس لئے کہ ”خدا کی بادشاہت“ میں جہاں قیصریت کا کچھ کام نہیں وہاں پاپائیت (براہمنیت) کا بھی کچھ علاقہ نہیں۔ اس ”ملکِ عظیم“ سے ان دونوں طاغوتی طاقتوں کو نکلنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہودی احبار و رہبان بھی حضرت مسیحؑ کی مخالفت پر تلے بیٹھے تھے۔ انجیل برنابا اس کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا ”اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ہماری تقالید (رسومات) باطل اس کی سمجھ نہیں سکتی۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔“

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں، جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنالینا ممکن ہے۔ مگر جبکہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جاسکے گا مگر جبکہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنابا س فصل ۱۴۲)

کیا اس سے بڑھ کر کسی اور شہادت کی بھی ضرورت ہے اس حقیقت کے ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت مسیح کا مقصد رسالت کیا تھا؛ حتیٰ کہ آخری وقت تک ان لوگوں کو یہی خیال دامنگیر تھا کہ ”اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے اپنے کو بادشاہ بنالیا تو پھر کیا نتیجہ ہو گا؟“ (انجیل برنابا س فصل ۲۰)۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور شہادت بھی دیکھتے جائیے۔ انجیل متی

دعوتِ مسیحیت اور تلوار

میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ (متی ۳۴ — ۱۰/۳۸)

غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا تعلیم ہے؟ سب سے پہلے تو وہی اصل الاصول کہ یگانگت اور بیگانگی کا معیار فقط کفر و ایمان ہے، وہی معیار جس کی رُو سے باپ اور بیٹا (واقعہ حضرت نوحؑ)، بیٹا اور باپ (واقعہ حضرت ابراہیمؑ) میاں اور بیوی (واقعہ حضرت لوطؑ) نے ایک دوسرے سے قطعِ علاق کیا؛ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ”یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔“

انقلابیوں کی جماعتِ مقدسہ

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی۔ اس مقصد کے لئے حصول کے لئے فدائیوں اور سرفروشنوں

کی جس جماعت کا ذکر کیا جا چکا ہے، انہیں قریہ قریہ اور بستی بستی میں اس تعلیم کے عام کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ کن ہدایات کے ساتھ بھیجا جاتا تھا؟ سنئے۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ راستے کے لئے نہ جھولی لینا نہ دودھ کرتے نہ جوتیاں لاٹھی کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حقدار ہے۔ اور جس گاؤں یا شہر میں داخل ہونا دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو اور گھر میں داخل ہوتے وقت اسے دعائے خیر دو اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا سلام اسے پہنچے اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا سلام تم پر پھر آئے اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری باتیں نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو وہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم عموراہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔ (متی ۱۵-۱۰/۵)

اس کے بعد فرمایا۔

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بھولے بنو۔ مگر آزمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تم کو کوڑے ماریں گے اور تم میرے سب سے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں یا کیا کہیں۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے

نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔ لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ کیونکہ میں تم سے بچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابن آدم آجائے گا۔
(متی ۱۶ - ۲۳/۱۰)

کیا انقلابی جماعت کے انداز اس سے الگ کچھ اور بھی ہوا کرتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد حقیقت کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ حضرت مسیحؑ کا مقصد بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنا تھا جس قسم کا قلبی اور مادی انقلاب اس سے پیشتر ہم حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں رونما ہوتا دیکھ چکے ہیں اور جس انقلاب کا داعی ہر مامور من اللہ ہوتا تھا۔ لیکن ابھی ایک اور شہادت بھی موجود ہے جس کے بعد اس امر کے اثبات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ جسے صلیب دیا جاتا، اس کا جرم ایک تختی پر لکھ کر اس تختی کو صلیب کے اوپر لٹکا دیا جاتا۔

ایک حتمی شہادت | انجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کے ساتھ دو اور مجرم بھی صلیب دیئے گئے تھے۔ اُن کے جرائم کی نوعیت بھی ان کی تختیوں پر لکھ دی گئی تھی۔ تیسری تختی (بقول اناجیل) حضرت مسیحؑ کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تختی پر رومی حاکم نے کیا لکھ کر لٹکایا تھا؟ متی میں ہے، "اس کا الزام لکھ کر اس کے سر سے اوپر لٹکا دیا کہ

"یہ یہودیوں کا بادشاہ یسوع ہے" (متی ۲۷/۲۷)

اس سے ذرا پہلے ہے کہ واقعہ تصلیب سے پہلے جب حضرت مسیحؑ رومی سپاہیوں کی حراست میں تھے تو انہوں نے (معاذ اللہ) آپ کا مسخر اڑایا۔ لیکن اس مسخر میں کیا کیا؟

اس پر عاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ! آداب! اور اس پر حقو کا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھ کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے ۵ (متی ۲۷ - ۳۱/۲۷)

() Mareello Graveri جس کی کتاب (The life of Jesus) کا ذکر پہلے
 آپکا ہے، نے بھی لکھا ہے کہ جب رومی گورنر نے 'یہودیوں کے جرگہ سے پوچھا کہ مسیح کا جسم کیا ہے
 تو انہوں نے کہا کہ
 یہ شخص لوگوں سے کہتا ہے کہ قیصر کو خراج مت دو اور اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے۔
 (صفحہ ۳۸۵)

اس پر گورنر نے پوچھا کہ جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے، بتاؤ کہ میں اسے
 کیا سزا دوں؟ تو انہوں نے کہا کہ اسے صلیب دے دو (صفحہ ۳۹)۔ علاوہ ازیں خود یہودیوں کے ہاں بادشاہ کی
 تخت نشینی کے وقت اس پر تیل کی مالش کی جاتی تھی اور اس اعتبار سے اُسے مسیح کہا جاتا تھا (جس کے
 لغوی معنی وہ شخص ہیں جس پر مالش کی جائے)۔ حضرت عیسیٰ نے جو اپنا نام یا لقب مسیح قرار دیا تھا تو یہودی اس
 سے بھی یہی مراد لیتے تھے کہ وہ بادشاہت کا مدعی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۴، ص ۳۰۸)۔
 ان تصریحات سے واضح ہے کہ رومیوں کی نگاہ میں آپ کا جرم کیا تھا؟

دو گونہ مشکلات | اس مقصدِ عظیم کو لے کر حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔
 حضرت موسیٰ کے سامنے بھی دوہری قسم کی مشکلات تھیں، یعنی فرعون جیسے
 مجتہد استبداد کی قہرمانی قوتیں اور خود اپنی قوم کا ضعف خودی۔ لیکن حضرت عیسیٰ کی مشکلات ان سے بھی
 کہیں بڑھ کر تھیں۔ رومی حکومت کا استبداد، فرعون بنی اسرائیل کی طرف سے "بچپن" کی سی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ نہ تھا جیسا کہ وہ عہدِ حضرت موسیٰ میں کرتے تھے بلکہ
 رومیوں سے بھی بڑھ کر زاحم و تصادم کا خطرہ۔ اور مسیح پوچھے تو حضرت مسیح کی منزل کے آخری مراحل میں
 جو کچھ پیش آیا اس میں رومیوں کی نسبت، یہودیوں کا جوش انتقام کہیں زیادہ کارفرما تھا۔ یہودی اپنے
 انبیاء کی پیشگوئیوں کے مطابق ایک آنے والے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ رہبان و رہبات
 خالقانوں میں معتکف، اس مسیح کی آمد کے لئے خدا کے حضور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت
 مسیح تشریف لائے تو سب سے پہلے انہی اجبار و رہبان نے آپ کا انکار کیا۔ انکار کی وجہ تو پہلے بیان
 ہو چکی ہے، یعنی وہ دیکھتے تھے کہ جس سلکِ حیات کی طرف حضرت مسیح دعوت دیتے ہیں اس میں ان اجبار

ورہبان (علماء مشائخ) کی مذہبی سیادت و قیادت چھن جاتی ہے۔ لیکن اس انکار کے لئے توجیہ یہ پیش کی گئی کہ آنے والا مسیح یروشلم میں کیوں پیدا نہیں ہوا جسے دنیا نے مذہب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گلیل کے علاقہ میں کیوں پیدا ہوا جہاں کے باشندوں کو یروشلم کے یہودی بہ نگاہ حقارت دیکھا کرتے تھے۔
(MARTYRDOM OF MAN P. 135) خود انجیل میں ہے کہ

فلسفے نتھانیل سے مل کر اس کا کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے تورات میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا، یسوع ناصری ہے۔ نتھانیل نے اس سے کہا کیا ناصرو سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟
(یوحنا ۴-۱۱/۲۵)

ان مشکلات و مصائب کے نامساعد ماحول میں حضرت مسیح کی پکار اٹھی۔
روح القدس کی تائید ظاہر ہے کہ اس جاں گداز اور صبر آزا مہم کے لئے بہت بڑی تائید غیبی کی ضرورت تھی۔ قرآن کریم نے اسے ”روح القدس“ کی تائید کہا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَ قَفَّيْنَا مِنْ لَدُنْهُ بِالرُّسُلِ
وَ آتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَ آتَيْنَاهُ بُرُوحِ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّهِ
اور (پھر دیکھو) ہم نے تمہاری رہنمائی کے لئے پہلے موسیٰ کو کتاب دی۔ پھر موسیٰ کے بعد
سلسلہ ہدایت پے درپے رسولوں کو بھیج کر جاری رکھا۔ بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی
روشن نشانیاں دیں اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا۔

”روح“ کے مفہوم کے لئے ابلیس و آدم میں ملائکہ کا عنوان دیکھئے۔ اس سے مراد وحی الہی یا وہ ناموس اکبر (جبریل) ہے جس کی وساطت سے نزول وحی ہوتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس سے مقصود وہ تائید خداوندی ہوگی جو بصورت وحی حضرات انبیائے کرام کے شامل حال ہوتی تھی اور جس کی رو سے اپنے نصب العین کی حقانیت اور دعویٰ کی صداقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر سامنے آجاتی ہے اور کبھی پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دیتی۔ باقی رہے بیانات، سو اس سے وہ واضح دلائل مراد ہیں جن کے ساتھ وحی کو پیش کیا جاتا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ
وَ الْوُبَيِّنِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا

اللہ وَ أَطِيعُونِ ۝ (۴۳/۴۳)

اور جب عیسیٰ واضح دلائل کے ساتھ آیا تو اُس نے (بنی اسرائیل سے) کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت (کی باتیں) لے کر آیا ہوں (اور اس لئے آیا ہوں) تاکہ ان باتوں کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ لہذا قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو!

بیّنات و معجزات | یہاں ”بیّنات“ سے مراد وہ دلائل روشن و براہین محکم ہیں جو بذریعہ وحی آپ کو دیئے گئے اور جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی تھی۔ باقی رہے معجزات، سوان کے متعلق سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریمؑ سے کہا گیا کہ تیرا بیٹا جب منصب رسالت پر فائز ہوگا تو وہ بنی اسرائیل جیسی مُردہ قوم سے کہے گا کہ

اَیُّ قَدُ جِئْتُکُمْ بِآیَةٍ مِّن رَّبِّکُمْ ؕ اَیُّ اَخْلَقْتُ لَکُم مِّنَ الطَّيْنِ کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفَخْتُ فِیْهِ فَاَیْکُوْنُ طَیْرًا یَّادٰیْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اُبْرِئُ الْوَکْمَہَ وَ الْوَبْرَصَ وَ اُنْحِی الْکُفٰی یَّادٰیْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اُنَبِّئْکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا قَدْ خِزُّوْنَ ؕ فِیْ یُّوْسُفَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۲/۲۵۸) ذ (۵/۱۱۰)

میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفتیں نصیب ہو جائیں گی (۶/۱۶۶)۔

یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی جس پر تروتازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

مختصر یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے

ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی (۶/۱۳۳)۔

میں (تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو اور کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے۔

اس قانون اور نظام میں تمہارے لئے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کرو۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں ایسی فرقیں طبابت اور قوتِ ارادی کے عملیات وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا مسلک تھا جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ مقبول تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے تو انہیں تاکید کرتے تھے کہ "بیماروں کو اچھا کرنا، مردوں کو جلانا، کورھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا اور ان تمام خدمات کے معاوضہ میں کچھ نہ لینا"۔ تم نے مفت پایا ہے مفت دینا (متی ۱۰/۸)۔ ظاہر ہے کہ قریہ بستی بستی، اللہ کا پیغام پہنچانے والوں کے لئے اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے اعتبار سے، اس سے بہتر طریق کار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جب ان شاگردوں میں علاجِ معالجہ وغیرہ کی یہ خصوصیات تھیں تو جو لوگ خود حضرت عیسیٰ کے پاس آتے ہوں گے وہ اس باب میں بہت بڑی توقعات لے کر آتے ہوں گے اور ان کی یہ توقعات پوری بھی ہوتی ہوں گی۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں تفصیلاً "محراج انسانیت" میں لکھا گیا ہے۔ وہاں منجملہ دیگر امور یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ معجزات کے متعلق گفتگو اب ایک تاریخی بحث ہے۔ اس لئے کہ خود نبی اکرم کو (قرآن کے علاوہ) کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا اور حضور کے بعد سلسلہ نبوت ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے اب کسی کو معجزہ ملنے یا نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک سابقہ انبیائے کرام کا تعلق ہے، ایک گروہ معجزات کے متعلق قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کرتا ہے اس لئے معجزات کو حسی معجزات سمجھتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ، ان الفاظ کے مجازی معانی لیتا ہے اور ان سے متعلق بیان کو استعارہ سمجھتا ہے۔ میں نے ان الفاظ کے مجازی معانی لئے ہیں اور انہی کے مطابق "مفہوم القرآن" میں بیان کردہ مفہوم، مندرجہ بالا آیات کے نیچے درج کیا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے حضرت عیسیٰ کے معجزات سے مراد ان کے آسمانی پیغام کی اعجاز نمائی ہے جو

مردوں کی بستی میں صُورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے (قرآن نے اکثر مقامات پر فطرت پر چلنے والوں کو مردے اور آسمانی آواز پر لبتیک کہنے والوں کو زندہ انسان کہا ہے)۔ وہ بے بال و پر، کمزور و ضعیف انسانوں کو بازو سے شاہین عطا کر دیتا ہے (کَمَیْنَتِیَ الطَّیْرِ) جس سے وہ عروج و اقبال کی فضاؤں میں اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ انقلابی پیغام، ان نیم مردہ (لیکن زندگی کی آرزو رکھنے والوں) سے علانیہ کہتا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشب پرے داری

بسا من باتو آموزم طریق شاہبازی را

وہ آنکھوں پر سے جہل و تعصب کے ظلمت انگیز پردے اٹھا کر نور بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ ان کے قلوب کے امراض کو شفا بخشتا ہے اور اس طرح ایک پیکر آب و گل کو جیتے جاگتے، تندرست و توانا انسان کی شگفتہ و شاداب صورت عطا کر دیتا ہے۔

باقی رہا وَ اُنْتُمْ کُمْ بِمَا تَا کُلُوْنَ وَ مَا سَدَّ جُرُوْنٌ فِیْ بُیُوْتِکُمْ (۳/۴۸) اس سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ احکامِ خداوندی بیان کروں گا جن سے واضح ہو

لے قرآن کریم میں قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ کو ”زندگی“ اور ان کی تباہ حالی کو ”موت“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور رسولوں کی بعثت اس موت کو زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۷۲۴)

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔

اے جن لوگوں میں کوئی معصومی نقص ہوتا یہودی انہیں ناپاک تصور کیا کرتے تھے اور انہیں مذہبی رسومات میں شریک ہونے اور قربان گاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں دیتے تھے (دیکھئے احبار ۲۴-۲۱/۱۷)۔ اسی طرح برص کے مریضوں کو بھی ناپاک تصور کیا جاتا تھا (احبار ۱۳-۱۱)۔ حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کی ان خود ساختہ پابندیوں کی مخالفت کی تاکہ اس قسم کے مریض پھر سے انسانوں کے زمرہ میں شمار ہونے لگ جائیں۔ اس صورت میں مریضوں کی شفا یابی سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے۔

جائے کہ کن کن چیزوں کا ذخیرہ رکھنا جائز ہے اور کون کونسی چیزیں ایسی ہیں جن میں احتکار و اکتناز جائز نہیں۔

یہ تو رہا قرآن کے متبعین کا مسلک جہاں تک مغرب کے عیسائی مؤرخین اور مفکرین کا تعلق ہے، وہ بیماروں سے متعلق معجزات کو علاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً رینان اس باب میں لکھتا ہے:-

سمازیہ میں جو اس مقام سے جہاں (حضرت) عیسیٰ رہتے تھے تھوڑے سے فاصلہ پر تھا ایک جادوگر رہتا تھا جس کا نام سائمن تھا۔ اس نے اپنی شعبہ بازیوں سے (لوگوں کی نگاہوں میں) قریب قریب الوہیت کا مقام حاصل کر رکھا تھا۔ (ص ۱۸۹)

اس سے رینان کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں سحر و عملیات کا کتنا چرچا تھا۔ پھر وہ لکھتا ہے:-

قریب قریب وہ تمام معجزات جن کے متعلق (حضرت) عیسیٰ نے خیال کیا کہ آپ سے سزد ہوئے ہیں، امراض کے علاج سے متعلق تھے۔ اُس زمانے میں جیسا کہ آج بھی مشرق میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، علاج الامراض کوئی سائنٹفک شے متصور نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسا خیال کیا جاتا تھا گویا کہ وہ علاج کرنے والے کا ذاتی الہام ہے۔ سائنٹفک طریق علاج جسے

پانچ سو سال پیش تریونانیوں نے ایجاد کیا تھا، اس زمانے میں فلسطین کے یہودی اس سے واقف نہ تھے۔ ان حالات کے ماتحت کسی بزرگ انسان کا مریضوں کے ساتھ شفقت

سے پیش آنا اور انہیں ان کی صحت کا یقین دلادینا واقعی صحت کا موجب بن جاتا تھا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خاص خاص زخموں کو چھوڑ کر، عام امراض میں کسی بزرگ انسان

کا مریض کو چھو دینا، بڑی بڑی دوائیوں جیسا کام کر دیتا ہے، کسی مقدس ہستی کی طرف تو دیکھ لینا ہی شفا بخش دیتا ہے۔ اس کا تو تبسم ہی امید افزا اور زندگی بخش ہوتا ہے.....

..... جب امراض کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ گناہوں کا نتیجہ ہیں یا بدردحوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں (اور طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہیں) تو بہترین طبیب وہ مقدس انسان ہوتا

ہے جس کا تعلق عالم بالا سے ہو۔ (اس زمانے میں) مرگی یا اسی قسم کی اعصابی بیماریاں بدردحوں کی وجہ سے تصور کی جاتی تھیں..... ان حالات میں ہمدردی کے چند جملے

بدروح کو نکال دینے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ (حضرت) عیسیٰ انہی طریقوں سے ایسے

بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ (صفحہ ۱۹۰-۱۹۲)

اس کے بعد رینان لکھتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ سے آپ کے مخالفین کسی معجزہ کا مطالبہ کرتے تو آپ اس سے بہ شدت انکار کر دیا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ ”یہ آپ کے شاگردوں کے اضافے ہیں جو اپنے آقا کی صحیح عظمت کا اندازہ نہ لگا سکے اور اسے اس قسم کی چیزوں سے بڑھانا چڑھانا شروع کر دیا۔“ (ص ۱۹۲) اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ آپ کی صحیح عظمت اس انقلابِ عظیم کے اندر پوشیدہ تھی جو آپ کی وجہ سے رونما ہوا۔ یہ وہ انقلاب تھا جسے کوئی جادو گریا عامل وجود میں نہیں لاسکتا۔

کوئی شعبہ باز، رنگ سائنس، وہ اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا جو (حضرت عیسیٰ نے پیدا کیا۔ (صفحہ ۱۹۵)

اسی طرح E.A. MICKLEM نے اپنی کتاب MIRACLES AND THE NEW PSYCHOLOGY

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ جن بیماریوں کا علاج، معجزانہ انداز سے کرتے تھے وہ دراصل PSYCHOTHERAPY ”نفسیاتی طریق علاج“ تھا جو اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک فی الواقع معجزہ تھا۔

اگر یہ طریق علاج نفسیاتی ہی تھا تو اس باب میں ہمارا (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا) عقیدہ ہے کہ اس کے متعلق نہ تو (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ خود کسی غلط فہمی کا شکار ہوں گے کہ وہ اسے معجزہ سمجھتے ہوں اور نہ ہی کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہوں۔ خدا کا رسول، علم اور کیرٹروولوں اعتباراً اسے اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ اپنے متعلق نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کبھی غلط بیانی کرتا ہے۔

(۷۰)

بہر کیف، حضرت عیسیٰ تشریف لائے اور باہمہ جلال و جمال جلوہ افروز محفل ہوئے۔ ان کے آنگینہ سمدی میں زندگی کے تمام سامان موجود تھے لیکن شفا تو اسی مریض کو مل سکتی تھی جو دوائی کا استعمال کرے اور طبیب کی ہدایات پر کاربند ہو۔ جو بیمار طبیبِ مشفق کو دشمنِ جاں اور اس کی دوا کو سامانِ ہلاکت سمجھے اسے بھلا کس طرح شفا نصیب ہو سکتی ہے؟ یہ یہودی حضرت موسیٰ کے زمانے کے بنی اسرائیل نہ تھے کہ

ہر چند اُن سے بچپن کی سی حماقتیں سرزد ہوتی تھیں لیکن دل میں ہنوز کسی کا خوف اور جذبہ تعظیم باقی تھا جس کی وجہ سے وہ دوائی بھی پی لیتے تھے اور (کم از کم) آنکھوں کے سامنے پرہیز بھی کرتے تھے۔ لیکن اب تو ان میں سرکشی و عدوان اور ضد اور تعصب اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور اس کا سبب تھے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے اپنی "خدائی" کی مسندیں بچھا رکھی تھیں اور جن کی وجہ سے قوم کے مزاج خانقاہی میں اس قدر سختگی اور ان کی خوئے اسلاف پرستی میں ایسی محکمہ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مسلک سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ بغور دیکھئے تو یہودیوں کی اُس وقت کی حالت اُن کی اسارتِ بابل کے زمانے کی حالت سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ وہ ایک آنے والے نجات دہندہ کے ہمہ تن چشم منتظر تھے۔ لیکن چونکہ تعلیم خداوندی پر عمل پیرا ہونے سے ان کی اپنی "خدائی" چھنتی تھی اس لئے علماء و مشائخ کے اس رہزنیوں کے گروہ نے حضرت عیسیٰ کی سخت مخالفت کی اور اس جوش مخالفت میں ان حروبوں پر اُتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں "برہمنیت" پیدا ہو جائے تو مذہبی سطوت و اقتدار کے "خداوند" اپنی مسانیدِ عظمت و عقیدت کو برقرار رکھنے کے لئے جو کچھ بھی کر گزریں کم ہے۔ انجیل برنا باس کا جو اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے اُسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان علماء

علماء کی مخالفت

یہود کی مخالفت کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے جب ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

(فصل ۱۴۲)

کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت بے حجابانہ سامنے آجائے گی کہ اس کی غلامی و محکومی کی زنجیریں پچھتے سے پختہ تر کرنے کے لئے اُن کے پُر فریب خانقاہ نشینوں اور مسانیدِ علم و ارشاد پر بخود غلط ممکن گزینیوں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے؟ جس قدر بھیانک جرائم ان گوشوں سے نمودار ہوتے ہیں، دنیا کے کسی اور گوشے سے باید و شاید۔ اجبار و رہبانِ یہود کی اس تمام سازش اور غداری کو دیکھ کر ان کے ایم نے ایک جامع لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے: جہاں فرمایا کہ وَ مَكَرُوا وَ مَكَرَ اللَّهُ ط وَ اللَّهُ

خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (۳/۵۴) انہوں نے ایک چال سوچی، ایک خفیہ تدبیر کی۔ یہ فریب کاری کی چال اور غدارانہ تدبیر کیا تھی؟ یہی کہ حکومت کو حضرت عیسیٰ کے خلاف مشتعل کر دیا جائے اور یوں اس ”خطہ“ سے حفاظت کا سامان پیدا کر لیا جائے! یا للعجب!! مستی کی انجیل میں ہے۔

اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کا ٹھکانا سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہو گئے اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔

ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بولا ہو جائے (متی ۳-۵/۲۶)

اس کے بعد ہے۔

سنگین سازش

اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوواہ اسکر لوتی تھا سردار کاہنوں کے پاس جا کر کہا تھا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالے کر ادوں تو مجھے کیا دو گے؟ انہوں نے اسے تیس روپے تول کر دے دیئے اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑ والے

کا موقع ڈھونڈنے لگا (متی ۱۳-۱۶/۲۶)

پھر ذرا آگے چل کر مذکور ہے کہ

اور یسوع کے پکڑنے والے اس کو کا ٹھکانا سردار کاہن کے پاس لے گئے جہاں فقیہ اور بزرگ جمع ہو گئے تھے اور پطرس فاصلے پر اُس کے پیچھے پیچھے سردار کاہن کے دیوان خانے تک گیا اور اندر جا کر پیادوں کے ساتھ نتیجہ دیکھنے کو بیٹھ گیا اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے مگر نہ پانی گواہیت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آکر کہا کہ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس میکل کو ڈھاسکتا اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں اور سردار کاہن نے اسے کھڑے ہو کر کہا۔ تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے یسوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی ذہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے اس پر سردار کاہن

نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا جبت رہی؟ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے مُنہ پر تھوکا اور اُس کے منگے مارے اور بعض نے ٹپا پٹھے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا

(متی ۵۷ — ۲۶/۶۸)

چنانچہ

جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے ارڈالین اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلطس حاکم کے حوالے کیا۔

(متی ۱ — ۲۶/۲)

اس کے بعد حسب بیان اناجیل، حضرت مسیح کو رومی حاکم (پیلطس) کی عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں سے یہودیوں کے زور دینے پر فتوائے موت صادر ہوا اور یوں بنی اسرائیل کی اس شوریدہ تخت قوم نے اپنی آخری تباہی اور بربادی کے لئے خدا کے غضب و عتاب کو خود اپنے ہاں دعوت دی اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھودی۔

اس کے بعد واقعہ تصلیب کے متعلق، اناجیل کے بیانات شروع میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے، اس لئے کہ اب ہم قرآن کریم کی روشنی میں خود اس منزل تک آپہنچے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں صلیب کی موت لعنتی موت خیال کی جاتی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوش تھے کہ انہوں نے اپنی آتش انتقام کو خوب ٹھنڈا کیا۔ عیسائی خود اس کے معترف تھے (اور ہیں) کہ حضرت عیسیٰ کو واقعی سولی پر چڑھایا گیا اور انہوں نے وہیں جان دی۔ اس کے بعد آپ کو یوسف والے باغ میں دفن کیا گیا جہاں سے آپ تیسرے دن جی اُٹھے اور شاگردوں سے پسند و نصائح کرنے

لے یہودیوں کی صدر عدالت کو سزائے موت کے علاوہ ہر قسم کی سزا دینے کی اجازت تھی۔ سزائے موت کے لئے انہیں

کے بعد اٹھائے گئے اور (ان کے عقیدہ کے مطابق) یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ خدا (یا خدا کا اکلوتا بیٹا) اپنی قربانی سے نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ چنانچہ پوئیس کے خط بنام گلیتیون میں مذکور ہے۔

کیونکہ جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ لکھا ہے کہ جس نے اُن پر عمل کیا وہ ان کے سبب سے جیتا رہے گا۔ مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے تاکہ مسیح یسوع میں ابرہام کی برکت غیر قوموں تک بھی پہنچے اور ہم ایمان کے وسیلے سے اس روح کو حاصل کریں جس کا وعدہ ہوا ہے۔ (گلیتیون ۱۰-۱۴/۳)

(واضح رہے کہ کفار کا عقیدہ رومن کیتھولک تک ہی محدود نہیں۔ عیسائیوں کا (ظاہر معقولیت پسند فرقہ) پروٹسٹنٹ بھی اس باب میں رومن کیتھولک جیسے متشدد فرقے سے پیچھے نہیں۔ اس فرقہ کے بانی لوتھر کا یہ قول مشہور ہے کہ

SIN HARD, BUT BELIVE HARDER

”خوب گناہ کرو لیکن اس کے ساتھ (کفارہ پر) ایمان کو اور مضبوط کرتے جاؤ۔“

بحوالہ CHAVERI - 416

لیکن ہم نے دیگر ناجیل کی بیان کردہ تفصیلات کے ساتھ انجیل بزنا باس کا بیان بھی دیکھا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی گرفتاری سے پہلے ہی (بتائید خداوندی) محفوظ نکال لئے گئے اور آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے۔ یہودیوں کو اس باب میں سخت اشتباہ ہوا۔ انہوں نے یہوداہ اسکر یوتی کو جو سازش کر کے حضرت مسیحؑ کی نشاندہی کے لئے آیا تھا خود مسیح سمجھ کر گرفتار کیا اور یہی یہوداہ تھا جسے صلیب دی گئی۔ شاگردوں نے تیسرے دن (اور بعض روایات کے مطابق اُسی رات) اس کی لاش کو چڑھالیا اور عوام میں مشہور کر دیا کہ حضرت مسیحؑ جی اٹھے اور آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ آسمان سے

نازل ہوئے اور شاگردوں سے وعظ نصیحت کے بعد پھر آسمان پر واپس چلے گئے۔ (یہ انجیل بربا کس کی تفصیل کا خلاصہ ہے)۔

یہ ہیں اس واقعہ کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے بیانات و عقائد جو ظاہر ہے کہ افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ لیکن اگر ہم تبدیلِ مشن کی روشنی میں تلاشِ حقیقت کے لئے نکلیں تو اصل واقعہ کے خطوط

شرآنی تفصیل | افراط و تفریط کی اس کہکشاں کو کھر کھرا کر سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن کریم نے سب سے پہلے ایک اصولی چیز بیان فرمائی ہے کہ اس اختصار سے تمام تفصیل جزئیات محصور ہو گئی ہیں۔

وَ مَكْرُؤًا ۚ وَ مَكَرَ اللّٰهُ ۚ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝ (۲/۵۴)

اور پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے (مسیح کے خلاف) مکر کیا (یعنی مخفی اور باریک طریقے مخالفت کے کام میں لئے) اور خدا بھی ویسے ہی طریقے کام میں لایا (یعنی مسیح کی حفاظت کے پوشیدہ اسباب و ذرائع پیدا کر دیئے) اور یاد رکھو! اللہ جسے پہچانا چاہئے تو (مخفی طریقوں سے کام لینے والوں میں اُس سے بہتر کوئی نہیں)!

یعنی یہودیوں کی تدبیر یہ تھی کہ حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے رومیوں کے ہاتھوں صلیب پر لٹکوا دیا جائے لیکن اللہ اُن کی اس تدبیر سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اپنے اس برگزیدہ رسول کو اس "لعنتی موت" سے بچانے کی خود تدبیر کر رکھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے مقابلہ میں خدائی تدبیر ہمیشہ کامیاب ہوگی۔ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝

یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا اور اس طرح وہ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ ۚ وَ لَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اِتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ (۴/۱۵۷)

اور (یہ) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا تھا

(سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ذلت کی موت مارا۔ بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی (یعنی صورت حال ایسی ہو گئی کہ انہوں نے سمجھا، ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں تھا) اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا (یعنی عیسائیوں نے جو کہتے ہیں مسیح مصلوب ہوئے لیکن اس کے بعد زندہ ہو گئے) تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں اُن کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں اور یقیناً انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔

انہوں نے یقیناً نہ حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا۔ پھر ہوا کیا؟ وَلَیْسَ عَنْ شُبَّهٍ لَهُمْ (انہیں اس باب میں سخت اشتباہ ہو گیا)۔ بس اس ٹکڑے کے اندر اصل واقعہ نقاب اوڑھے مسکرا رہا ہے۔ اس کے متعلق یہود و نصاریٰ جو طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، وہ محض ظن و تخمین ہے، علم و حقیقت نہیں۔ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتَّبَاعَ الظَّنِّ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔ اس لئے یہ دعویٰ کہ وہ (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے سرتاسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بکمال حکمت و تدبیر حضرت مسیح کو یہودیوں کی مشوم چال سے محفوظ رکھا اور لعنتی کی موت کے بجائے، عزت و تکریم کی ان انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا جو ایک رسول کا صحیح مقام ہے۔ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ (۱۵۸/۴)۔ اُن تک یہودیوں کا ہاتھ پہنچنے ہی نہیں دیا۔ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَءِیْلَ عَنْكَ اِذْ جَعَلْتَهُمْ بِالْبَيْتِ (۵/۱۱) اور اس کے متعلق حضرت عیسیٰ کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

اِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِیْسَى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِلَیْ یَوْمِ الْقِیَمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَلَحْكُمْ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلَفُوْنَ ۝ (۵۴/۳)

(ان کی آخری تدبیر یہ تھی کہ عیسیٰ کو گرفتار کر کے صلیب پر لٹکا دیا جائے اور اس طرح اسے، بزعیم خویش، ذلت و رسوائی کی موت مار دیا جائے) خدا نے عیسیٰ سے کہہ دیا

کہ تم اطمینان رکھو۔ ان کی یہ سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی — تم اپنی طبعی موت مرو گے۔ میری طرف سے تمہارے مدارج بلند ہوں گے۔ میں تمہیں ان مخالفین کی دسترس سے بہت دُور لے جاؤں گا اور جو الزامات یہ تمہارے خلاف تراشتے ہیں، ان سے تمہاری بریت کروں گا۔ (اس وقت تمہاری جماعت کے افراد کمزور نظر آتے ہیں، لیکن آخر الامر میں ان لوگوں کو جو تیرا اتباع کریں گے، ہمیشہ کے لئے ان پر فوقیت دوں گا جو تیرا انکار کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! اس قسم کی کشمکش کے فیصلے، لوگوں کی اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ ہمارے قانون مکافات کی رُو سے ہوتے ہیں جس کی طرف ہر ایک کھینچے چلا آ رہا ہے، جس کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔

ان تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت عیسیٰ نہیں تھے بلکہ ان لوگوں پر حقیقت حال مشتبہ ہو گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ گرفتاری سے پہلے ہی محفوظ کر دیئے گئے تھے اور اس بنا پر انجیل پر نابال کا بیان (اس کے بعض حصوں کو چھوڑ کر) زیادہ قابل اعتماد

آپ گرفتاری نہیں ہوئے

نظر آتا ہے کیونکہ وہ قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی سازش کا علم ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ بحکم خداوندی خاموشی سے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔ اور آپ کے شاگردوں کو اس حقیقت کا علم تھا۔ قرآن کریم نے فقہ سیول کی اس جماعت کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں معلوم ہو کہ مسیح موعود حضرت مسیح کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزائے موت دی جائے گی اور اس پر بھی وہ نہ صرف خاموش بیٹھے رہیں بلکہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ایک رسول کی معیت میں اس کے صحیح متبعین کی جماعت کی روح کس قدر بلند ہوتی ہے اس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے؟ اگر ضرورت پڑے تو وہ دنیا کی اس محبوب ترین شخصیت کی حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں اور اس میں عشرت دوام محسوس کریں۔ وہ اپنے آپ کو حوالہ دار و رسن کر دیں، لیکن اسے خراش تک نہ آنے دیں۔ لہذا اسے تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا کہ حواری حضرت عیسیٰ کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اصل صورت حال یونہی دکھائی دیتی ہے کہ حواریوں کو معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ تشریف لے جا چکے ہیں اور جس شخص کو گرفتار

کیا جا رہا ہے کوئی اور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدائیوں کی اس جماعت نے باہمی مشورہ سے خود اپنے میں سے ایک سچے جاں باز کو تیار کر رکھا ہو کہ وہ حضرت مسیحؑ کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو یہوداہ کی سرخ دہی کے بعد (جو خود اس تدبیر کا ایک جزو ہو سکتی ہے) گرفتار کرادے تاکہ دشمن حضرت مسیحؑ کی تلاش میں سعی و کاوش نہ کریں۔ اس کے بعد انہوں نے کاوش کی ہوگی کہ عام قاعدہ کے مطابق (جیسا کہ اناجیل میں مذکور ہے) اُس گرفتار شدہ کی ہڈیاں صلیب پر نہ توڑی جائیں۔ اس لئے کہ اناجیل کی تفصیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلوب نے صلیب پر جان نہیں دی نہ اس کی ہڈیاں توڑی گئیں نہ دوسرے مصلوب مجرموں کے ساتھ لے دفن کیا گیا۔ اُسے جمعہ کی دوپہر (۳ اپریل ۳۳ء) کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ صلیب، پھانسی کی طرح ایک جھٹکے میں جان نہیں لے لیتی تھی بلکہ اس کی صعوبت اور تکلیف سے کئی روز کے بعد موت واقع ہوتی تھی۔ جمعہ کی سہ پہر کے بعد دو تین گھنٹہ کا وقفہ گزرا تھا کہ سبت (ہفتہ) کی شام شروع ہو گئی۔ ایک تو یہودی شریعت کے مطابق سبت تعطیل کا دن تھا۔ دوسرے وہ (۳ اپریل والا) سبت ان کے ایک عظیم الشان سالانہ یوم بار کا دن تھا (رینان ص ۲۹۲)۔ اس لئے شام سے پہلے ہی اس مصلوب کو بغیر ہڈیاں توڑے صلیب سے اتار کر یوسف نامی ایک دولت مند شخص کے سپرد کر دیا گیا (جو یا تو حضرت مسیحؑ کا متبع تھا یا آپ کے مشن سے ہمدردی رکھتا تھا)۔ حواریوں نے خفیہ خفیہ یوسف کے باغ میں اس کا علاج کیا اور تیسرے دن (اتوار کے روز) اسے ساتھ لے کر چل دیئے

یہ کوائف شاہد ہیں کہ نہ حضرت مسیحؑ گرفتار ہوئے اور نہ آپ کو صلیب دی گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اناجیل کے بیانات کہ جسے صلیب دی گئی (اور جسے عیسائی اب تک حضرت مسیحؑ ہی خیال کرتے چلے آ رہے ہیں) بُری طرح صلیب پر چنچا اور چلتا یا اور اس نے کہا کہ ایلیم ایلیم لما شبقتنی (متی ۲۶/۴۶) ”اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا“ کیا معنی رکھتے ہیں؟ یہ کچھ کہنے والا کبھی مسیح

نے صلیب کیا تھی؟ اس قسم (+) کی لکڑی زمین میں عکار کر متوازی لکڑی کے ساتھ مجرم کے بازو پھیلا دیئے جاتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں میخیں مٹھونک کر اسے اس لکڑی سے لٹکادیا جاتا تھا۔ وہ اس تکلیف سے قریب قریب بے ہوش ہو جاتا اور اس کے بعد بھوکا پیاس، گرمی وغیرہ کی شدت اور کوفت سے سسک سسک اور گھل گھل کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب سے اتارتے وقت عام طور پر اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔

نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول سے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کی مصیبت اور آزمائش میں ایسا پست ہمت اور بے وثاقت ہو اور اس قسم کے کلمات زبان پر لے آئے جنہیں عام عزم و ہمت اور حوصلہ و استقلال کے انسان کی غیرت بھی گوارا نہ کرے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا کے رسول، شرف انسانیت اور استحکام خودی کی کن بلندیوں پر جلوہ بار ہوتے ہیں۔ وہ بھلا موت سے کیا ڈریں گے جبکہ موت ان کے نزدیک ایک ابدی زندگی کا دروازہ ہو! اس لئے یہ کچھ کہنے والا مسیح نہیں تھا۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ لَوْ كُنْهُمْ بِحَقِيقَتِ حَالِ مُشْتَبِهٍ ہو گئی تھی۔

تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات سے جوں جوں حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں، مشہدِ انِ کریم کے اس دعوے کی صداقت کے مزید ثبوت فراہم ہوتے چلے جاتے ہیں کہ جو شخص صلیب دیا گیا تھا، وہ حضرت عیسیٰ نہیں تھے، ان کے مشابہ کوئی اور شخص تھا۔

Marcello Graveri جس کی کتاب THE LIFE OF JESUS کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے

اس سلسلہ میں (متعدد حوالوں کی رُو سے) لکھا ہے کہ جب رومی سپاہی (حضرت) عیسیٰ کو کشاں کشاں سوئے دار لے جا رہے تھے تو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے آپ سے وہ شہتیر اٹھائے نہیں جاتے تھے۔ جنہیں گاڑ کر صلیب بنانا مقصود تھا۔ راستے میں (Simon) نامی ایک شخص ملا جو کھیتوں میں کام کاج کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ رومن سپاہیوں نے اسے بیگار میں پکڑا اور کہا کہ وہ ان شہتیروں کو اٹھا کر ساتھ چلے۔ چنانچہ اس نے شہتیر اٹھالئے تو (حضرت) عیسیٰ نے ایسا کیا کہ خود سامن کی شکل اختیار کر لی اور سامن (حضرت) عیسیٰ کا ہم شکل ہو گیا۔ چنانچہ سامن کو اچھتے چلاتے، سولی پر چڑھا دیا گیا اور (حضرت) عیسیٰ سامن بنے، صلیب کے نیچے کھڑے مسکراتے رہے (صفحہ ۳۹۵) آپ نے دیکھا کہ قرآن کے بیان — وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ — کی کیا کیا تشریحات سامنے آرہی ہیں۔

بہر حال حضرت مسیحؑ نے ان حالات میں فلسطین سے ہجرت کر لی (جس طرح رات کی ہجرت تاریکی اور خاموشی میں حضور نبی اکرمؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی) اور کسی دوسری طرف تشریف لے گئے۔ یہ اسی قسم کی ہجرت تھی جسے ہم 'اتمامِ حجت کے بعد' انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف میں دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ وغیرہم (علیہم السلام) نے اسی طرح ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض انبیائے عظام کے بعد از ہجر

واقعات زندگی کے متعلق مُشرِّقِ کریم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر وہ ہیں (حضرت ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ علیہم السلام) جن کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق مُشرِّقِ کریم نے کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ کسی رسول (یا قوم) کی پیدائش سے وفات (یا ابتدا سے انتہا) تک کے تمام واقعات بیان کرے۔ وہ ان واقعات میں سے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کرتا ہے جسے وہ مقصد پیش نظر کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق بھی مُشرِّقِ کریم نے کچھ نہیں بتایا۔

وفات | تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مُشرِّقِ کریم نے کس طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال اور باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا تھا۔ باقی رہا عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھالے گئے تھے، تو قرآن سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دوسرے رسولوں کی طرح اپنی مدتِ عمر پوری کرنے کے بعد وفات پائی۔ سورہ آل عمران کی جو آیت اوپر درج کی جا چکی ہے اس میں وفات کا ذکر صاف طور پر موجود ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَ رَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ
مِنَ الذِّنِّينَ كَفَرُوا (۳/۵۴)

جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا "اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا (وفات دے دوں گا) اور تجھے (یعنی تیرے درجات کو) اپنی طرف بلند کروں گا۔ تیرے مخالفین (کی ہمتوں) سے پاک کر دوں گا۔"

سورہ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیری اور تیری والدہ کی پرستش کیا کریں۔ وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ معاذ اللہ! میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ باقی رہے یہ لوگ (میرے متبعین)، سو کُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۖ (۵/۱۱۴) جب تک میں ان میں موجود رہا، میں ان کی نگرانی کرتا رہا (کہ اس قسم کے مشرکانہ عقائد ان میں پیدا نہ ہوں)

لیکن جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو اس کے بعد ان کا نگران تُو ہی ہو سکتا تھا (میں نہیں)۔
علاوہ ازیں قرآن کریم کے اکثر مقامات سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرام میں سے کسی کو خلود اور
زندگی دوام حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ
الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ رَٰوِعِلْمُونَ ۝ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا
يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ۝ (۲۱/۸ — ۷)

اور اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اسی طرح کہ آدمی تھے۔
ان پر ہماری وحی اُترتی تھی۔ پھر اے گروہ منکرین! اگر تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو ان لوگوں
سے پوچھ کر معلوم کر جو اہل کتاب ہیں۔ اور ہم نے ان پیغمبروں کو کبھی ایسے جسم کا نہیں بنایا
کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِشَرٍّ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَأَنْتَ مِتَّ فَهُمْ
الْخُلْدُونَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَٰئِقَةُ الْمَوْتِ ۖ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ
وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ۝ (۲۱/۳۵ — ۳۴)

اور اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پہلے کسی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ
زندہ رہنا ہے)۔ پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں؟ ہر جان
کے لئے موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تمہیں (زندگی کی) اچھی بُری حالتوں سے نمود و ذات
کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں اور پھر (بالآخر) تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے!

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ
أَفَأَنْتَ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۖ وَ مَن
يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنُيَضِّرَنَّ اللَّهُ شَيْئًا ۖ وَ سَيَجْزِي

اللَّهُ الشَّكْرُ ۝ (۳/۱۴۳)

اور محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور راہِ حق کی دعوت دے کر دنیا سے چلے گئے)۔ پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پائیں (اور بہر حال انہیں ایک دن وفات پانا ہے) یا (فرض کرو) ایسا ہو کہ قتل ہو جائیں، تو کیا تم اُلٹھاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے (اور ان کے مرنے کے ساتھ ہی تمہاری حق پرستی بھی ختم ہو جائے گی)؟ اور جو کوئی راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا، تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جو لوگ شکر گزار ہیں (یعنی نعمتِ حق کی قدر دانی کرنے والے ہیں) تو قریب ہے کہ خدا انہیں ان کا اجر عطا فرماتے!

اسی قسم کا فقرہ حضرت مسیحؑ کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ
وَ أُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ
لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ اُنْظُرْ آتَىٰ يَوْمُ فَكُونُونَ ۝ (۵/۷۵)

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کتنے رسول (اپنے وقتوں میں) گزر چکے۔ اور اس کی ماں (بھی) اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ صدیقہ تھی (یعنی بڑی ہی راست باز تھی)۔ یہ دونوں (تمام انسانوں کی طرح) کھاتے پیتے تھے (یعنی غذا کی احتیاج رکھتے تھے) اور ظاہر ہے کہ جسے زندہ رہنے کے لئے غذا کی احتیاج ہو، اس میں ماوراء بشریت کوئی بات کیونکر ہو سکتی ہے۔ دیکھو، کس طرح ہم ان لوگوں کے لئے دلیلیں واضح کرتے ہیں۔ اور پھر دیکھو، کس طرف کو یہ لوگ پھرے ہوئے جا رہے ہیں؟ (کہ اتنی موٹی سی بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟)۔

جو شخص ان تصریحات پر خالی الذہن ہو کر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ نزولِ قرآن کے وقت حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم کی آیات سے نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس، آپ کے ”گذر جانے“ اور وفات پانے کی شہادتِ قرآن میں

وفات کے معنی

شَهِيدًا ۱ مَا دُمْتُ فِيهِمْ۔ (جب تک میں ان میں زندہ موجود تھا میں ان پر نگران تھا) اس میں ”مَا دُمْتُ فِيهِمْ“ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ارباب قوم کے استفسار کے جواب میں فرمایا وَ اَوْصِنِي بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (۱۹/۳۱) کہ اللہ نے مجھے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دے رکھا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔ آیت کے آخری الفاظ (مَا دُمْتُ حَيًّا) اپنی تفسیر آپ کر رہے ہیں۔ اسی سورہ میں حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ سَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

(۱۹/۱۵)

اور اس پر سلامتی ہے (اس کی) پیدائش کے دن (سے) موت کے دن (تک) اور جس دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا۔

یہی الفاظ (محمود اور آگے چل کر) حضرت عیسیٰ کے متعلق آتے ہیں۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی يَوْمِ وُلْدِهِ وَ يَوْمِ امُوتِهِ وَ يَوْمِ اُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۱۹/۳۳)

اور مجھ پر سلامتی ہے میری پیدائش کے دن سے موت کے دن تک اور جس دن مجھے زندہ اٹھایا جائے گا۔

ان آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اس دنیا میں اپنی طبعی زندگی تک رہے۔

∴

فشرآن کریم میں دو ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تو فی کے معنی موت دینے کے نہیں ہیں بلکہ

سورۃ النعام میں ہے۔

وَ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ

(۶/۶۰)

اور (دیکھو) وہی ہے جو رات کے وقت تم کو ”وفات دے دیتا ہے“ (یعنی سلا دیتا ہے)

اور جو کچھ تم نے دن (کی حرکت و ہوسخاری) میں کد و کاوش کی تھی اس سے بے خبر نہیں ہے۔

پھر جب رات بھر سو لیتے ہو تو دن کے وقت تمہیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ (بدستور کہ دو کاوش میں لگ جاؤ اور زندگی کی مقدرہ میعاد پوری ہو جائے۔

اس کی تفسیر سورۃ زمر میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَاجِلِهَا
فِي مَسْكِ الْأَتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الرُّوحَ إِلَىٰ أَجَلٍ
مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ٥ (۳۹/۴۲)

اور دیکھو اللہ "نفوس" کو (دو طرح پر) وفات دیتا ہے (ایک تو) اُن کی موت کے وقت (اور دوسرے) جو مرے نہیں، ان کی نیند میں۔ پھر انہیں روک رکھتا ہے جن پر موت کا حکم کیا ہوتا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یقیناً اس میں اس قوم کے لئے بڑی ہی نشانی ہے جو غور و فکر کی عادی ہو۔

CONSCIOUS MIND

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں "نفس" کے معنی جان کے نہیں بلکہ نفس شعوریہ (احساس و ادراک) کی قوتوں کو معطل کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ بحالت نیند اور بحالت موت نفس شعوریہ (احساس و ادراک) کی قوتوں کو معطل کر دیتا ہے۔ نیند کی صورت میں تو اس کھوئے ہوئے شعور و ادراک کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے لیکن موت کی صورت میں واپس نہیں لوٹایا جاتا (جب تک پھر دوسری زندگی عطا نہ ہو) اس لئے کہ حالت نیند میں انسان میں سوائے شعور و ادراک کے اور سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ ان معانی کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق سورہ آل عمران اور سورہ مائدہ کی مندرجہ صدر آیات میں توفیٰ کے معنی موت نہیں بلکہ نیند کی سی بے ہوشی کے ہیں اور اس سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ آپ کو صلیب دی گئی لیکن آپ صلیب پر بے ہوش ہو گئے، مرے نہیں۔ اور لوگوں کو سٹبہ ہو گیا کہ آپ مر چکے ہیں (یعنی لوگوں کا وہی خیال جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے دیگر قرآن کے پیش نظر یہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم آپ کے صلیب دیئے جانے کی بصراحت تردید کرتا ہے (وَمَا صَلَبُوكَ)۔ پھر سورہ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت میں واضح الفاظ میں ہے کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت پر گواہ تھا۔ اس کے بعد جب تو نے وفات دے دی تو پھر تو اسی ان کا نگہبان تھا۔" اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں وفات سے مراد نیند کی سی بے ہوشی نہیں بلکہ موت کی بے خبری ہے۔ ورنہ اگر نیند

کی سی بے ہوشی ہوتی تو ہوش میں آ جانے کے بعد پھر وہی پہلی سی (باخبری) کی حالت پیدا ہو جاتی۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ضمن میں قوتی کے معنی وفات پا جانا ہیں، سو جانا نہیں اس کی تائید سورہ الصَّف کی اس مشہور آیت سے بھی واضح ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمُبَشِّرًا بِرُسُولِ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اَسْمَةُ اَحْمَدُ ط (۶۱/۶۱) میں بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا اسم گرامی احمد ہو گا۔ ”میرے بعد“ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اب اسے سورہ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ آپ نے فرمایا کہ ”جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت سے باخبر رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔“ بات صاف ہے کہ اس وفات کے بعد آپ دنیا سے تشریف لے گئے (یعنی وفات پا گئے) اور پھر آپ کے بعد وہ رسول اکرم تشریف لائے جن کی بشارت آپ نے دی تھی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم آپ کے وفات پا جانے کا بصراحت ذکر کرتا ہے۔



رفع الی السماء | اب دیکھئے رفع (آسمان پر چڑھ جانے) کا مفہوم۔ اس کے لئے ایک تو سورہ آل عمران کی اسی آیت کو سامنے رکھتے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے

إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَ رَافِعُكَ إِلَىٰ (۱۵۸/۳) اور دوسرے سورہ نسا کی یہ آیت بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ

(۱۵۸/۳)۔ حضرت عیسیٰ کے رفع کا ذکر انہی دو آیات میں آیا ہے۔

رَفَعَ کے معنی ہیں اُوپر اٹھانا۔ بلند کرنا۔ سورہ رعد میں ہے اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳/۲) ”اللہ وہ ہے جس نے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو“ آسمانی کڑوں کو بلند کیا مثلاً وَ رَفَعْنَا قُوتُكُمُ الطُّورَ (۲/۶۳) ”ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا۔“ حضرت یوسفؑ کے تذکارِ جلیلہ میں ہے وَ رَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (۱۲/۱۰۰)۔ اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا۔ پھر درجات کی بلندی کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے مثلاً وَ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلِيفَتَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (۱۶۶/۹) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے سے درجات میں بلند کیا۔ اور اُس صدر نشین بزم کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ذکر کی بلندی کے لئے بھی (وَرَفَعْنَا

لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴/۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ ان آیات میں رَفَعَ کے ساتھ درجۂ یا ذکر کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن تنہا رَفَعَ کے معنی بھی بلندی درجات و عروج مراتب کے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ كُوْنُ شِدَّةً لِّرَفْعِهِ بِهَآ (۷۱/۷۱) ”اور اگر ہم چاہتے تو ان (قوانین) کے ذریعے ہم اس (کے مقام) کو بلند کر دیتے۔“ یہی وہ ارتفاع درجات و مراتب اور عروج مقامات و مناصب ہے جن کا ذکر حضرت ادریس کے قصہ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹/۵۷) ”اور ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھایا۔“ حضرت ادریس کو ”بڑے اونچے مقام تک اٹھانے کا یہ مفہوم نہیں کہ انہیں بہ جسدِ عنصری اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بلکہ (جیسا کہ عام محاورہ ہے) اس سے ان کے مقام و مدارج کی بلندی مفہوم ہے اور جب اس بلندی مقام کا ذکر اللہ کے عباد صالحین کے متعلق ہوگا تو اس سے مطلب ”قرب الہی“ ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ”قرب الہی“ سے مفہوم یہ نہیں کہ انسان جسمانی طور پر ”اللہ کے قریب“ جا بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی مقصود بلندی مدارج و علو شرفِ انسانیت ہوتا ہے۔ یہی مطلب حضرت عیسیٰ کے تذکرہ میں ”رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ“ (اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کیا) اور ”رَافِعُكَ اِلَیَّ“ (میں تجھے اپنی طرف بلند کروں گا) سے ہے۔ یعنی بلندی مدارج و مراتب۔ مختلف انبیائے کرام کے مختلف مقامات مدارج و مناصب کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ قُلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۲/۲۵۳) ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔“

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اور رَافِعُكَ اِلَیَّ فرمایا گیا ہے (یعنی اللہ نے اپنی طرف بلند کیا) اور اس سے اس امر پر دلیل لائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ لیکن اگر (اِلَيْهِ اور اِلَیَّ سے) یہ مفہوم لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے۔ اس مفہوم سے خود ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے وہ محتاجِ تشبیہ نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جہات و اطراف کی نسبتوں سے بلند اور مکان و زمان کی اضافتوں سے منزہ ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے اور اس کے لئے کسی خاص مقام اور گوشہ کی تعیین یکسر غلط اور اس کی ذات کے متعلق و شرفِ آفی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے جسے ایک ثانیہ کے لئے بھی دل میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے جہاں حضرت عیسیٰ کے متعلق

یہ کہا گیا ہے کہ ”رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ“ تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت یا مقام میں ہے اور حضرت عیسیٰ اس جہت یا مقام (آسمان) کی طرف اٹھائے گئے ہیں۔ البتہ اللہ کی طرف (کالفظ صرف حضرت عیسیٰ کے متعلق ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ متعدد دیگر مقامات پر بھی آیا ہے جہاں سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے ”آسمان کی طرف اٹھالینا“ مراد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اِنَّا بِاللّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط (۲/۱۵۶) ”ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ کسی خاص مقام پر ہے اور ہم اس مقام کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

سورۃ الفرقان کی یہ آیات اس نکتہ کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ فرمایا۔

اَلَمْ نُنزِلْ اِلٰی رَبِّكَ کِتٰبًا مِّمَّا الْفَلَاحُ ۚ وَ لَوْ شَاءَ لَجَعَلْنٰهٗ سٰکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰا الشَّمْسُ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ۝۱ (۲۵/۲۵ - ۲۶)

تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے دراز کیا سایہ کو۔ اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے مقرر کیا سورج کو اس کا راہ بتانے والا۔ پھر کھینچ لیا ہم نے اس کو اپنی طرف
(ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

آپ نے غور کیا کہ اس میں اِلَیْنَا سے مراد کوئی خاص مقام نہیں۔ اور آگے بڑھتے تخلیق انسانی یا ارتقاء کے ضمن [ابلیس و آدم، عنوان ”انسان“] میں سورۃ سجدہ کی وہ عظیم المرتبت آیات درج کی جا چکی ہیں جو تدابیر الہیہ کی ابتداء سے انتہا تک کے تمام ارتقائی مراحل کے متعلق بصیرت افروز حقائق اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی عمودی آیت یہ ہے۔

یٰۤاٰدَمُ اٰوْمُرْ مِنَ السَّمٰوٰتِ اِلَی الْاَرْضِ ۚ ثُمَّ لَیَعْرِجُ اِلَیْهِ فِی یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهَا اَلْفَ مَسْنٰۃً ۚ یٰۤاٰدَمُ اٰوْمُرْ اَنْ تَقُلْ لِّلْطٰۤیْرِ مَا یَحْمِلْنَ ۚ وَ لَیَسْمَعْنَ ۚ وَ لَیَرْکَبْنَ عَلَیْکَ ۚ وَ لَیَکُنَّ لَکَ اٰیٰتٌ ۚ وَ لَیَعْلَمَنَّ اَللّٰهُ مَا تَعْمَلُ ۚ (۲۱/۵)

وہ (اللہ) آسمان (کی بندیوں) سے زمین (کی پستی) کی طرف ایک امر (سیکیم) کی تدبیر کرتا ہے جو (اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی ہے ایسے مراحل سے جن کا عرصہ تہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا ہو۔

”يَعْرِجُ اِلَيْهِ“ وہی ہے جو رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ہے۔ یہاں واضح ہے کہ ”يَعْرِجُ اِلَيْهِ“ اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اسے یہ مفہوم نہیں کہ وہ امور کسی سمت کو (اوپر کی طرف) چڑھ جاتے ہیں بلکہ یہ کہ اپنی ابتدائی منازل سے رفتہ رفتہ بلند ہو کر سچائی تک جا پہنچتے ہیں۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ط (۳۵/۱۰) ”اُسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور عمل صالح اسے بلند کرتا ہے“ یعنی وہ اعمال جن سے انسان میں آگے بڑھنے (ارتقائی منازل طے کرنے) کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے بلند ہو کر اس کی طرف چڑھتے ہیں، یعنی وہ انہیں مقامات بلند عطا کرتا ہے۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں دیکھئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی ہے جس کی تفصیل جوئے نور میں گزر چکی ہے (تفسیر مایا، اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹/۲۶) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں) ”سوہ صفت میں ہے قَالَ اِنِّیْ ذَا هِبْتُ اِلٰی رَبِّیْ سَيِّئُهُنَّ (۳۴/۹۹)“ کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا۔ ان مقامات میں اِلٰی رَبِّیْ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ مطلب بالکل واضح ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے، بلکہ اس طاغوتی ماحول کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف منتقل ہو گئے تھے جہاں انہیں اپنے اللہ کی حفاظت میسر تھی جہاں وہ اس کا نام آزادی سے لے سکتے اور اس کے پیغام کی تکمیل کر سکتے تھے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ يَعْرِجُ اِلَيْهِ اور اِلَيْهِ يَصْعَدُ اور مُهَاجِرٌ و ذَا هِبْتُ اِلٰی رَبِّیْ میں اِلٰی سے مراد کسی خاص مقام کی سمت نہیں بلکہ تکمیل مدارج ہے۔ اسی طرح قصہ حضرت عیسیٰ میں رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں اِلَيْهِ سے مفہوم کوئی خاص سمت نہیں، بلکہ بلند کی مدح ہے۔ اور یہ لفظ ایک خاص مقصد کے پیش نظر استعمال کیا گیا ہے۔ یہودیوں کا زعم باطل تھا کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا جس سے آپ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے تھے لعنت کے معنی ہیں دوری (الغائب خداوندی سے دوری یا محرومی)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ صلیب دیئے ہی نہیں گئے (ما صلبوه) بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے وفات پا گئے (متوفیک) اور انہیں الغائب خداوندی سے دوری نہیں بلکہ قرب حاصل ہے (بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ)۔ اب سورہ آل عمران کے ان الفاظ کو پھر سے سامنے لائیے۔ (اِنِّیْ مُتَوَفِّکَ وَ رَافِعُکَ اِلٰی)

(اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا اور بلند درجات عطا کرنے والا ہوں) وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الذَّنَبِ كَفَرٌ وَ اِيعْنِي تَجْهَانِ كُفَّارِ كَے اُتہامات سے پاک اور صاف کرنے والا ہوں (۳/۵۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر اٹھا لئے جانے کا تصور مذہب عیسائیت میں بعد کی اختراع

یہ تصور بعد کی پیداوار ہے

ہے۔ یہودیوں نے مشہور کر دیا (اور بظاہر نظر بھی ایسا ہی آتا تھا) کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر قتل کر دیا ہے۔ حواریوں کو معلوم تھا کہ حقیقت حال یہ نہیں۔ لیکن وہ بھی بہ تقاضائے مصلحت اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے (اور اصل تو یہ ہے کہ واقعہ تصلیب کے بعد خود حواریوں کے متعلق بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد حالات نے پلٹا دکھایا اور ان کا نام پھر سننے میں آیا اس دوران میں یہ خیال عام ہو چکا اور سچپتگی حاصل کر چکا تھا کہ حضرت مسیحؑ مصلوب ہو چکے ہیں۔ جب حواریوں کو قدرے سکون حاصل ہوا تو انہوں نے مختلف روایات کو یک جا کر کے اناجیل مرتب کیں (سب سے پہلی انجیل ۳۰ء میں مرتب ہوئی تھی)۔ اس وقت یہ کہنا کہ جس شخص کو صلیب وی گئی تھی وہ حضرت مسیحؑ نہیں کوئی اور تھا۔ ایک ایسا دعوے تھا جس کی ہر طرف سے تردید (اسی نہیں بلکہ تضحیک) ہوتی۔ اس لئے اس عام خیال کی تردید کئے بغیر، حضرت مسیحؑ کی عظمت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا جائے کہ وہ صلیب کے تیسرے دن جی اٹھے اور پھر آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ اناجیل میں دیکھئے۔ متی اور یوحنا کی اناجیل میں آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔ مرتس اور توقا میں اخیر میں صرف ایک فقرہ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ "غرض خداوند یسوع ان کلام کرنیکے بعد آسمان پر اٹھایا گیا" (قر ۱۹: ۱۱، وقا ۲۴)۔ حتیٰ کہ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق بھی تمام اناجیل میں صرف مریم مگدالینی ہی عینی شاہد ہے (رینان ص ۲۹۶) اور مریم مگدالینی وہی ہے جس میں سے اناجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ نے سات بدروحوں کو نکالا تھا (متی ۹/۱۶)۔ عیسائیوں نے رَفَعَ اِلَى السَّمَاءِ کا جو عقیدہ پھیلایا اس لئے نہ صرف حضرت مسیحؑ کی عظمت اور بزرگی کو ہی مقام الوہیت تک پہنچا دیا بلکہ شکستہ خاطر افسردہ اور پڑمردہ جماعت کے لئے مایوسیوں کی تاریکی میں اُمید کی ایک کرن بھی پیدا کر دی کہ وہ آئینہ والا آئے گا اور اس کے ساتھ ہی انہیں عظمت و اقتدار کی ایک نئی زندگی عطا کرے گا ("آلے والے" کے عقیدہ کے متعلق "ختم نبوت")

وہ آنے والا! عیسیٰ نے اپنے آنے کے متعلق نہیں بلکہ اُس آنے والے کے متعلق کہا تھا جس کا اسم گرامی احمد تھا۔ گرفتاری سے تھوڑی دیر پہلے (اناجیل کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا۔

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اسلئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ اپنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ کہے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۴ — ۱۶/۷)

اور اس سے ذرا پہلے۔

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع ہی سے میرے ساتھ ہو۔

(یوحنا ۲۶ — ۱۵/۲۷)

حضرت مسیحؑ کی اس پیش گوئی کے متعلق دنیا نے عیسائیت نے مختلف زمانوں میں جس قدر تحریف سے کام لیا ہے اُس کی تفصیل میں اُلجھے بغیر صرف اس ایک چیسٹر اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت ہمارے سامنے ۱۸۳۶ء کا شائع کردہ (انگریزی) بائبل کا "مستند" نسخہ ہے جس میں اس آنے والے کے لئے COMFORTER کا لفظ لکھا ہے اور ۱۹۲۲ء کے اردو ترجمہ میں (جو خود برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا شائع کردہ ہے) اسے "مددگار" لکھا ہے۔ COMFORTER اور "مددگار" میں

جس قدر فرق ہے اس سے انگریزی زبان کا ایک مبتدی بھی واقف ہے۔ اسی سے اندازہ لگایجئے کہ اصل انجیل اور آج کے مروجہ نسخوں میں کس قدر اختلاف ہو چکا ہے۔ چنانچہ انجیل برناباس میں اس آنے والے کا نام تک بھی لکھا ہے اور ایک جگہ نہیں، کم از کم دس جگہ لکھا ہے۔ آخری مرتبہ آپ اپنے شاگردوں سے فرمایا۔

پس جبکہ آدمیوں نے مجھ کو اللہ اور اللہ کا بیٹا کہا تھا۔ مگر یہ کہ میں خود دنیا میں بے گناہ تھا اس لئے اللہ نے ارادہ کیا کہ اس دنیا میں آدمی یہوداہ کی موت سے مجھ سے ٹھٹھا کریں۔ یہ خیال کر کے کہ وہ میں ہی ہوں جو کہ صلیب پر مرا ہوں تاکہ قیامت کے دن میں شیطان مجھ سے ٹھٹھا نہ کریں اور یہ بدنامی اس وقت تک باقی رہے گی جبکہ محمد رسول اللہ آئے گا جو کہ آتے ہی اس فریب کو ان لوگوں پر کھول دے گا جو کہ اللہ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔
(برناباس فصل ۲۲: ۳۰۶)

فَارَقْلِیْط | حضرت عیسیٰ کی زبان ارامی تھی لیکن چونکہ ارامی زبان میں انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں، اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اس آنے والے کے لئے کیا لفظ استعمال کیا تھا۔ یونانی ترجمہ میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے۔ **فَارَقْلِیْط** کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنَیْ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ
اَللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیِّ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا
بِرَسُوْلِ یَآئِیْ مِنْ بَعْدِیْ اَسْمٰءُ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ
بِالْبَیِّنَاتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۶۱/۶)

اور یاد کرو جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں جو اس تورات کے دعاوی کو سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہوں جو میرے سامنے موجود ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے کے لئے آیا ہوں جس کا نام احمد

ہوگا۔ مگر (دیکھو) جب وہ رسول (احمد) واضح دلائل و براہین کے ساتھ آگیا تو یہ لوگ کہنے

لگے کہ وہ تو اپنے دعوائے نبوت میں اصاب صاف صاف جھوٹا ہے۔

یہ ہیں نفا صیل حضرت عیسیٰ کی حیاتِ طیبہ کے آخری مراحل کے متعلق۔ وفاتِ حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر دکھا جائے گا۔

۰۰۰

یہودیوں کی آخری تباہی | حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف 'قانونِ خداوندی کی آخری حجت کے اتمام کے لئے آئے۔ قوم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا

اس کے بعد کونسی چیز باقی رہ گئی تھی جو قانونِ مکافات کی نتیجہ خیزی میں تاخیر کا موجب ہوتی؟ ان کی سرکشی اور معصیت کو شہی، قہرِ الہی کے گرجتے ہوئے بادلوں اور کڑکتی ہوئی بجلیوں کی صورت میں ان کے سر پر آئی جس سے اب نجات کی کوئی راہ نہ تھی۔ باہمی خانہ جنگیوں سے ملک خوشخوار درندوں کا بھٹ بن گیا۔ قتل و غارت گری، سلب و نہب، لوٹ مار زندگی کا عام انداز ہو گیا۔ یہودیوں کو 'ایک آنے والے' کا انتظار تو تھا ہی، ہر فریب کار نے اس عقیدہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان میں کتنے ہی جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کی بد امنی اس درجہ بڑھ گئی کہ اس شورش کو فرو کرنے کے لئے شاہنشاہِ یزد کو ایک خاص جرنیل

قہرانی جرنیل کو بھیجا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

سنہ ۷۰ء اب (یعنی) کی دسویں تاریخ کو، ایسے خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی، سقوطِ یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اور یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کے مطابق واقع ہوا جس کی خبر حضرت عیسیٰ نے پہلے ہی دے رکھی تھی۔

اور یسوع ہیکل سے نکل کر جا رہا تھا کہ اس کے شاگرد اُس کے پاس آئے تاکہ اسے ہیکل کی عمارتیں دکھائیں، اس نے جواب میں اُن سے کہا کیا تم ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا۔

(متی ۱-۲۴/۲)

اس طرح، ڈیڑھ ہزار برس کے گہوارہ عروج و زوال کے بعد، بنی اسرائیل کا نام زندہ قوموں کی فہرست سے مٹ گیا اور خدا کا وہ جلیل القدر عہد جو اس نے اپنے مخلص بندے (حضرت ابراہیمؑ) کے ساتھ کیا تھا، اسرائیل کے گھرانے سے شاخ اسمعیلؑ کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ شاخ جسے حضور **شاخ اسمعیلؑ** خاتم الانبیاءؑ کی شکل میں قیامت تک کے لئے سرسبز و شاداب رہنا تھا۔ کشتیِ طیبۃً اُصلُہا ثابتٌ وَّ خَرَعُہا فی السَّمَاءِ (۱۴/۲۳) اس شجر مقدس کی طرح جس کی جڑیں پتال میں ہوں اور شاخیں جھوم جھوم کر آسمان کی پیشانی چوم رہی ہوں۔ اس آنے والے انقلاب کی خبر بھی حضرت عیسیٰؑ نے دیدی تھی جب آپ نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں فرمایا تھا۔

ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگریزی باغ لگایا اور اس کے چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور بُرج بنایا اور اُسے باغبانوں کو بیٹیکے پر دیکر پر دیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لینے کو بھیجا اور باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو بیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر باغ سے نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا انہوں نے اُس سے کہا اُن بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ دھکر باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں یہ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی پڑھا کہ

”جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کوٹنے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف

سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے“

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اُس کے پھل لائے دیدی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے

ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا
اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اُس سے تمثیلیں سنیں تو سمجھ گئے کہ ہمارے
حق میں کہتا ہے ؟ (متی ۲۳-۲۵/۲۱)

اسی الساعۃ کی نشانی حضرت عیسیٰ تھے | اور یہ انقلاب بنی اسرائیل کے لئے
عظیم الشان قوم کا اس طرح مٹ جانا، قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ الساعۃ (موت کی گھڑی) تھی
جس کے لئے حضرت عیسیٰ کو بطور نشانی بھیجا گیا تھا۔ وَ اِنَّهُ لَعَلَّمَ السَّاعَةَ (۴۱/۴۲) اور یہ گھڑی اس
طرح سر پر آ پہنچی کہ انہیں خبر تک بھی نہ ہوئی۔

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ اِبْرَہِیْمَ
لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلَفُونَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اطِيعُوْنَ
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ
فَاخْتَلَفَ الْاَوْحَادُ مِنْ بَیْنِهِمْ ۚ قَوْلٌ لِّلَّذِیْنَ ظَلَمُوا مِنْ
عَذَابِ یَوْمِ الْاَلِیْمِ ۚ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ
بَغْتَةً وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۴۳-۴۴/۴۲)

اور جب واضح دلائل کے ساتھ عیسیٰ (بنی اسرائیل کے پاس آیا اور اُس نے کہا "میں تمہارے
پاس حکمت (و غفلت کی باتیں) لایا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ) تاکہ تمہارے لئے وہ
بعض باتیں واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ پس تم قوانین خداوندی کی
نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا (سب کا) پروردگار ہے۔

لے اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں الساعۃ قیامت کے لئے آیا ہے لیکن اس کے معنی انقلاب بھی ہیں اور جن اعمال
کی سزا اس دنیا میں ملتی ہے ان کے ظہور نتائج کے لئے بھی الساعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ الساعۃ جس کی نشانی
حضرت عیسیٰ تھے وہ انقلاب عظیم تھا جس نے دنیا بھر کی برکتیں بنی اسرائیل سے چین کر امت مسلمہ کے حوالے کر دیں
اور اس طرح یہ انقلاب بنی اکرم کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آیا۔

لہذا اُسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے، (مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا) چنانچہ وہ جماعتیں آپس میں اختلاف کرنے لگیں۔ پس دردناک دن کے عذاب کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے بربادی سے جہنم نے (اپنی جانوں پر) ظلم کیا ہے۔ (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر اس آیت کا کہ وہ ان کے پاس اس طرح یکبارگی آپہنچے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

انہوں نے اللہ کی اس گراں بہا نعمت کو ٹھکرا دیا جو حضرت عیسیٰ کی وساطت سے انہیں ملنے والی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حضرت عیسیٰ کے وہی متبعین جو اس وقت کمزور و ناتواں نظر آتے تھے کس طرح ان پر غالب آ گئے (پہلے عیسائی اور پھر حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے صحیح متبع، جماعتِ مؤمنین)۔

وَجَاءَ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ قَوْمًا الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ۖ وَ مَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ (۵۵-۵۶/۳)

اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ سو اُس دن ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہو!

پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو انہیں دنیا و آخرت، دونوں جگہ سخت

عذاب دوں گا اور عذابِ الہی سے بچانے میں کوئی بھی ان کا مددگار نہ ہوگا۔

”عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا“ کو سامنے رکھیے اور پھر اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی جزر سی پر غور کیجئے کہ یہ شوریدہ بخت قوم کس ذلت و رسوائی اور محکومی و بے کسی کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔

عذر اے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پیدائش حضرت عیسیٰ کے متعلق مزید تصریحات

حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق اناجیل کا بیان اور قرآن کریم

کی متعلقہ آیات شروع میں درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس مسئلہ نے قلوب و اذان میں جس قدر اہمیت اختیار کر رکھی ہے وہ مزید تفصیل بحث کی متقاضی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے مذہب کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ ابنیت والوہیت مسیح کے عقائد اسی بنا پر قائم ہیں کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی۔ لیکن خود ہمارے ہاں بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں (اس کے وجوہات آگے چل کر ملیں گے)۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ شُرآن نے جن مقامات پر ولادت حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا ہے انہیں غور سے دیکھئے اور جس نتیجہ پر وہ مقامات پہنچا دیں انہیں صحیح سمجھئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات کے لفظی مفہوم متعین کرنے میں ابھی زمانہ کی علمی سطح کے اور بلند ہونے کا انتظار کرنا پڑے تا آنکہ تاریخی انکشافات و اثری تحقیقات ان متشابہ آیات کو محکمت میں بدل دیں۔ شُرآن نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ جوں جوں ”آیات خداوندی“ نفس و آفاق میں بے نقاب ہوتی جائیں گی شُرآن کے دعاوی ثبوت حقائق کی شکل میں سامنے آتے جائیں گے، یعنی اس کے حقائق انسانی علم کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ لہذا ہم ان حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کر لیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لئے شُرآن کریم کی ورق گردانی کریں تو یہ ”تدبر فی القرآن“ کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے درحقیقت تدبر فی القرآن کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن کریم کو اپنے خیالات و تصورات کے تابع لے آنا بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے دلوں پر مہریں لگیں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ شُرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سر و ست آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں تو شُرآنی حقائق کو کیلنچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہ کیجئے بلکہ شُرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجئے تا آنکہ مزید تحقیق و تدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں شُرآنی حقائق سما سکیں۔ اگر قرآن کریم کا یہ ارشاد ہو کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے ظہور میں آئی تھی تو بلا ادنیٰ تا مل ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہم ہر لمحہ بدلنے والی عقل کی خاطر نہ بدلنے والے

حقائق کو رکبک تاویلات سے موڑ توڑ نہیں سکتے اور اگر مُسَدِّقِ اَن کریم اس طرف لے جائے کہ آپ کی پیدائش عام انداز کے مطابق ہوئی تھی تو محض اس لئے کہ اس سے ایک ایسے عقیدہ کی تردید ہوتی ہے جو ہم میں ایک عرصہ سے متوارث چلا آ رہا ہے، بے معنی نکتہ آفرینیوں اور دور از کار موشگافیوں کی سعی لا حاصل بھی خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ہمارے تمام رجحانات و معتقدات قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس!



اناجیل کا بیان | مُسَدِّقِ اَن کریم تک آنے سے پیشتر ہمیں ایک بار پھر اناجیل پر غور کر لینا چاہیے۔ اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہر حال انہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا (اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے)۔ حضرت عیسیٰ کی مافوق الفطرت پیدائش کا ذکر متی اور لوقا کی اناجیل میں ہے۔ مرقس اور یوحنا کی اناجیل میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ مرقس (تاریخی تحقیق کی رُو سے) اناجیل اربعہ میں سب سے پہلی اور باقی اناجیل کی ماخذ ہے۔ اور یوحنا حواری عیسائیوں کے نزدیک بہت برگزیدہ اور حضرت مسیحؑ کے خاص معتمد علیہ تھے۔

ہر چند متی اور لوقا کے متعلقہ اقتباسات پہلے بھی گزر چکے ہیں لیکن موضوع کو بیک وقت سامنے لانے کے لئے ان اقتباسات کا دوبارہ نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انجیل متی میں ہے۔
اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہو گئی
پس اُس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا اے یوسف ابن داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آئے
سے نہ ڈر کیونکہ جو اُس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے وہ بیٹا
جنے گی اور تُو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو انکے گناہوں سے نجات دیگا
یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ

دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل رکھیں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ (متی کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی اور اس پیشگوئی کے مطابق جو اس سے پیشتر کی گئی تھی، یہ پیشگوئی تورات میں یوں مذکور ہے :-
 تب نبی نے کہا اے داؤد کے خاندان اب سنو۔ انسان کو تھکانا تمہارے آگے نہایت
 چھوٹی بات ہے۔ سو کیا تم میرے خدا کو بھی تھکاؤ گے؟ باوجود اس کے خداوند آپ تم کو
 ایک نشان دیگا۔ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل رکھے گی
 وہ شہد اور دہی کھائے گا۔ جس وقت کہ وہ بڑا ترک کرنے کا اور بھلا پسند کرنے کا
 امتیاز پائے ہر اُس سے آگے کہ یہ لڑکا بد ترک کرنے کا اور نیک پسند کرنے کا امتیاز پائے
 یسہر بن جسے تو برباد کرتا ہے اپنے دونوں بادشاہوں سے چھوڑی جائے گی

(یسعیاہ ۱۳ — ۷/۱۴)

اس پیشگوئی کے متعلق نوو عیسائیوں میں عجیب و غریب اختلافات ہیں۔ ایک عیسائی محقق (ڈاکٹر
 ڈیوڈ سن) نے (کتاب یسعیاہ کی شرح میں) لکھا ہے کہ یسعیاہ نبی نے درحقیقت جو کچھ فرمایا تھا وہ
 اتنا ہی تھا کہ ”ایک نوجوان لڑکی جو شادی کے قابل ہوگی بیٹا جنے گی“۔ لیکن جب اس کتاب (یسعیاہ)
 کا یونانی میں ترجمہ ہوا تو اس کے بجائے ”کنواری“ کا لفظ لکھ دیا گیا۔ دوسرے محققین کا خیال ہے کہ اس
 پیشگوئی کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے ہی نہیں۔ یسعیاہ نبی کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے قریب ۷۵۰
 برس پیشتر کا ہے اور انہوں نے اس پیشگوئی میں اپنے زمانہ کے بادشاہ کو تسلی دی ہے۔ لہذا یہ واقعہ اسی زمانے
 میں ظہور پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔

یہ تھا بہر حال انجیل متی کا بیان۔ اب انجیل لوقا کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا
 ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی
 تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آ کر کہا سلام تجھ کو جس
 پر فضل ہوا ہے! خداوند تیرے ساتھ ہے وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ
 یہ کیسا سلام ہے فرشتے نے اس سے کہا اے مریم! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے
 تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی۔ اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا

اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا
اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کرے گا اور اس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا
مریم نے فرشتے سے کہا یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ اور فرشتے نے
جواب میں اُس سے کہا کہ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ
ڈالے گی اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائے گا

(لوقا ۲۶-۲۵/۱)

دیکھئے! خود متی اور لوقا کے بیانات میں بھی کس قدر اختلاف ہے۔
اب اس سے آگے بڑھتے۔ خود لوقا نے حضرت مسیح کو یوسف کا بیٹا لکھا ہے۔
ابن یوسف وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اُس سے کہا بیٹا! تُو نے
کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے
(لوقا ۴۸/۲)

دوسری جگہ ہے۔

اور اُس کا باپ اور اس کی ماں ان باتوں پر جو اس کے حق میں کہی جاتی تھیں تعجب کرتے
تھے
(لوقا ۳۳/۲)

یوحنا کی انجیل میں بھی اسی طرح حضرت عیسیٰ کو یوسف کا بیٹا کہا ہے۔

فلپس نے تن ایل سے مل کر اُس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے
کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔
(یوحنا ۴۵/۱)

دوسری جگہ ہے۔

اور انہوں نے کہا کیا یوسف کا بیٹا یسوع نہیں ہے جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے
ہیں؟ بلکہ یہ کیونکر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اُترا ہوں؟
(یوحنا ۴۲/۱۶)

متی کی انجیل میں ہے۔

جب یسوع یہ تہلیل ختم کر چکا تو ایسا ہوا کہ وہاں سے روانہ ہو گیا اور اپنے وطن میں آکر
ان کے عبادت خانے میں انہیں ایسی تعلیم دینے لگا کہ وہ حیران ہو کر بولے کہ اس کو یہ حکمت

اور معجزے کہاں سے مل گئے یہ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس

کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں؟ (متی ۵۳ - ۵۵/۱۳)

پھر انجیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھے اور لوقا اور متی میں حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے (وہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہے) وہ یوسف بنجار ہی سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے۔ متی کی انجیل (باب اول) میں یہ نسب نامہ حضرت ابراہیمؑ سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اور اخیر میں لکھا ہے "اور متان سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا جو اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیحؑ کہلاتا ہے" (متی ۱/۱۶)۔ لوقا کی انجیل میں یہ نسب نامہ حضرت مسیحؑ سے اوپر کو آدمؑ تک گیا ہے۔ اس طرح کہ "جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو بتیس برس کا تھا اور جیسا کہ سمجھا جاتا تھا، یوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیسیٰ کا ہ اور وہ متات کا..... اور وہ سیت کا اور وہ آدمؑ کا اور وہ خدا کا تھا (لوقا ۳۸ - ۳/۲۳)۔ غور فرمایا آپ نے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق انجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھا اور یہ سلسلہ یوسف بنجار کی وساطت سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان نسب ناموں کی رو سے بھی حضرت مسیحؑ، یوسف کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں اور جیسا کہ لوقا کی انجیل میں لکھا ہے آپ کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ ابن اللہ (یا بغیر باپ کے پیدائش) کا عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے، یعنی جب مسیحیت پر سینٹ پال کے معتقدات کا رنگ غالب آگیا تو اُس وقت انیت کا عقیدہ بھی مذہب عیسوی میں داخل ہو گیا۔

عقیدہ انیت

رومیوں کے نام سینٹ پال کے خط میں مذکور ہے۔

مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤدؑ کی نسل سے پیدا ہوا لیکن پاکیزگی و کروح کے اعتبار

اور مردوں میں سے جی اٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا

(رومیوں کے نام ۱/۴)

لے سینٹ پال، روما کا ایک مشدد یہودی تھا جس نے حضرت عیسیٰ کے متبعین کی مخالفت اور تعذیب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ازاں بعد وہ خود عیسائی ہو گیا اور اس نے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جسے اصل عیسائیت سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ انیت، الوہیت، تثلیث، کفارہ وغیرہ کے عقائد اسی کے مفتریات سے ہیں۔

یہاں سے عقیدہ انبیت کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اور اگرچہ اس میں جسمانی اور روحانی کا فرق ملحوظ رکھا گیا، لیکن جب ذرا آگے چل کر مذہب میں اور غلو ہوا تو یہ فرق بھی مٹ گیا۔ چنانچہ جب (۳۲۵ء میں) نقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی ہے تو اس میں اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر لی کہ اقا نیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) میں حضرت مسیح کا درجہ کیا ہے؟ بعض کی رائے تھی کہ بیٹا، باپ کے مقابلہ میں ازلی نہیں ہو سکتا لیکن کونسل نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا اور فیصلہ کر دیا کہ

جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ کسی وقت میں خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا یا پیدا ہونے سے قبل وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے، ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے۔

اس فتوے کو قسطنطین نے بزور حکومت نافذ کر دیا (ملاحظہ ہو "معرکہ مذہب و سائنس" از ڈرپر)۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے "خدا کے بیٹے" کو یوسف کا بیٹا کیسے سمجھا جاسکتا تھا۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑا کہ حضرت مسیح کی پیدائش بلا زبانی باپ کے ہوئی ہے۔ یہ ہیں مذہب عیسائیت میں "بن باپ" کے عقیدہ کے ارتقائی مراحل۔ چنانچہ شروع شروع میں خود عیسائیوں میں ایسے فرقے موجود تھے جو اس عقیدہ کے خلاف تھے، بالخصوص ایبائی فرقہ جو سینٹ پال سے سخت نفرت کرتا تھا۔ یہ فرقہ چوتھی صدی عیسوی تک موجود تھا لیکن جب مذکورہ صدر فتوے حکومت کے زور پر نافذ ہوا ہے تو یہ فرقہ یا تو رفتہ رفتہ دوسرے عیسائیوں میں جذب ہو گیا یا یہودیوں

رہبان کا بیان | میں مدغم۔ اس باب میں رہبان کی تحقیق بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

یہ چیز کہ مسیح کو اس بات کا خواب و خیال تک بھی نہ تھا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں، ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ تصور یہودی و بنیست تک کے لئے بھی اجنبی تھا اور مختلف اناجیل میں اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ہم اسے صرف جو حنا کی انجیل میں دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ مسیح کے خیالات کی ترجمان نہیں کہلا سکتی..... لیکن تماشا یہ کہ خود انجیل یوحنا میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ یہ بہتان کہ مسیح اپنے آپ کو خدا

یا خدا کا ہمسرہ کہتا ہے یہودیوں کا تراشیدہ ہے (دیکھئے یوحنا ۵/۱۸؛ ۱۰/۳۳)۔ اسی انجیل میں مسیح اپنے آپ کو خدا سے کمتر بھی بتاتا ہے (یوحنا ۱۴/۲۸)۔ وہ اپنے آپ کو عام آدمیوں سے بلند تر ضرور سمجھتا ہے لیکن اپنے آپ کو خدا سے ایک غیر محدود فاصلہ پر الگ قرار دیتا ہے۔ وہ "خدا کا بیٹا" ہے لیکن سب انسان "خدا کے بیٹے" ہیں یا مختلف درجے کے اعتبار سے "خدا کے بیٹے" بن سکتے ہیں۔ (دیکھئے متی ۲۵، ۵/۹؛ لوقا ۲/۳۸؛ ۴/۳۵)۔ ۲۰/۳۶، یوحنا ۱۳-۱۲؛ ۱۰/۳۳-۳۴ اعمال ۲۹-۲۸/۱۶..... سامی زبان میں

(اور تورات میں) لفظ "بیٹا" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ (صفحہ ۱۸۱)

عقیدہٴ ابنیت کے وضع کرنے کے بعد عیسائی پیشوائیت ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئی۔ اناجیل میں یہ تصریح موجود تھی کہ یوسف نجار کی شادی حضرت مریم کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس بیان کی موجودگی میں یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ حضرت مسیح یوسف کے بیٹے نہیں تھے، یا اس مشکل کا حل دریافت کرنے کے سلسلہ میں بڑی کدو کاوش سے کام لینا پڑا۔ اٹلی کے مشہور مصنف Marcello Graveri نے "حیات مسیح" کے عنوان سے ایک بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جس میں تاریخی اور اثری تحقیقات کی روشنی میں عجیب و غریب انکشافات کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عیسائی پیشوائیت نے یوسف اور مریم کے تعلقات کی گتھی سلجھانے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ان کی باہمی شادی تو ہو گئی۔ لیکن مریم یوسف سے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ فرشتوں کی سی محبت۔

اور یوسف بھی مریم کو باعصمت نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ یہ جوڑا کیا تھا؟ ایک کنواری

بیوی کا کنوارا خاوند۔ (ص ۳۸)

لیکن اس سلسلہ میں ابھی ایک اور دشوار گزار مرحلہ باقی تھا۔ اناجیل میں یہ بھی مذکور تھا کہ حضرت عیسیٰ کے بہن بھائی بھی تھے۔ اس سے حضرت مریم اور یوسف کے زناشوی کے تعلقات کا ثبوت ملتا تھا اور عیسائیت اس تصور کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنے "خدا کی والدہ" کو جنسی کثافتوں میں ملوث دیکھے۔ اس مشکل کے حل کے لئے کبھی یہ کہا گیا کہ وہ بچے یوسف کی پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اس لئے حضرت عیسیٰ کے سوتیلے بہن بھائی تھے اور کبھی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی بہن تھے (صفحہ ۳۹)۔

لیکن ان تمام توضیحات کے باوجود اس اعتراض کا جواب کسی سے بن نہیں پڑتا کہ

خدا کی پیدائش بہ سلسلہ تولید کیسے ہو سکتی ہے ؟ سوچئے کہ وہ خدا جس نے ایتدار کے
زمانی تصور سے بلند اپنی نمود آپ کی 'اپنی پیدائش کے لئے عورت کا رہین منت ہو گیا !
(صفحہ ۳۹)

تورات میں بیٹے کا لفظ | جہاں تک لفظ ابن (بیٹے) کا تعلق ہے، تورات میں یہ لفظ عام
آدمیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلی کتاب
پیدائش میں ہے :

جب روئے زمین پر بہت آدمی ہوئے لگے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہونے لگیں تو خدا کے
بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا.....
(پیدائش ۲-۱/۶)

قرب کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب کے متعلق حضرت موسیٰ کی زبان سے
کہلایا گیا ہے :

تب فرعون سے یوں کہیو کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل (یعقوب) میرا بیٹا ہے
پہلوٹھا ہے سو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے (بنی اسرائیل) کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت
کریں۔
(خروج ۲۳-۲۲/۴)

بنی اسرائیل کے متعلق دوسری جگہ ہے۔

بنی اسرائیل شمار میں دریا کی ریت کے ذروں کی مانند ہوں گے جو پا پے نہیں جاتے اور
گئے نہیں جاتے اور ایسا واقعہ ہو گا کہ اس جگہ جہاں انہیں کہا گیا ہے کہ تم میرے لوگ
نہیں ہو اس کے عوض میں اُن سے کہا جائے گا کہ تم زندہ خدا کے زندہ فرزند ہو۔

(ہو سیع نبی کی کتاب ۱/۱۰)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت مسیح کے زمانے میں آپ کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال بھی
ہوا ہو گا تو اس کا کیا مفہوم ہو گا۔ لیکن بعد میں جب مذہب میں غلو و تشدد کا دور آیا تو اُسے کچھ سے
کچھ معافی پہنا دیئے گئے اور پھر اناجیل میں بھی انہی معافی کے اعتبار سے تحریف کر دی گئی۔ چنانچہ خود
اناجیل کا اختلاف و تضاد اس باب میں شاہد ہے۔ انجیل متی میں حضرت مسیح اور پطرس کے ایک مکالمہ
کے ضمن میں لکھا ہے :-

شمعون پطرس نے جواب میں کہا تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا مبارک ہے تو شمعون بریوناہ کیونکہ یہ بات گوشت اور خون نے نہیں بلکہ میرے باپ نے جو آسمان پر ہے تجھ پر ظاہر کی ہے اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا اور عالم ارواح کے دروازے اُس پر غالب آئیں گے

(متی ۱۶-۱۸)

لیکن برناباس میں یہی مکالمہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یسوع نے جواب میں کہا "اور خود تمہارا میرے بارے میں کیا قول ہے؟" پطرس نے جواب دیا کہ "تو مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔" تب اس وقت یسوع برہم ہوا اور اُس کو غصے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے جھڑکا "میرے پاس سے چلا جا اس لئے کہ تو شیطان ہے اور مجھ سے بُرا سلوک کرنے کا قصد کرتا ہے۔"

(برناباس ص ۱۱)

اور دوسری جگہ حضرت مسیحؑ کا یہ قول بھی برناباس میں مذکور ہے۔

اور جبکہ یسوع نے یہ کہا اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مُنہ پر مارا۔ پھر زمین پر سر دے پٹکا اور کہا "ہر وہ شخص ملعون ہو جو کہ میرے اقوال میں اس بات کو درج کرے کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں۔" پس شاگردان باتوں کے سنتے وقت مُردوں کی طرح (بے جان سے ہو کر) گر پڑے۔ تب یسوع نے یہ کہتے ہوئے اٹھایا "ہمیں اس وقت خدا سے ڈرنا چاہیے اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ اُس دن میں خوف نہ کھائیں۔"

(برناباس ص ۸۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اس لفظ کا استعمال مجازاً بھی جائز قرار نہیں دیا تھا کہ بعد میں اس پر حقیقت کی عمارت نہ استوار کر لی جائے۔

بہر حال یہ ہیں اناجیل کے بیانات۔ اس باب میں دورِ حاضر کی تحقیق کس نتیجہ پر پہنچی ہے اور اب متوسط الخیال عیسائیوں کا اس ضمن میں کیا عقیدہ ہے، اس کی تصریح آگے چل کر ملے گی۔

اب آئیے قرآن کی طرف۔ اس میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک انبیاء کرامؑ ایسے ہیں جن کے والد کا کوئی ذکر نہیں آیا۔

قرآن کریم کا بیان

حضرت موسیٰ کے والد کا نام بھی مذکور نہیں، والدہ ہی کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں، عیسائیوں کے نزدیک ولادت حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کی اہمیت اس لئے تھی کہ یہ چیز بنیاد تھی الوہیت مسیحؑ، تثلیث اور کفارہ کے عقیدہ کی۔ قرآن کریم کو ان باطل عقائد کی تغلیط و تردید مقصود تھی، اس لئے اس میں ولادت حضرت مسیحؑ کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ اس سے ان عقائد باطلہ کی تردید ہو جائے۔ ان مبادیات کو پیش نظر رکھ کر قرآن کریم کی آیات کو دیکھئے۔ ولادت حضرت مسیحؑ کا تفصیلی تذکرہ سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں آیا ہے۔ ان کی متعلقہ آیات پہلے بھی گزر چکی ہیں لیکن توضیح مطلب کے لئے انہیں پھر درج کر دیا جاتا ہے۔ ان ہر دو مقامات میں ولادت حضرت مسیحؑ کی خوشخبری سے پہلے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں حضرت زکریاؑ کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْحَرَابِ ۖ إِنَّ اللَّهَ
يُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ مُّصَدِّقًا لِّكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا
وَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ قَالَ رَبِّ أَلَيْسَ لِي عُلْمٌ وَ
قَدْ بَلَغَنِي الْكِبَرُ وَ أُمْرَاتِي عَاقِرٌ ۚ قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ
يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝ (۳۸-۳۹)

وہ ابھی قربان گاہ میں کھڑا خود دعا تھا کہ ملائکہ نے اسے آواز دی اور کہا کہ اللہ تمہیں ایک بیٹے (یحییٰ) کی بشارت دیتا ہے۔ وہ قانون خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہوگا، ایک بڑی جماعت کا لیڈر، صاحبِ نظم و ضبط اور بلند ترین صلاحیتوں کا مالک۔

(ذکر کیا اس خوشخبری سے خوشق ہو گیا، لیکن جب اُسے اپنے طبعی موانعات کا خیال آیا تو اُس نے کہا کہ) اے میرے پروردگار! میرے ہاں اب لڑکا پیدا ہونیکا کونسا وقت ہے جبکہ میں اس قدر بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ (کیا مجھے وہ بیٹا اس طرح ملے گا جس طرح یہ بیٹی مریم مل گئی ہے یا وہ میرے اپنے ہاں پیدا ہوگا؟) اللہ نے کہا (نہیں، مریم کی طرح نہیں بلکہ) اسی طرح جیسے میرے قانونِ مشیت کے مطابق اولاد پیدا ہوا کرتی ہے۔ (بوڑھے مرد اور عقیم عورت میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیدار ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں چنانچہ ان کی صورت میں یہی ہوا تھا (۲۱/۹۰)۔

اس کے بعد حضرت مسیح کے متعلق ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللَّهَ بِبَشَرٍ لِّكَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ قَصِدُ
اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيَكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا مِّنَ
الطَّالِعِينَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنِّىْ يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَلَمْ يَمَسِّنِىْ
بَشَرٌ ۙ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (۴۴-۴۶/۳)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح (اور عیسیٰ ابن مریم ہوگا) دنیا میں صلح و جنت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے ہے۔

تندرست و توانا، چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور بچتہ عمر تک پہنچنے والا (۵/۱۱۱) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاکباز انسان۔ اس سے ان توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ خانقاہیت کی شریعت کے علی الرغم متاثر زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ یا اس کا بچہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ صبح و صبح ایسا ہو جاتا ہے۔ لہذا اُس کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ضروری تھا۔

اس پر مریم نے انگریز کی طرح (۳/۳۹) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟۔ اس کے جواب میں اس سے وہی کچھ کہا گیا جو زکریا سے کہا تھا (۳/۳۹) کہ یہ خدا کے اُس قانونِ شیت کے مطابق ہوگا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے۔ وہ قانون جو اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس اسکیم کا آغاز ہو جاتا ہے (۱۲/۱۱۷)۔

اسی طرح سورہ مریم میں پہلے حضرت عیسیٰ کی بشارت کا ذکر ہے۔

يٰزَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اِسْمُهُ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَهُ

مِنْ قَبْلُ سَمِئًا ۝ قَالَ رَبِّ اَنْتَ يَكُونُ لِي غُلَمًا وَ كَانَتْ
اُمْرَاتِي عَاقِرًا وَ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذَلِكَ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ كَلِمَتُكَ
شَيْئًا ۝ (۱۹/۹-۷)

ہم نے اس کی دعا سُن لی اور کہا کہ اے زکریا! ہم تمہیں ایک بیٹے کی پیدائش کی
خوشخبری دیتے ہیں۔ جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ یہ ایسا لڑکا ہوگا جس کی نظیر
تمہارے خاندان میں نہیں ملے گی (۱۹/۷)۔

زکریا اس خوشخبری سے خوش تو ہو گیا، لیکن جب اسے اپنے طبعی مواعیات کا
خیال آیا تو اپنے اطمینان کی خاطر کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میرے ہاں اب
لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ میں بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔
دیکھا وہ بیٹا خود میرے ہاں پیدا ہوگا یا کسی اور کا لڑکا مجھے مل جائے گا جسے میں اپنا بیٹا بنا
لوں گا جس طرح مریم بچی میری کفالت میں دے دی گئی ہے (۳/۳۹)۔

خدا نے کہا کہ (نہیں) خود تیرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا اور اسی طرح ہوگا جس طرح
لوگوں کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ بڑھاپے میں اولاد
پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیدار ہو جانا ہمارے قانون کی رُو سے مستبعد نہیں۔ ہمارے جس
قانون نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا، حالانکہ تیری بستی کا نام و نشان بھی نہیں تھا
(وہ بڑھاپے میں کسی کو صاحبِ اولاد کیوں نہیں کر سکتا)۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ ۚ اِذْ اُنْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا
شَرْقِيًّا ۚ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۚ فَاسْرُسَلْنَا اِلَيْهَا
رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۚ قَالَتْ اِنِّي الْغَوْدُ بِالرَّحْمٰنِ

اے فَتَمَثَّلَ کا ایک مفہوم ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اسے پیش نظر رکھئے۔

مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُولُ رَبِّكِ قَدْ وُهِبَ
لَكَ عِلْمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ اَنْتِ يَكُونُ لِي عِلْمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ
وَّ لَمْ آلِكْ بَنِيَّاهُ قَالَ كَذَلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ ۚ وَ
لَجَعَلَنَ آيَةً لِلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّمَّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝
(۱۹/۲۱ — ۱۶)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں، لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر اور سلسلہ
کلام کا آغاز اُس وقت سے کر جب وہ خالقِ ہیت کی زندگی کو چھوڑ کر اپنے گاہلِ ناصرہ
میں چلی گئی تھی جو وہاں سے (مشرق کی سمت واقع تھا۔

(خالقِ ہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئند واقعات نے اس کے دل پر ایسا
چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے
کے لئے اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق تقویت بخش اشارہ کیا) جو اس کے خواب
میں ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

(مریم اسے دیکھ کر گھبرائی اور اس سے کہا).... کہ اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے
تو میں تجھ سے 'خدا نے رحمان کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں۔

اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف
سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں (۳/۴۴) اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے نہایت عمدہ نشوونما
بچہ عطا کرے گا۔

اس پر مریم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تک میں میکل میں رہی، پاکباز اور ہبہ
کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھو نہا تک نہیں.... وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے
شادی نہیں کی کیونکہ یہ چیز ضابطہ خالقِ ہیت کے خلاف ہے (۳/۴۴ : ۱۹/۲۸)۔

اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانونِ تخلیق کے مطابق ہی ہوگا (۳/۴۴)۔ یہ
اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو مواعظ تیرے ذہن میں ہیں اور تمہیں اس
طرح پریشان کر رہے ہیں) انہیں دُور کر دے (۱۹/۹)۔ خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بچہ عام

بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لئے موجب رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگا۔ (جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا وہ حق پر سمجھا جائے گا جو اس سے انکار کرے گا وہ باطل پر ہوگا) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ بچہ ہمارا برہنہ بنے گا (۳/۵۷)۔

پہلے سورہ آل عمران کی متذکرہ صدر آیات پر نگاہ ڈالئے۔ جب حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے تو آپ نے تعجب سے کہا کہ رَبِّ اَنْتِیْ یٰکُوْنُ لِیْ غُلَمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ وَاُمْرَاتِیْ عَاقِرٌ (۹۳) (اے میرے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں سن رسیدہ ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟)۔ اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے جنہیں حضرت زکریا ولادتِ فرزند کے لئے بطور موانع پیش کیا ہے۔ ایک اپنی سن رسیدگی اور دوسرے اپنی بیوی کا بانجھ پن۔ اللہ تعالیٰ نے ان موانع کو دور کر دیا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش عام انسانی بچوں کی طرح ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھئے! حضرت زکریا نے استعجاباً عرض کیا تھا کہ اَنْتِیْ یٰکُوْنُ لِیْ غُلَمٌ (میرے یہاں کس طرح لڑکا پیدا ہو سکتا ہے!) اس کے جواب میں فرمایا کَذٰلِکَ اَمَرُ اللّٰهِ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (اسی طرح ہوگا جس طرح ہوتا ہے۔ اللہ اپنے قانونِ مشیت کے ماتحت جو چاہتا ہے کرتا ہے) یعنی اسی طرح ہوگا (کَذٰلِکَ) جس طرح مشیت کے کام ہوتے ہیں۔ جو کچھ مشیت کے تابع ہونا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسباب پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ حضرت زکریا کے سلسلہ میں یہ رکاوٹیں کس طرح دور ہوئیں، اس کے متعلق سورہ انبیاء میں فرمایا کہ وَ اَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ (۲۱/۹۰) ہم نے زکریا کے لئے اس کی بیوی میں (حمل کی) صلاحیت پیدا کر دی۔ ”لہ“ سے مترشح ہے کہ حضرت زکریا میں باوجود کبر سن اور ولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ آپ کی بیوی عقیقہ تھیں سودہ نقص دور کر دیا گیا۔ کَذٰلِکَ اَمَرُ اللّٰهِ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کو بروئے کار لانے کے لئے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جب حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو آپ ہیکل میں راہبانہ زندگی بسر کر رہی تھیں اور ضابطہ خانقاہی کی رُوسے جن راہبوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کی شادی ہو سکتی تھی، اُن کی حرکات و افعال سے وہ دل برداشتہ ہو چکی تھی۔ ان حالات میں اس کے لئے عائلی زندگی کا

تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضرت مریم نے عرض کیا کہ رَبِّ اَنْتِیْ یَکُونُ لِیْ وَلَدٌ وَ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ (۳/۴۷) ”اے میرے پروردگار! میرے ہاں کیسے بیٹا پیدا ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ اسی طرح جس طرح مشیت کے ماتحت تخلیق ہوا کرتی ہے۔ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَّا یَقُولُ لَهٗ کُنْ فِیْکُوْنُ ۝ (۳/۴۶) ”جب وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے لئے پھر اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کہہ دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔“ واضح رہے کہ کُنْ فِیْکُوْنُ کے معنی یہ نہیں کہ ایسا کہنے سے شے مطلوبہ خود بخود زمین سے پھوٹ کر باہر نکل آتی ہے۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ اس سے اس شے کی تخلیقی ابتدا ہو جاتی ہے اور وہ پھر ضروری مراحل طے کرنے کے بعد اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔

اسی طرح سورہ مریم کی مندرجہ صدر آیت کو دیکھئے۔ بشارت حضرت عیسیٰ پر حضرت زکریا نے عرض کیا۔

رَبِّ اَنْتِیْ یَکُونُ لِیْ غُلَامٌ وَّ کَانَتِ اُمْرَاتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتٰیًّا ۝ (۱۹/۸)

اے میرے پروردگار! میرے کیسے لڑکا ہوگا کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے میں بہت آگے بڑھ چکا ہوں۔

جواب میں ارشاد ہوا قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلٰی ہٰہِیْنٍ وَّ تَدُ خَلَقْتَکَ مِنْ قَبْلُ وَّ لَمْ تَکْ شَیْئًا ۝ (۱۹/۹) ”کہا، ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب کہتا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے اور اس سے قبل میں نے تجھے پیدا کیا جب تو کوئی شے نہ تھا۔“ یعنی جو موانع تم نے بیان کئے ہیں وہ بجا اور درست! لیکن یہ چیز اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ ان موانع کو دور کر دے۔ تم ان موانع پر ہی متعجب ہوتے ہو لیکن کیا یہ نہیں سوچتے کہ خود تمہاری (یعنی ایک انسان کی) تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ کی بشارت کا ذکر ہے جسے سن کر حضرت مریم نے عرض کیا۔

قَالَتْ اَنْتِیْ یَکُونُ لِیْ غُلَامٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَکُ بِغَیْبًا ۝ (۱۹/۲۰)

مریم بولی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں سرکش ہوں؟“

اس کے جواب میں فرمایا۔

قَالَ كَذَلِكَ ۖ قَالَ رَبِّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئْ ۚ وَ لِنَجْعَلَهُ آيَةً
لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (۱۹/۲۱)

پیغامبر نے کہا ”ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمادیا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے، یہ اس لئے ہوگا کہ اسے لوگوں کے لئے حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی بنادوں اور میری رحمت کا اس کے توسط سے ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پاچکا۔

یعنی یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جو حضرت زکریا کے استعجاب کے جواب میں ارشاد ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا یعنی یہ ایک طے شدہ امر ہے اور طے شدہ امر کے ظہور پذیر ہونے کے لئے سنت اللہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ كُنْ فَيَكُونُ یعنی اس شے کا ابتداء سے انتہا تک مختلف مراحل طے کرنا۔ چنانچہ اگلی آیت میں ان مراحل کی تشریح فرمادی۔

فَعَمَلَتْهُ ۖ فَاِذْ تَبَذَّلَتْ لِهٖ ۚ مَكَانًا مَّقْصِيًّا ۝ (۱۹/۲۲)

پھر اس ہونے والے فرزند کا محل ٹھہر گیا۔ وہ لوگوں سے الگ ہو کر دُور چلی گئی۔

حضرت مریم کو اپنے وقت پر حمل قرار پایا جس طرح حمل قرار پایا کرتا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کی قرآن کریم کو ضرورت نہ تھی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حمل کس طرح قرار پایا کرتا ہے۔ كَذَلِكَ اِذَا نَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوحِنَا وَ كَانَحْمِلُ الْوِجْدَانَ قُدْرًا ۚ اِنَّهُمْ لَخٰشِعُوْنَ لِآيٰتِنَا ۚ اَعْمٰی ۚ جس طرح خود حضرت مریم کے دل میں خیال گذرتھا کہ اس کے لئے بشر کے ساتھ تمسک کی ضرورت ہے۔

ان مقامات کے علاوہ اجمالی طور پر سورۃ انبیاء میں بھی حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے اور وہاں بھی اس ذکر سے پہلے پیدائش حضرت یحییٰ کا ذکر موجود ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کی بیوی میں (بانجھ پن دور کر کے) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

فَاَسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يٰحْيٰی ۚ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۚ اِنَّهُمْ
كَانُوْۤا يُسْرِعُوْنَ فِی الْخٰیِرٰتِ ۚ وَ يَدْعُوْنَآ رَغْبًا وَ رَهْبًا ۚ

وَكَانُوا لَنَا خُشِعِينَ ۝ (۲۱/۹۰)

ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے آئیں جیسا بیٹا عطا کر دیا۔

یہ تمام انبیاء نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں نہایت تیزی سے آگے بڑھتے تھے اور زندگی کے ہر گوشے میں — خواہ وہ امید افزا ہو یا اس انگیز — ہم سے پوچھتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ (وہ ہر معاملہ میں ہمارے حکم کا انتظار کرتے تھے) اور اسی کے سامنے جھکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوانین خداوندی کے خلاف قدم اٹھانے میں کس قدر خطرات پنہاں ہیں۔ وہ ان کی خلاف ورزی سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے۔

اس کے بعد حضرت مریم کا ذکر ہے۔

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا

وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ (۲۱/۹۱)

اور ان کے ساتھ ہی اس عفت آب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے (یہودیوں کی خود ساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰ جیسا بیٹا عطا کیا اور جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمع ڈال کر اسے صاحب اختیار و ارادہ انسان بنا دیا جاتا ہے اسے بھی ایسا ہی بنایا (۳/۴۴؛ ۱۹/۱۶؛ ۳۲/۹)۔ وہ دونوں اقوام عالم کے لئے اس بات کی نشانی تھے کہ احکام خداوندی اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ یہودیوں کی خود ساختہ شریعت نے انہیں — معاذ اللہ — مردود و ملعون قرار دیا اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھہرایا۔

∴

حضرت زکریا کے علاوہ حضرت ابراہیم کے ہاں بھی کبر سنی میں اولاد ہوئی تھی اور اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی تھی (تفصیلی تذکرہ جوئے نور میں گذر چکا ہے) جب آپ کی بیوی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ (سُن رسیدگی میں ان کے ہاں اولاد، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (۱۱/۷۳) ”کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟“ دیکھئے یہاں بھی اسی طرح اَمْرُ اللَّهِ

کہا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وہ **أَمْرًا مَّقْضِيًّا** (۱۹/۲۱) (یعنی ایک طے شدہ امر تھا)۔

طعن و تشنیع کیوں؟ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، حضرت مریم ایک راہبہ کی زندگی بسر کر رہی تھیں جسے دنیاوی علاقے سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ساری عمر تہجد میں گزار دینی چاہیے۔ آپ کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ انہیں متاہل زندگی بسر کرنی ہوگی کیونکہ انہیں ایک عظیم الشان رسول کی امین بننا ہے۔ اس طے شدہ امر (أَمْرًا مَّقْضِيًّا) کے مطابق حضرت مریم نے خانقاہ کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی اختیار کی۔ لیکن یہودیوں کے نزدیک یہ کوئی چھوٹا جرم نہ تھا۔ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لینا، مشربِ خالقیت میں ارتداد سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس جذبہ انتقام اور شکست پندار کو بھی ملحوظ رکھئے جو حضرت مریم کی اس روش سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے ہیکل کے بچاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کی اور ہیکل سے باہر ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ان وجوہات کی بنا پر انہوں نے حضرت مریم کو موردِ طعن و تشنیع بنایا۔

لے خانقاہیت MONASTICISM کی زندگی مذہبِ عیسویت کی ایجاد نہیں۔ اس کے آثار اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھے اور مصریوں میں بھی۔ خود حضرت مریم کی ابتدائی زندگی کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ یروشلم کے ہیکل (خانقاہ) میں راہب اور راہبات ہوتی تھیں۔ یہ تارک الدنیا لوگ عبادات میں مصروف تھے اور انبیائے یہود کی پیشگوئیوں کے ماتحت ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔

SPIRIT AND ORIGIN OF CHRISTIAN MONASTICISM BY J.O. HANNAY

BENEDICTIVE MONASTICISM BY E.L. BUTLER

اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس میں صراحت ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل یہودیوں میں (بالخصوص) ایسی (فرقہ میں) رہبانیت کی زندگی اچھی تھی اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں حضرت مریم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بارہ برس کی عمر تک بطور راہبہ ہیکل میں رہی تھیں۔ اس کے بعد ہیکل کے بچاریوں کو اس کی تلاش ہوئی کہ اسے کسی معمر یہودی کی کفالت میں دیدیا جائے جو زندہ ہوتا کہ وہ (حضرت مریم) تہجد کی زندگی بھی بسر کرے اور ہیکل کا تقدس بھی داغدار نہ ہو۔

اور اپنے جوش انتقام میں اس پیکرِ عفت و ناموس کے خلاف طرح طرح کے الزام تراشے۔ وَقَوْلِهِمْ عَلٰی مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝ (۲/۱۵۶) یعنی ان کے نزدیک ایک راہبہ کا اس طرح کا نکاح، نکاح ہی نہیں قرار پاسکتا تھا۔ اس لئے اس کی اولاد کس طرح مستحسن نگاہوں سے دیکھی جاسکتی تھی؟ لہذا ان کی نظروں میں یہ فعل نہایت شنیع اور یہ امر (معاذ اللہ) موجب ہزار نفرین تھا۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ (اور ان کے شوہر) بچے کو لے کر مصر (یا رینان کی تصریح کے مطابق) قانا کی بستی کی طرف چلی گئی تھیں۔ اناجیل کے بیان کے مطابق وہاں سے واپسی کے بعد جب حضرت عیسیٰ قریب بارہ سال کے ہوئے تو انہوں نے ہیکل کے اجارہ درمیان کی دسیہ کاریوں کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی (اگرچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کو نبوت ملنے کے بعد کا ہے)۔ آپ کی یہ تنقید جس قدر سخت ہوتی تھی اس کا اندازہ اناجیل کے بیانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً متی کی انجیل میں ہے۔

اس وقت یسوع نے بھڑے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقہانہ اور فریسی مونسے کی گدی پر بیٹھے ہیں وہ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رتی کہلانا پسند کرتے ہیں مگر تم رتی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا اے ریاکار فقہان اور فریسیو تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو ۵

اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا ۵ احمقو اور اندھو کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا ۵ اے اندھو! کونسی بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے ۵ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے ۵ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے ۵ اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے ۵ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینے اور سونف اور زیرے کے تودہ کی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے ۵ اے اندھے راہ بتانے والو جو ٹھچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹاؤ نا پرہیزگاری سے بھرے ہیں ۵ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرنا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں ۵

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں ۵ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو ۵

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ نبیوں کی قبریں بتاتے اور استبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے ۵ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو

کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھردوہ اے
سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو میں نبیوں
اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں تم بعض کو قتل کرو گے اور
صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے
پھرو گے تاکہ سب رستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے
خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے
درمیان قتل کیا ہے تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا

(متی ۱-۲۳/۳۶)

آپ اندازہ لگائے کہ اس سے ان مقدسین کے طائفہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ انہیں پہلے (حضرت)
مریم کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے رسوم خانقاہی کو اس طرح سے توڑا۔ اس کے بعد یہ زخم کاری کہ
اس کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا وہ اس انداز کا! یہ ہے وہ پس منظر جس میں قرآن نے کہا ہے کہ

يَا اُخْتُ هَارُونَ مَا كَانَ

اَبُوكَ اَمْرًا سَوِيًّا وَمَا

كَانَتْ اُمُّكَ بَغِيًّا ۝ (۱۹/۲۸)

وہ اس سے کہتے کہ اے اختِ ہارون! نہ تو

تیرا باپ بُرا آدمی تھا، نہ ہی تیری ماں نے ہیکل

کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم

تو ایک شریف، مذہب پرست، پابندِ شریعت

گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کیا اور اپنے بیٹے

کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟

یعنی انہوں نے کہا "تمہارا گھرانہ بڑا مذہب پرست تھا۔ تیرے ماں باپ، خانقاہ کے آئین و ضوابط کی
بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے دل میں ان مقدس قوانین و دساتیر کی بڑی عظمت تھی۔ تیری ماں نے تجھے
ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت مندی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن تو نے ان تمام آئین و ضوابط

کو توڑ کر ہیکل کی عظمت کو برباد کر دیا۔ اپنے ماں باپ کی عقیدت مندی کو خاک میں ملا دیا۔ خانقاہ میں راہبہ بنی تھی تو ضبط نفس کے انداز بھی سیکھتی۔ اگر اس طرح کی (متابل) زندگی بسر کرنی تھی تو خانقاہ میں معتکف کیوں ہوئی تھی؟ یہ تو رہی تمہاری اپنی حالت۔ اس کے بعد تو نے جو بچہ جنا اس کی حالت یہ ہے کہ وہ قوم کے ایسے واجب الاحترام بزرگوں کے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آتا ہے اور ہیکل کے آئین و رسوم کے خلاف اس جرأت سے لب کشائی کرتا ہے؟ بالآخر تمہارا اور تمہارے اس بچے کا مطلب کیا ہے؟ کیا تمہارے دل میں ہیکل اور اپنے آباء و اجداد کے مذہب کا کچھ احترام باقی نہیں رہا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا تصویر میں لائیے اس الم انگیز واقعہ کو قوم کے بڑے بڑے خاندان کے عمائد اور اراکین اس طرح پھر ہوئے و رندوں کی طرح چاروں طرف اُمنڈ پڑے ہیں اور ان کے درمیان حضرت مریمؑ ساکت و صامت کھڑی ہیں۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بو جھاڑ ہو رہی ہے لیکن وجہ تشنیع وہ واقعہ ہے جو اللہ کی مشیت کے ماتحت اس کے حکم کے مطابق ایک طے شدہ فیصلہ (أَمْرٌ مَّقْضِيًّا) کو پورا کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا، یعنی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت کے خلاف عملی احتجاج۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے بیٹے کے خلاف بھی اس قسم کے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت مریمؑ سے بار بار اصرار کیا کہ بتاؤ کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود کچھ جواب دیتیں، انہوں نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو۔ یہ تمہارے اعتراضات کا جواب دے گا۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ (۱۹/۲۹)

اس پر مریم نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس جواب پر ان کے غصہ کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے جوش غضب سے کہا کہ تم کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا کوئی جواب دو، ہمیں کہہ رہی ہو کہ ہم اس بچے سے پوچھیں؟ تم نے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ اس سے تم نے ہماری کس قدر توہین کی ہے۔

قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (۱۹/۲۹)

انہوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی کل تک جھولے میں تھا۔

آپ دیکھتے کہ ان کے اس جواب میں کتنا گہرا طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ ابھی کل ہمارے ہاتھوں میں پیدا ہوا، اس سے ہم کیا بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی اس بات کو قابل اعتناء نہ سمجھا اور خود

ہی جواب دیا کہ

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ قَدْ اتَّبَعْتُ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَجَعَلَنِي
مُبَارَكًا آمِينَ مَا كُنْتُ صَ وَ أَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَ بَرًّا بِوَالِدَتِي وَ كَرًّا بِجَبَارًا
شَقِيًّا ۝ وَ السَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَ يَوْمَ أَمُوتُ وَ
يَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۳۱-۱۹/۳۳)

اس پر عیسیٰ ان سے کہتے کہ (یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو
اس لئے تمہاری ہر بات کو سند تسلیم کر لیا جائے اور میں عمر میں چھوٹا ہوں اس لئے
تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے بگوش ہوش سنو) میں خدا کا
بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصب نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔

اس نے مجھے زندگی کے ہر گوشے میں بابرکت بنایا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے
کہ میں (تمہاری خود ساختہ شریعت کی جگہ) صلوٰۃ و زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم کروں اور عمر بھر
میرا یہی شعار رہے۔

(تم میری والدہ کے خلاف اس طرح زبان درازی کرتے ہو؟ اس نے جو کچھ کیا
ہے خدا کی سچی شریعت کے عین مطابق کیا ہے۔ اس لئے) میں اس سے ہمیشہ حسن سلوک
سے پیش آؤں گا۔ میں (معاذ اللہ) ایسا شقی و بد بخت نہیں (کہ تمہارے پیچھے لگ کر
ایک بے گناہ خاتون سے سختی سے پیش آؤں)۔

(تم میری پیدائش کو بھی قابل اعتراض قرار دیتے ہو! یہ تمہاری خود ساختہ شریعت
کا فیصلہ ہے۔ میں جس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں، اس کے نزدیک) میری پیدائش
بھی سلامتی کی مظہر ہے۔ میری ساری زندگی آخری دم تک 'سلامتی کی حامل' ہوگی اور
حیاتِ آخری میں بھی امن و سلامتی میں ہوں گا۔

اس جواب پر غور کیجئے۔ اس میں حضرت عیسیٰ نے اپنی پیدائش کے متعلق ایک حرف تک نہیں کہا! اس
لئے کہ سوال کسی غیر معمولی طور پر پیدائش کا نہیں تھا بلکہ اُن کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت مریمؑ نے رسمِ درہ

خانقہ چھوڑ کر عالمی زندگی کیوں اختیار کی؟ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ نے اپنی نبوت اور کتاب کی طرف اشارہ کر کے یہ بتا دیا کہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان رسوم خانقہیت کو دین خداوندی سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب تمہاری اختراعات ہیں۔ انہیں اس دین سے کچھ واسطہ نہیں جس کے تم مدعی بنے بیٹھے ہو، لیکن جسے تم نے درحقیقت کچھ کا کچھ بنا رکھا ہے۔ اس لئے حضرت مریمؑ نے تاہل کی زندگی اختیار کرنے میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ لہذا میں انہیں مورد الزام قرار نہیں دیتا۔ یہ تمہاری شقاوت اور قساوت قلبی ہے جو ایک عقیفہ کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لے رہے ہو۔ میں تو ایسا شقی القلب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ حسن سلوک کی مستحق ہے اور اس کے ساتھ میرا سلوک ایسا ہی ہوگا۔ وَبَرًّا بِوَالِدَيْنِیْ لَہٗ

لے انجیل میں اس کے برعکس یہ درج ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی والدہ سے درشتی سے پیش آیا کرتے تھے۔ مٹی میں ہے۔ جب وہ بھڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنی چاہتے تھے کسی نے اس سے کہا۔ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنی چاہتے ہیں ۱۵ اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔ (متی ۴۶ — ۵۰/۱۲)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وعظ میں حضرت عیسیٰ نے وہ عظیم نشان اصول بیان فرمایا ہے جس کی تبلیغ کے لئے تمام حضرات انبیائے کرام تشریف لاتے رہے، یعنی انسانوں کی تقسیم باعتبار کفر و ایمان نہ بلحاظ نسب و قومیت۔ لیکن اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ یا تو حضرت مسیحؑ کی والدہ آپ پر ایمان نہیں رکھتی تھیں اور ”آسمانی باپ“ کی مرضی پر نہیں چلتی تھیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ میری ماں وہ نہیں۔ میری ماں (اور بھائی) یہ لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عیسائیوں کے ہاں مریمؑ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور اس کے بعد حضرت مریمؑ کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے! اور اگر یہ غلط ہے تو پھر حضرت مسیحؑ کے اس سلوک کو کیا کہئے؟ (بہر حال یہ استفسار عیسائی حضرات سے ہے۔)

قرآن کریم نے حضرت یحییٰ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرتے تھے اور سرکش و (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ حضرت مریمؑ نے مسلک خانقاہیت ترک کر دینے میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا اس لئے نہ آپ اور نہ آپ کا لڑکا کسی طعن و تشنیع کا مورد قرار پاسکتا تھا۔ اسی لئے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ پر اپنا انعام قرار دیا ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ
وَالِدَتِكَ إِذْ أَبَدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ فَكَلِمَةُ النَّاسِ
فِي الْمُهْدِ وَكَهْلًا ۖ (۵/۱۱۰) نیز (۳/۴۶)

اور جب اللہ کہے گا، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو نعمات کئے ہیں انہیں یاد کرو۔ جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے وحی کے ذریعے سے تمہیں تعزیت دی تھی۔ تم لوگوں سے چھوٹی عمر میں بھی (دعظ و نصیحت کی) باتیں کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی یعنی یہودیوں کی سازش کے علی الرغم تم نے عمر بھی بڑی پائی تھی)۔

❖

یہ ہیں ولادت حضرت مسیحؑ کے متعلق واقعات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ انہی کے پیش نظر عیسائیوں سے کہا گیا کہ جب حقیقت حال یہ ہے تو پھر انبیت کے عقیدہ کے کیا معنی؟

مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَأَمَّا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ وَ إِنَّ اللَّهَ رَبُّكُمْ
وَعَبْدُكُمْ ۚ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۱۹/۳۶-۳۵)

یہ بات خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے تاکہ وہ کاروبار خداوندی میں اس کا ہاتھ بٹائے، وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ حکم کرتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (اسے اپنے ارادے اور احکام کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مددگار کی ضرورت نہیں پڑتی)۔

(سابقہ صفحہ کا فٹ نوٹ) جبار نہ تھے (۱۹/۱۴)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اس خصوصیت کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔

(باقی رہا ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح خود خدا تھا، تو اس کی تردید کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے کہ خود مسیح کی دعوت یہ تھی کہ) میرا اور تمہارا سب کا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ سو تم سب اس کی محکومیت اختیار کرو۔ یہ ہے زندگی کی صحیح سیدھی اور متوازن راہ (۳/۵۰)۔

لیکن بایں ہمہ عیسائیوں نے باہمی اختلاف کیا (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اور اس قسم کا باطل عقیدہ لیکر بیٹھ گئے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَّشْهَدِ
يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۹/۳۴)۔

مگر پھر اس کے بعد ان کے مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ تو جن لوگوں نے حقیقتِ حال سے انکار کیا ان کی حالت پر افسوس! اس دن کے منظر پر افسوس جو آئے والا ہے اور جو بڑا ہی سخت دن ہوگا!

روح پھونکنے سے مراد | حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ میں اپنی ”روح پھونک دی“۔ فَنفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (۲۱/۹۱)۔ روح کے متعلق ”ابلیس و آدم“ (عنوان ملائکہ) میں بصراحت لکھا جا چکا ہے۔ آپ ایک مرتبہ متعلقہ مقام پر نگاہ ڈال لیجئے جہاں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس سے مفہوم امر الہی بھی ہے۔ پھر نفخِ روح سے یہ مراد نہیں کہ سچ مچ کوئی شے پھونک دی جاتی ہے۔ یہی نفخِ روح خود تخلیقِ انسانی کے ضمن میں بھی آیا ہے جس سے مراد اس بیہوش انسان میں جو ہر انسانیت کی بیداری (خدائی صفات کی نمود) ہے، دیکھئے ابلیس و آدم۔ عنوان ”انسان“ اور اس میں (۹۱-۹۲/۴۲) ۱۵/۲۹ ۳۸/۷۲۔ یہی نفخِ روح مولود حضرت مریمؑ کے متعلق ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ فَنفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (۲۱/۹۱) میں فیہا کی ضمیر مونث ہے لیکن سورۃ تحریم میں فَنفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا (۶۶/۱۲) آیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس مؤخر الذکر آیت میں فیہ کی ضمیر کا مرجع ’فرج‘ ہے (آیت قرآن کریم سے نکال کر دیکھئے)۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ فیہ میں (ضمیر مذکر) حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہے جن کا ذکر مستور ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حضرت عیسیٰ کو رُوحِ مَقْنُونُہُ نہ کہا گیا ہے (۳/۱۶۱)۔

مندرجہ صدر آیت میں حضرت عیسیٰ کو اللہ کا کلمہ کہا گیا ہے۔ نیز سورۃ آل عمران میں ہے
 اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ لِمَ يَمُرُّ بِكَ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ
 اِسْمُهُ النَّبِيُّ عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ
 وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ؕ (۳/۴۴)

اسی سلسلہ میں ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی
 خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح (اورا عیسیٰ ابن مریم ہوگا، دنیا میں
 صاحبِ وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

کلمہ کے معنی استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے عام ”بات“ کے معنوں میں (دیکھئے ۴/۹؛ ۲۲/۱۶) نیز کلمہ کے معنی ایسی بات کے بھی ہیں جس میں کوئی خصوصیت ہو۔ مثلاً قصۂ آدم میں ہے کہ مہوٹ
 کے بعد آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھ لئے (۲/۳۷)۔ نیز دیکھئے (۹/۴۰؛ ۲۶/۲۸؛ ۳۴/۴۳) اسی سلسلہ
 میں آگے قدم بڑھائیے تو کلمہ کے معنی بنیادی قانونِ خداوندی، نظریہ حیات، آئیڈیالوجی یا مشن اور مقصد
 زندگی کے ملیں گے۔ سورۃ ابراہیم میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا عظیم الشان اصول بیان کیا گیا ہے جس
 کی تشریح کا یہ موقع نہیں جس میں فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
 اُصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِى السَّمٰوٰتِ ۙ تُؤْتِىْ اُكْلًا كُلًّا حَمِيْمٌ
 بِاٰذِنِ رَبِّهَا ۙ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ
 وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ ۙ اجْتُمَعَتْ مِنْ فَوْقِ
 الْاَرْضِ قَالَهَا مِنْ قَرَارِهِ يُثْبِتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ
 الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِيْنَ
 وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ (۱۴/۲۷-۲۸)

ذرا غور کرو کہ ان ہر دو متضاد نظریاتِ حیات اور نظامِ ہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک
 مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال ایک عمدہ پھل دار درخت

کی سی ہے جس کی جڑیں (پاؤں میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فصنگ آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ (یعنی اسے معاشی زندگی میں مادی ممکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہمکنار ہو جن کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماورا ہے)۔

وہ درخت، قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح تجریدی اور نظری حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریہ زندگی اور نظام حیات کی مثال ایک ایسے نکتے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی ہو کہ اُسے جھنجکاہٹ اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ جو غلط نظام اخلاقی اقدار خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا، اسے ثبات و قرار نصیب نہیں ہو سکتا)۔

اس طرح اللہ اس محکم نظریہ زندگی کی رُو سے ایمان والوں کی جماعت کو ان کی دنیا کی اور آخری زندگی (دونوں) میں ثبات اور ممکن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں یہ سب کچھ اس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

بمعنی قوانین الہیہ | ظاہر ہے کہ خدا کے مخلص بندوں کی ان تدابیر و مقاصدِ عالیہ کے استحکام و برومندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور خود قوانینِ الہیہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انہیں استحکام و ثبات حاصل ہو۔ اس لئے قوانینِ الہیہ کے لئے بھی کلمات اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ النعام میں ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبْرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا
وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُم نَصْرُنَا وَنَاوَدْنَاهُم لَئِن لَّمْ يَکَلِّمُوا اللَّهَ
وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَايَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۱۶/۳۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول بھلائے گئے۔ سوائیوں نے لوگوں کے

جھٹلانے اور اذیت دینے پر استقامت سے کام لیا (اور اپنے کام میں لگے رہے) یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آپہنچی اور (یاد رکھو) یہ اللہ کا مقررہ قانون ہے (کوئی نہیں جو اس کے قوانین کو بدل دینے والا ہو اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

اور اللہ کے قوانین صدق و عدل سے پورے ہو کر رہتے ہیں۔
 وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَ عَدًّا ط اَوْ مُبَدِّلًا لِّكَلِمَتِهِ
 وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۱۱۵/۶)
 اور تمہارے پروردگار کا قانون سچائی اور انصاف کے ساتھ (پورا ہو کر رہے گا۔ یوں سمجھ کر کم پورا ہو گیا۔ اُس کے قوانین کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ (سب کچھ) سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی اس دنیا میں جماعتِ حقہ (حزب اللہ) کی کامیابی اور فائز المرامی اور حیاتِ اخروی میں سرخروئی و سرفرازی۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَ كَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ
 الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ط لَا تُبَدِّلُ اٰیٰتِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ
 هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۶۳-۶۴/۱۰)
 یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور زندگی ایسی بسر کی کہ برائیوں سے بچتے رہے۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی (کامرانی و سعادت کی) بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ کے قوانین اٹل ہیں کبھی بدلنے والے نہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فیروز مندی ہے جو انسان کے حصہ میں آ سکتی ہے۔

یہی وہ قانون (کلمہ۔ اصول) تھا جس کے مطابق ساحرین فرعون کو ناکامی اور حضرت موسیٰ کو کامرانی نصیب ہوئی۔ سورۃ یونس میں ہے۔

وَ يُحْيِي اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَتِهِ ۝ اَوْ كَرَّمَ الْخُرُومُونَ ۝ (۸۲/۱)
 وہ حق کو اپنے قوانین کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا۔ اگرچہ ان لوگوں کو جو مجرم ہیں

ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

اس لئے کہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خدا کے فرستادگان ہمیشہ غالب و منصور رہیں گے۔
وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۶/۱)
اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا قانون ہمارے بندوں (یعنی رسولوں) کی نسبت پہلے ہی سے
ہو چکا ہے (کہ وہ کامیاب ہو کر رہیں گے)۔

سورۃ انفال میں ہے۔

وَإِذْ يَعِدُّكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ
أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحَقِّقَ
أَنْتَحَى بِكَلِمَتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝ (۸/۴)

اور (مسلمانو!) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ (دشمنوں کی) دو جماعتوں
میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے کہ جس جماعت
میں لڑائی کی طاقت نہیں (یعنی قافلہ والی) وہ ہاتھ آجائے اور (خدا کا چاہنا دوسرا تھا)
خدا چاہتا تھا، اپنے قانون کے ذریعہ حق کو ثابت کر دے اور دشمنان حق کی جڑ بنیادیں کاٹ
کر رکھ دے!

لیکن تدابیر باطل کی جڑیں کٹنے کے لئے بہلت اور وقفہ ضروری ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ فَاخْتَلَفُوا ۖ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ فَبِمَا فِیْهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۱/۱۹)
اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے
پروردگار کی جانب سے ہی یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا کہ لوگوں کو آزادی عمل دی گئی ہے
تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔

سورۃ ہود میں ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ ۖ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۖ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَ إِلَهُكُمْ لَفِي شَكٍّ

مِنْهُ هُوَ يُبَيِّنُ ۝ (۱۱/۱۱۰)۔

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی۔ پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر تیرے پروردگار کا پہلے سے یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا، (یعنی یہ کہ دنیا میں ہر انسان کو مہلت عمل ملتی ہے) تو البتہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور اُن لوگوں کو اس کی نسبت شبہ ہے کہ حیرانی میں پڑے ہیں۔

سورہ طہ میں ہے۔

وَلَوْ اَوْ كَلِمَةً سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاجِلًا
مُتَسَيِّئًا ۝ (۲۰/۱۲۹)

اور (اے پیغمبر!) اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک قانون ٹھہرایا ہے تو اسی گھڑی ان پر (جرم کا) الزام لگ جاتا اور مقررہ وقت نمودار ہو جاتا!

اس سلسلہ میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔

(۱۸/۲۷) ۝ (۱۱/۱۱۹) ۝ (۱۰/۹۶) ۝ (۱۰/۳۳) ۝ (۱۸/۲۷)

آیات میں کلمہ یا کلمت کے جو الفاظ آئے ہیں انہیں آپ احکامِ الہیہ کہہ لیجئے یا اس کے وعدے یا قوانین بات ایک ہی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ سنکھیا مت کھانا، اس سے موت واقع ہو جائے گی، تو یہ ایک حکم بھی ہے اور قانون اور تنذیر بھی۔ جو اسے سچا مان لے گا بلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔ جو انکار کرے گا تباہ ہو جائے گا۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا الَّذِیْ
لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیِیْ
وَ یُمِیْتُ ۚ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْوَحِّیِّ الَّذِیْ
یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ کَلِمَتِهِ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۴/۱۵۸)

(خدا کا حکم) تھا جو قانونِ مشیت کے تابع پورا ہوا جیسے اللہ کا ہر امر ایک قاعدہ اور قانون کے ماتحت پورا ہوتا ہے۔ سورہ تحریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ لَهَا مِنَ الْغَنِيِّ ۖ (۱۳/۶۶)

اور عمران کی بیٹی مریمؑ جس نے اپنی عصمت و پاکدامنی کی حفاظت کی چنانچہ اُس (بچے) میں ہم نے اپنی روح پھونک دی اور اُس نے اپنے پروردگار کے احکام و قوانین کی تصدیق کی تھی۔ اور وہ تھی ہی مطیع و فرماں بردار لوگوں میں سے۔

یہاں کلمات کے معنی ”کتب“ (احکام) اور ”قانت“ (فرماں پذیر) سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ دو آیات بھی سامنے رکھ لی جائیں جو اس سے پہلے آئی ہیں تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی حضرت مریمؑ ایک نیک بخت اور پارسا، مجتہدہ عفت و عصمت اور پیکرِ ناموس و شرافت تھیں جنہوں نے اپنے اعمالِ حیات سے احکامِ الہیہ کی تصدیق کر دی۔ یہی کچھ حضرت یحییٰؑ کے متعلق فرمایا۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا لِّكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ (۳۹/۳)

پھر ملائکہ نے زکریا کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا اور کہا کہ خدا تمہیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اُس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا) بشارت دیتا ہے قانونِ خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہوگا، ایک بڑی جماعت کا سردار صاحبِ نظم و ضبط اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔

یہاں اگر کلمہ کے معنی وعدہ بھی لئے جائیں تو بھی مفہوم صاف ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش خدا کے اس وعدہ کی تصدیق تھی جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ سے کیا تھا کہ اسے ایک فرزندِ سعید و صالح عطا فرمائے گا۔ یہ معنی اگر حضرت مریمؑ پر بھی منطبق کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے وعدے جو اُس نے بنی اسرائیل سے کر رکھے تھے کہ تم میں ایک مسیحؑ پیدا ہوگا، ان کی تصدیق حضرت مریمؑ کی

وساطت سے ہو گئی۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہنے سے ان میں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کسی طرح بھی شان الوہیت پیدا نہیں ہو جاتی۔ کائنات کی ہر شے کلمۃ اللہ ہے اور انہی میں سے حضرت عیسیٰ ہیں۔

پیدائش عیسیٰ کے ضمن میں قرآن کریم کی ابھی ایک اور آیت باقی ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ
ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۳/۵۸)

دیہاں تک بات یہودیوں کے متعلق تھی۔ اب آؤ عیسائیوں کے اس دعوے کی طرف کہ ”عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے تھے اور اس لئے وہ خدا کے بیٹے ہیں“۔ سوان سے کہہ دو کہ یہ تمہارا ذہن کی تراشیدہ باتیں ہیں! خدا کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہر آدمی کی پیدائش کی ہوتی ہے۔ انسان کے سلسلہ پیدائش کی ابتداء مٹی (جمادات) سے ہوتی ہے اور پھر وہ خدا کی مقرر کردہ اسکیم کے مطابق مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکر بشریت میں آ جاتا

اے عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف انداز سے حضرت مسیحؑ میں صفات الوہیت کے قائل ہیں۔ ان میں اسکندریہ عیسائی آپ کو لوگاس یعنی ازلی کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ قرآن کریم نے کلمۃ اللہ کی تشریح فرما کر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا کہ حضرت عیسیٰ کے کلمۃ اللہ ہونے سے نہ ان میں شان الوہیت پیدا ہو سکتی ہے نہ ازلیت و سرمدیت۔ وہ کلمۃ اللہ ان ہی معانی میں ہیں جن میں اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ لہذا اللہ کے ایک برگزیدہ بندے اور بس!

فَسَأَلَ رَاتِي عَبْدُ اللَّهِ قَهْ أَتَنِى الْكِتَابَ وَجَعَلَنِى كَيْتَاہُ (۱۹/۳۰)

اُس نے کہا۔ ”میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔

عیسائیوں نے اس کے نظریہ پر اپنے فلسفہ الہیات کی ایک عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے جس کی رو سے یہ لوگاس (کلمۃ اللہ) تثلیث کے اقامت ثلاثہ کا اقنوم ثانی ہے۔ لیکن یہ فلسفہ یونان سے مستعار لیا گیا ہے اور اسے اس پیغام خداوندی سے کچھ علاقہ نہیں جس کے علمبردار حضرت عیسیٰ تھے۔ درحقیقت یہ سب شاخاں نے عقیدہ ابنیت کی پیداوار ہیں جس نے اللہ کے ایک رسول اور انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

ہے (۵۱/۲۲ ذ ۳۰/۲۰)۔ اسی طرح عیسیٰ کی پیدائش ہوئی تھی (۱) اس لئے نہ وہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق خدا ہے نہ خدا کا بیٹا۔

مثیل آدم سے مفہوم | بیان کیا جاتا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حضرت عیسیٰ کے متعلق شہ آئی عقائد پر بحث و تمحیص کی غرض سے نبی کریم کی خدمت

اقدس میں حاضر ہوا۔ سورہ آل عمران کی مندرجہ صدر اور اس سے متصل دو تین دوسری آیات اسی واقعہ کے متعلق بتاتی ہیں۔ آیت مندرجہ صدر میں چونکہ حضرت عیسیٰ کی مماثلت و مشابہت "آدم" سے بیان کی گئی ہے اس لئے اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ پیدائش "آدم" کی طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش بھی مافوق العادت طریق سے ظہور میں آئی تھی۔ لیکن اس آیت مقدسہ کو جب قرآن کریم کی دوسری متعلقہ آیات کی روشنی میں دیکھا جائے (جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) تو پھر محض اس مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت بطور الزامی جواب کے ہے یعنی عیسائیوں سے یہ کہا گیا ہے کہ بفرض محال (جیسا کہ تم کہتے ہو) اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہونے تھے تو بھی اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ ابن اللہ تھے۔ اگر بن باپ کے پیدا ہو جانے سے کوئی شخص ابن اللہ ہو سکتا ہے تو آدم جو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے ان کے متعلق کیا مانا جائے؟ انہیں تو ابن اللہ سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیئے! لیکن اس آیت میں ارشاد ہے کہ **إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ** یعنی "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے" اس سے ظاہر ہے کہ یہ الزامی جواب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے نزدیک حقیقت حال یوں ہے۔

ہم "ابلیس و آدم" میں بیان کردہ قصہ آدم میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ آدم جس کی تخلیق کا ذکر آیا ہے کبھی شخص واحد کا نام نہیں۔ بلکہ اس سے مراد خود نوع انسانی ہے جس کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ مدارج طے کرتے کرتے موجودہ شکل پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے شہ آئن کریم نے متعدد مقامات پر عام انسانوں سے یہی کہا ہے کہ تمہاری تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ تفصیل انسان اور آدم کے عنوانوں میں (ابلیس و آدم میں) گذر چکی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں آیات (۵۱/۲۲ ذ ۳۰/۲۰) دیکھ لیں۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ آدم (یعنی نوع انسانی) کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ لیکن ابتداء کو انتہا تک پہنچنے

کے لئے مختلف تدریجی مراحل طے کرنے پڑے اور یہی کُنْ فیکون ہے۔ اسی قسم کا کن فیکون حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہاں بھی مقصود ابتداء سے انتہا تک مختلف تدریجی مراحل طے کرنے سے ہے۔ حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے جب حضرت زکریا نے بیٹے کی موعودہ ولادت پر اظہارِ تعجب کیا تو ارشاد ہوا کہ تعجب کیا ہے! وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (۱۹/۹) اس سے پیشتر ہم تمہیں پیدا کر چکے ہیں، دراصل ایک تم کچھ بھی نہ تھے! اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا کی اپنی پیدائش عام حالات کے ماتحت ہی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت یحییٰ کی پیدائش ہوئی۔ یہی ارشاد مَثَلِ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ میں ہے۔

اس آیت کے صحیح مفہوم میں دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ آدم کے متعلق صحیح قرآنی مفہوم سامنے نہیں ہوتا۔ آدم کے متعلق (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) یہی سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مٹی کا پتلا بنا دیا اور اس میں جان ڈال دی۔ پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی اور ان دونوں سے پھر سلسلہ تخلیق آگے بڑھا۔ لیکن جیسا کہ عنوان آدم و انسان (ابلیس و آدم) میں بتصریح لکھا جا چکا ہے تخلیق انسانی کا یہ تصور ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی پیداوار ہے۔ قرآن کریم نے انسانی پیدائش کے متعلق نظریہ ارتقاء کی واضح تشریح کر دی ہے۔۔۔۔۔ اس کی روشنی میں آدم اور اس کی تخلیق کے متعلق حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ تخلیق آدم (یعنی نوع انسانی) کے متعلق اس حقیقت کو سامنے رکھتے پھر آیتہ زیرِ نظر (إِنَّمَا مَثَلُ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ) کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ یعنی (اے عیسائیو!) تم اپنے ذہن میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق کچھ بھی عقائد رکھو! اللہ کے نزدیک تو ان کی پیدائش نوع انسانی کی پیدائش کے مثل ہے جو اپنی ابتداء سے انتہا تک مختلف مدارج طے کر کے تکمیل تک پہنچی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہوا۔

أَنسَحَتْ مِنْ رَبِّكَ فَتَكُنْ مِنَ الْمُتَرَيْنِ ۝ (۳۵)

(اے پیغمبر! مسیح کے انسان ہونے اور اس کی پیدائش کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے، تو

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے امر حق ہے۔ سو تیرے لئے اس باب میں بحث مجہل

کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ کو مثل آدم اس لئے بھی کہا ہے کہ اناجیل کے بیان کے مطابق

حضرت عیسیٰ خود اپنے آپ کو ابنِ آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً انجیل متی میں ہے۔
تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو
وقت آپہنچا ہے اور ابنِ آدم گناہگاروں کے حوالے کیا جاتا ہے
(متی باب ۲۶ - آیت ۴۵)

لہذا جو اپنے آپ کو ابنِ آدم کہتا ہے اس کی پیدائش کی مثال خود آدم (آدمی) کی ہے۔ وہ آدمی کا بیٹا ہے
اور آدمی ہی کی طرح خود بھی پیدا ہوا ہے۔

ان سوالات کی اہمیت کیوں؟ | قرآن کریم سے یہ کچھ سمجھ سکے ہیں لیکن اگر آپ ان

نتائج سے متفق نہ ہوں تو شرابی آیات آپ کے سامنے ہیں (جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے)۔ آپ
ان پر از خود غور کیجئے کیونکہ قرآن ہر ایک کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی
اثرات کو داخل نہ ہونے دیجئے کہ اللہ کی کتاب محکم اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس باب میں آپ کی
قلبی کیفیات کا ہمیں پورا پورا اندازہ ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل (بالخصوص وفات و حیات حضرت مسیح)
کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر شخص کا اس بحث میں اُلجھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ آپ غور
کیجئے تو حضرت عیسیٰ کی وفات علمی دنیا میں ایک تاریخی سوال اور دنیا کے مذہب میں قرآنی مسائل میں سے
ایک مسئلہ ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے متعدد دیگر مسائل کو غور و فکر اور تاریخی انکشافات کی روشنی
میں سمجھا جاسکتا ہے اسی طرح اس پر بھی غور و تدبر ہونا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اسے حیثیت حاصل
نہیں۔ عیسائیوں میں یہ مسئلہ ان کے مذہب کی بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ان
کے ہاں اس کی خاص اہمیت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سوال دین کے اصول و
اساس میں سے نہیں۔ لیکن دورِ حاضرہ میں (بالخصوص بعض مخصوص مقاصد کے ماتحت) اسے اس قدر
اہمیت دی گئی ہے کہ اس سوال کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ جب آپ سنجیدگی سے
اس سوال پر غور کریں گے یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ جب کسی قوم کے سامنے زندہ نصب العین
حیات نہیں رہتا تو کس طرح اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ کس طرح اپنا سارا وقت
منطقی موشگافیوں اور دُور از کار فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں میں صرف کرتی اور ان لا حاصل نظری مباحث کو

خاص اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا واضح نصب العین اور ان کے قلوب میں اس کے حصول کی تڑپ تھی وہ اس قسم کے مباحث میں کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ آپ صدی اول کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جب ایک مختصر سی جماعت نے ہر طاغوتی قوت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ آپ کو کہیں اس قسم کے نظری مسائل کی خاردار جھاڑیاں نظر نہیں پڑیں گی جو ان کے دامن خیال و قوت کو اُلجھا کر بے گانہ منزل بنادیں۔ اس وقت ہوتا یہ تھا کہ ان کے خدا نے ایک حکم دیا، مرکز لے اس کی تشکیل فرمادی اور انہوں نے اس کی تکمیل کر کے دکھادی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

دنیا کی کوئی قوت نہ تھی جو اس بے پناہ جذبہ عمل و اطاعت کے سامنے ٹھہر سکتی۔ لیکن اس کے بعد جب دور انحطاط

نظری مسائل اور مسلمان

شروع ہوا تو شکست خوردہ طاغوتی قوتوں نے ادھر ادھر سے سر نکالا۔ قیصریت، برہمنیت، کورانہ تقلید کی لعنت ایک ایک کر کے ان کے قلب و نگاہ کی دنیا پر مسلط ہو گئی۔ اسی کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور ایران و روما کے زخم خوردہ جیوش و عساکر اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے انتقام کے لئے صف آرا ہو گئے۔ اب میدان جہاد کی جگہ مناظروں کے اکھاڑوں نے لے لی اور شرابی نظام کی جگہ عجیبی تصورات زندگی نے۔ عیسائی احبار اپنے ”خدا سے مصلوب“ کے چھنے ہوئے مقام الوہیت کی بازیابی کی فکر میں تھے۔ انہوں نے اپنے عقائد کو اس طرح غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی ذہنیت پر ترسم کرنا شروع کیا کہ کچھ عرصے کے بعد وہی عقائد ان کے اجزائے دین بن گئے اور یہود و نصاریٰ کی منظم سازشوں سے روایات کی شکل اختیار کر گئے۔ قرآن پیچھے چلا گیا اور اس قسم کی وضعی روایات آگے بڑھ آئیں اور یوں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

اس کے بعد معاند قوتوں کی مسلسل کوشش رہی کہ مسلمان ان نظری مسائل کی خاردار جھاڑیوں سے نکلنے نہ پائیں۔ اپنے ہاں تو انہوں نے تقسیم عمل کا اصول رائج کر لیا جس کی رُو سے پوری کی پوری قوم حصول قوت و سطوت میں سہ گرم عمل رہتی لیکن کچھ لوگ اس غرض کے لئے الگ کر دیئے جاتے کہ وہ مسلمانوں کو مناظروں کی تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہیں۔ اس طرح ہوا یہ کہ

یاں لعلِ فصول ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

خود فریب و حقیقت فراموش مسلمان سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گذشتہ زمانے میں کیا کچھ ہوا اگر آپ اس کے سمجھنے کی زحمت نہ بھی گوارا کریں تو بھی جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اسی سے اندازہ لگائیجئے کہ یہ کچھ کس طرح ہوا؟ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ گذشتہ پچاس سال سے جبکہ پرانی دنیا ایک پورے انقلاب سے گزر کر یکسر نئی دنیا میں تبدیل ہو چکی ہے اور صفحہ ارض پر ایک عجیب ہنگامہ رست و خیز برپا ہے، ہندی (اور اب پاکستانی) مسلمان کی ساری قوتیں اس عقدہ کے حل کرنے میں صرف ہو رہی ہیں کہ

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے؟

”جدید نبوت!“ سادہ لوح مسلمان دورِ حاضرہ کی ”جدید قادیانی نبوت“ کی کامیابی و ناکامی کے اندازے مردم شماری کے اعداد و شمار سے لگاتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے کہ دس کروڑ کے سمندر میں اس ”نبوت“ کے متبعین کی تعداد چند قطروں سے زیادہ نہیں۔ لیکن وہ نہیں سوچتا کہ اس ”نبوت“ نے کس طرح اس بحرِ زخار کو اس کی اپنی ہی موجوں کے طلسمِ پیچ و تاب میں الجھائے رکھا اور یوں اس کی وہ قیامت خیز تلاطم انگیزیاں جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھیں، اپنے ہی بھنور میں گھر کر ضائع ہو گئیں۔ کیا یہ کامیابی چھوٹی کامیابی ہے؟ مسلمان اس نصف صدی کی رونداد پڑھ کر خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بحث و جدل کا فلاں میدان مارا اور ہمارے فلاں مولوی صاحب نے فلاں مناظرہ جیتا اور آسمان اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ

اس سرابِ رنگِ بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اُسے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس تمام طلسمِ پیچ و تاب کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ چند روایات جن میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بحمدِ عمری آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ زندہ ہوں گے۔ ان چند روایات نے آج تک مسلمانوں کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر صدی کے اخیر پر ایک مجدد اور پھر ایک ”مہدی آخر الزماں“ کی آمد سے متعلقہ روایات۔ مسلمانوں کی حالت یہ

”آنے والے“ کا عقیدہ | ہے کہ ایک ”آنے والے“ کے لئے کھڑکی خود کھول دی۔ لیکن جب کوئی اس کھڑکی کے راستے اندر آیا تو اس کے ساتھ گنہگار گنہگار ہونا شروع ہو گئے۔ ان سے پوچھئے کہ جس دروازہ کو ”ختم نبوت“ کے عظیم الشان قفل نے بند کیا تھا اس میں اس قسم کے دریچوں اور کھڑکیوں کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ”اس جدید نبوت“ کی بحث کا مدار کیا ہوتا ہے؟ پہلے قرآن کی رو سے ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں۔ بہت اچھا۔ بات ختم ہو گئی! لیکن بات تو اس کے نزدیک ختم ہو جائے جو قرآن کریم کو دین کا مدار مانے۔ اب وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے کہ فلاں روایت میں حضرت عیسیٰ کے آنے کی خبر موجود ہے۔ اس لئے وہ آنے والا ”مسیح ابن مریم“ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مثیل ہو گا اور وہ مثیل مسیح تشریف لے آئے ہیں۔ بس یہ ہے ساری گنتی۔ اور اس کا حل؟ کس قدر آسان!! یعنی ان سے کہیئے کہ

(i) آپ مانتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے اور ان کے دوبارہ تشریف لانے کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اس لئے

(ii) کوئی روایت جو حضرت عیسیٰ کی آمد کی خبر دیتی ہے، وضعی اور جھوٹی ہے جو ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتی۔ اب فرمائیے کیا ارشاد ہے؟

لیجئے بحث ختم ہو گئی۔ لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ ان روایات کو محکم اور اٹل سمجھا جاتا ہے اور قرآنی آیات کے معانی اس طرح کئے جاتے ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح وہ روایات سچی قرار پا جائیں۔

مسلمان کی زندگی | جب تک آپ کی یہ روش ہے قیامت تک کے لئے مدعیان مسیحیت و مہدویت آتے رہیں گے اور آپ کو انہی لاطائل مسائل میں الجھا الجھا کر ختم کر دیں گے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو اس جھگڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ تو ”مدعی نبوت و مہدویت و مجددیت“ کا ذکر کرتے ہیں، قرآن کے نزدیک عام مسلمان ہونے کے لئے جو معیار ہے ذرا اُسے سامنے لائیے اور پھر آئینے میں دیکھئے کہ اس میں ہمارے خط و خال کیا کہتے ہیں؟

قرآن کا ارشاد ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝

(۵/۴۴)

اور جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو کافر ہیں (یعنی حق سے منکر ہو گئے ہیں)۔

أَلَمْ يَشْرَأْ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِمْ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۱ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن (عمل کا حال یہ ہے کہ) چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس سے انکار کریں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہِ راست سے دُور جا پڑیں۔

فرمائیے جو شخص یا قوم اس روش زندگی پر نہ صرف قانع ہی ہو بلکہ اس کے استحکام میں ساعی بھی ہو اس سے "کفر و اسلام" پر بحث کیسی؟ آپ "نبوت" کہتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کی اس روش پر قائم رہتے ہوئے اپنا اسلام تو ثابت کرو؟

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے؟ گریباں سے

آپ شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام محض چند عقائد و رسوم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نظامِ اطاعت و حکومت ہے جسے عملاً دنیا میں رائج و نافذ ہونا ہے۔ اس نظام میں اطاعتِ محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ یہ ہے کہ ایک مرکز کے تابع قرآنی احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ حضراتِ انبیائے کرام دنیا میں بھی کرتے رہے۔ یہی ان کا مشن تھا۔ ختمِ نبوت کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنا اسلام کے متبعین کا فریضہ تھا۔ آج بھی اگر کسی کے لئے کوئی کام صحیح معنی میں ایمان و عمل کا مظاہرہ کہلا سکتا ہے تو یہی ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہی ایک کسوٹی ہے جس پر صحیح پرکھ ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسروں سے کیا کہیے؟ یہ حقیقت خود ہمارے

ہاں کے ارباب مذہب کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مسلمان کی زندگی کیا ہے۔ ان کے نزدیک بھی ”نجاست“ کا دار و مدار آئین بالجہر و خفی، رفع یدین، فاتحہ خلف الاسام، حیات و ممات مسیح کے مسائل پر ہے۔ اس لئے دونوں فریق انہی نظری مسائل کی بحث میں غوش ہیں۔ جیسے وہ ویسے ہم ے

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من	جگر گرمی صحرا نہ تو داری و نہ من
دل و دیں در گرد زہر و شانِ بجمی	آتش شوقِ سلیمی نہ تو داری و نہ من
خونہ بُود کہ از ساحلِ دریا چیدیم	دانہ گوہر بیکتا نہ تو داری و نہ من
بہ کہ بانور چہ راغِ تہِ داماں سازیم	طاقتِ جلوة سینا نہ تو داری و نہ من

عیسائیوں کا غلو عیسیٰ کی شان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا۔ یہی مبالغہ سینٹ پال کے وقت حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ نیقیہ کی کونسل نے اسے عقائد کا رنگ دیا اور ٹرنٹ کی کونسل میں اس نے اس ایمان کی صورت اختیار کر لی کہ:

ہم ایمان لائے (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور (۲) رب یسوع مسیح ابنِ اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے، الہ، الہ ہے اور نور نور ہے، عین خدا ہے، مولود ہے مخلوق نہیں، باپ اور اس کا جوہر ایک ہے،..... ہم انسانوں کی بنیاد کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا..... (مزید تفصیل مذکور عالم کی آسمانی کتابیں میں ملے گی)۔

جب حضرت مسیحؑ کو یہ مقام دیا گیا تو حضرت مریمؑ کا مقام خود تصور میں آسکتا ہے۔ چنانچہ آپ کے متعلق ”مقدس کلیسا“ کا یہ فیصلہ ہے کہ:

وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالک ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمہ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے اس

لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی..... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس

سے کہتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔ CATHOLIC SCHOOL BOOK P-۱۵۸

حشی: سپنگر کے بیان کے مطابق آج بھی رومن کیتھولک کے ہاں رسومات اور دعاؤں میں (حضرت) مسیح کا درجہ ان کی والدہ سے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔ (جلد دوم ص ۲۲۳)

۱۹۵۰ء میں پوپ (پائیس ۱۲) نے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ (حضرت) مریم بھی اپنی وفات کے بعد بہ جسدِ عنصری آسمان پر اٹھالی گئی تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں پرستش کی رسومات میں ”ملکہ مریم“ کے عنوان سے ایک جدید تقریب کا اضافہ کیا گیا۔ حضرت مسیح کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود قرار دیا گیا اور ۱۹۶۲ء میں حضرت مریم کو ”مادرِ کلیسا“ کے ممتاز ترین لقب سے نوازا گیا۔

CRAVERI P-۱۱۲، ۱۱۳

لیکن ان عقائد کے متعلق اب عیسائی محققین کی روش کیا ہے،
ان کی موجودہ روش اس کا اندازہ ایک مشہور مسیحی عالمِ دینیات ریورینڈ چارلس اینڈرسن

اسکاٹ کے اس مضمون سے لگائیے جو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں شامل ہے۔ اس مقالہ میں وہ لکھتا ہے کہ

پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رو سے فیضیاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر رومی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ ”پطرس نے اس کو مسیح تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی (متی باب ۱۶)۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ وہ ”خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا“ (لوقا ۱۹/۲۴)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ ”مرقس“ کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لئے لفظ خداوند (LORD) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی

انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لئے بشارت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کی شایان شان ہے، مگر مرقس کی ”قدیمہ“ والی عبارت (مرقس ۱۰/۴۵) اور آخری فصیح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے، حقیقی کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا گناہ یا کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے!

یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، متعدد عباراتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ”گر مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ مسکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو“ (لوقا ۱۳/۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر ”ابن آدم“ کے نام سے کرتا ہے۔..... یسوع کہیں اپنے آپ کو ”ابن اللہ“ نہیں کہتا اور اس کے دوسرے ہم عصر بھی جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو ”مسیح“ سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً بیٹے کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔..... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لئے بھی ”باپ“ کا لفظ اسی اطلاقِ شان میں استعمال کرتا ہے۔..... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا، البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:-

عیدِ پنکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ ”ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا، یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔..... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جہانی ذہنی

نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک لگتی تھی۔ وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا۔ اس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے..... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گذریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جاسکتی، تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گذرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختار نہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ ”یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی“ اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات قطعاً خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کی تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانے سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے۔

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہٴ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ”ابن اللہ“ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا..... یہ ”ابن اللہ“ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی انیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو ”خدا کا بیٹا“ کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جاسکتا کہ آیا

وہ ابتدائی عیسائیوں کا ایک گروہ تھا یا پال تھا جس نے مسیح کے لئے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الہ کر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند یہوواہ (اللہ تعالیٰ) کے لئے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متحدہ حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" میں ریلورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔

باب، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات میں مغلوب ہو چکا تھا) اور سکند خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بناءً کئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدہ میں درج ہے جو نیقیہ کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

اسی سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے۔

تیسری صدی عیسوی کے خاتمے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جہدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بھرت عیسائی لیے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطلاح کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجتم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں لیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات، بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس میں اتنا اور اضافہ کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ حیثیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف حیثیتوں کا حامل ہے..... اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل و کرم کے مسئلہ پر خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخر کار

۵۲۹ء میں اور نیچ کی دوسری کونسل میں..... یہ نظریہ اختیار کیا گیا تھا کہ بہوٹ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے نئی زندگی نہ حاصل کر لے اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانتا اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔

اور انسائیکلو پیڈیا بلیکا میں مذکور ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کنواری سے پیدا ہونے کا عقیدہ ہمیں کفارہ کے دائرہ میں لے جاتا ہے۔

کفارہ کا عقیدہ | جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ابنیت اور الوہیت وغیرہ کے عقائد درحقیقت بنیاد ہیں کفارہ کے عقیدہ کی اور کفارہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر بچہ آدم و حوا کے اولیں گناہ کی وجہ سے فطرتاً گناہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطرت کی یہ خباثت ازلی کسی عمل سے دھل نہیں سکتی۔ اس کے لئے یہ ایمان ضروری ہے کہ خدا بہ شکلِ مسیح دنیا میں آیا اور اس نے انسانوں کی نجات کے لئے اپنے آپ کو صلیب پر لٹکوا دیا۔ یوں اس کی شہرانی نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔ اس عقیدہ کی رو سے ہر انسانی بچہ کی فطرت کو گناہگار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ عیسائی اس عقیدہ کا ماخذ خود حضرت مسیح کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ

کئی بالواسطہ طریقوں سے حضرت مسیح بھی انسانی قلب کے فطری طور پر گناہگار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

بڑے بڑے نامور عیسائی مصنفین اس عقیدہ کی اہمیت اور صداقت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے

AFTER STRANGE GODS,

اپنی کتاب

T.S.ELIOT

میں۔ مسٹر

میں لکھتا ہے۔

میرے نزدیک ”فطری گناہ“ کا عقیدہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے۔

ایک بہت بڑا عیسائی مشنری DOOLITTLE چین گیا اور وہاں برسوں تک عیسائیت کی تعلیم کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن ان سے فطرتِ انسانی کی ازلی خباثت کے عقیدہ کو منوانہ سکا۔ چنانچہ وہ اہل چین کی اس ”جہالت“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ یہ بد بخت مخلوق بائبل کے اس عقیدہ کی معقولیت اور صداقت کو تسلیم نہیں کرتی۔

THE SOCIAL LIFE OF CHINESE

پادری صاحب کو تعجب تھا کہ چین کے ”جہلا“ ایسی معقول تعلیم کی صداقت کو نہیں مانتے، لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ چار ہی روز بعد خود ان کے اپنے ہاں کے اربابِ دانش و پیش بھی اسکی ”معقولیت“

سے انکار کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ R.C. JOHNSTON اپنی کتاب CONFUCIANISM

WESTMINSTER CONFESSION AND MODERN CHINA میں

کے حوالہ سے لکھتا ہے۔

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت ”ازلی خرابی“ ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

سرہنری جونسن (اپنی کتاب A FAITH THAT ENQUIRES میں اس عقیدہ

کی تردید و تکذیب کے بعد ”فطرتِ انسانی“ کے نیک ہونے کے عقیدہ کا اعلان کرتا ہے۔

SIR JAMES JRVINE

میں کہا کہ

جو چیز میرے دل میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ میرے تجربہ نے میرے اس احساس کو اور بھی زیادہ شدید کر دیا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نیک ہے۔

TIMES, LONDON
20-1-1933

اپنی کتاب

WILLIAN MCDGOOGALL

مشہور عالمِ نفسیات

میں لکھتا ہے۔

CHARTER AND THE

CONDUCT OF LIFE

اب دورِ حاضر کے بچے کی عزتِ نفس کو شروع ہی سے اس عقیدہ سے ٹھیس نہیں لگائی جاتی کہ وہ فطرثاً بد واقع ہوا ہے بلکہ اب اس کی تربیت اس کلیتہ کے ماتحت عمل میں آئی ہے کہ وہ فطرثاً نیک ہے اور وہ ایک مہذب اور شستہ ماحول میں یقیناً نیکی، سچائی اور حسن کا متلاشی ہوگا یہ یقیناً فوزِ عظیم ہے۔

مستر A.E. TAYLOR لکھتا ہے کہ ”یہ عقیدہ ایک بطلان ہے“ اور میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرتِ انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچالے۔

MIND JULY 1912

غور کیا آپ نے کہ دنیا تے عیسائیت کے یہ اراکین و عمائد اپنے ان غیر فطری عقائد سے تنگ آکر فطرت کی صحیح تعلیم کے لئے کس طرح مضطرب اور بے قرار ہیں؟ مسٹر ٹیلر کسی ایسے مذہب کی تلاش میں دیوانہ وار پھر رہے ہیں جو خدا کی وحدانیت اور فطرتِ انسانی کے خیر ہونے کی تعلیم دے اور تسلیم بھی علی وجہ البصیرت دے۔ اے کاش! کہیں مسٹر ٹیلر کے سامنے قرآن کریم ہوتا تو اسے اس حیرت و حیران نصیبی سے یوں مضطرب و حیران نہ ہونا پڑتا۔ وہ قرآن جس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو احسن تقویٰ میں پیدا کیا گیا ہے (۹۵/۴) اور اسے عزت و تحریم عطا کی گئی ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۴/۴۰) اور جس نے بر ملا کہہ دیا کہ اس کی نجات و سعادت اور شقاوت و بد بختی کا فیصلہ یکسر اس کے اپنے اعمال پر ہے (لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى) (۵۳/۳۹) اور ”آدم“ (یا کسی اور) کا گناہ کسی دوسرے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا (أَلَوْ تَشَاءُ رَاَوْنَا زَيْنَ الْمُحْزَنِي (۵۳/۳۸) اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ ہماری دعوت علی وجہ البصیرت دعوت ہے (أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ (۱۲/۱۰۸) یہ حقائق اگر مسٹر ٹیلر کے سامنے ہوتے تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اُسے جس چشمہ زندگی کی تلاش ہے وہ کہاں مل سکتا ہے؛ لیکن یہ حقائق ان لوگوں کے سامنے ہیں یا نہیں، غور طلب چیز تو یہ ہے کہ دنیا کس طرح کشاں کشاں طوعاً و کرہاً (اپنے غلط معقولات و تصورات کو چھوڑ کر) اسلام کی تعلیم کی طرف بڑھے چلی آ رہی ہے۔ (تفصیل اس کی ”ابلیس و آدم“ میں ”وحی“ کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیے) عیسائیت کا سارا مدار

اس عقیدہ پر ہے کہ انسان فطری طور پر گناہوں سے ملوث ہے اور اب دنیا علیٰ وجہ البصیرت اس عقیدہ کا بطلان کر رہی ہے اور یہ سب قرآن کی تعلیم کی بنا پر ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر ذہنوں کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَ ذَهَبَ الْبَاطِلُ ۖ (۱۷/۸۱)۔

ایک اور آیت | واقعہ تصلیب سے متعلق سورہ نسا کی حسب ذیل آیات پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ
وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ
اِخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا
اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۚ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۚ وَ إِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا
لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَيُكُونُ عَلَيْهِمْ
شَرِيفًا ۚ (۱۵۷-۱۵۹)

ان آیات کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے (سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا، بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں ان کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں اور یقیناً انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کر لیا اور اللہ سب پر غالب رہنے والا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اور (دیکھو) اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہو گا جو اپنی موت سے پہلے اُس پر ضرور ہی یقین نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ (اللہ کے حضور) ان پر شہادت دینے والا ہو گا۔

ان میں سے آیات ۱۵۸-۱۵۹ کی تشریح تو پہلے گذر چکی ہے۔ آیت ۱۵۹ غور طلب ہے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودی اور عیسائی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ حضرت عیسیٰ کی موت صلیب پر واقع ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور واضح الفاظ میں فرمادیا کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ”اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا جو اپنی موت سے قبل اس (حقیقت) پر یقین نہ لے آئے۔“ ظاہر ہے کہ اس سے مراد نزول قرآن سے لے کر قیامت تک کے تمام اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ چیز خلاف مشاہدہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو نزولِ آیت کے وقت مخاطب تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور وہ حضرت مسیحؑ کے متعلق اس صداقت پر ایمان لے آئے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے، لیکن ایسے یہود و نصاریٰ بھی تو تھے جو مسلمان نہیں ہوئے اس لئے یہ قیاس بھی درست نہیں۔

بعض حضرات اس سے مفہوم یہ لیتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت تمام اہل کتاب ان کی (حضرت مسیحؑ کی) موت سے پیشتر ان پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن یہ مفہوم (جیسا کہ تصریحات سابقہ سے ظاہر ہے) دور از کار ہے۔ اس لئے کہ جب نزولِ حضرت عیسیٰ کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں تو یہ خیال اپنی طرف سے بڑھا کر دیگر آیات کا مفہوم اس کے مطابق متعین کرنا قرآن فہمی نہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ”اہل الکتاب“ سے مراد صرف عیسائی ہیں۔ عیسائی اپنے مرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ کے کفارہ کا اقرار کرتے ہیں اور اسی سے ان کی نجات ہوتی ہے (بلکہ پادری اگر ان سے اس امر کا اقرار لیتا ہے) کفارہ کے معنی یہ ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ، صلیب پر جان دے کر دیا۔ یعنی ہر عیسائی مرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ کے صلیب پر جان دینے کا اقرار کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ خود عیسائیوں کو بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ صلیب کا واقعہ کیا تھا اور جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت مسیحؑ ہی تھے یا کوئی اور، لیکن اس کے باوجود ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کہ فی الواقع حضرت مسیحؑ ہی کو صلیب دی گئی تھی اس قدر محکم ایمان رکھتے ہیں کہ جب تک مرنے سے پہلے اس ایمان کو دہرانہ لیں، اپنی بخشش کا یقین نہیں کرتے۔ جب یہ اپنی بخشش کے لئے خدا کے سامنے جائیں گے تو اس وقت حضرت مسیحؑ ان کے خلاف

شہادت دیں گے کہ انہوں نے یہ عقیدہ کیسے وضع کر لیا تھا؟۔

دشمن سے محبت یا عدل؟ | ایک چھوٹی سی بات اور بھی۔ انجیل کی تعلیم (منسوب الی حضرت عیسیٰ) یہ ہے کہ ”دشمن سے محبت کرو“ (متی ۵/۴۴)

یہ تعلیم بڑی خوش آئند اور نگاہ فریب نظر آتی ہے۔ لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ انسان سے اس کا تقاضا کسی طرح بھی درست ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی دھڑکنے والے دل سے ممکن بھی ہے کہ وہ اپنے دشمن سے محبت کرے۔ محبت ایک لطیف جذبہ ہے جس کا سرچشمہ ہم آہنگی و یگانگت ہے۔ عداوت اور محبت ایسے متضاد و متباہن جذبات کا نام ہے جن میں کسی صورت میں بھی ہم آہنگی و یگانگت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ مطالبہ انسانی جذبات کے خلاف ہے اس لئے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی نے دشمن سے محبت کی ہو۔ خود حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں دنیا میں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ باپ کو بیٹے سے اور ماں کو بیٹی سے جدا کرانے۔ ظاہر ہے کہ یہ قطع و برید بنا پر عداوت ہی ہوگی نہ کہ محبت کا نتیجہ (ذاتی عداوت و محبت نہیں بلکہ اصولی فرق کے مطابق)۔

اس کے برعکس دیکھئے قرآن کریم نے دشمن کے متعلق جو تعلیم پیش کی ہے وہ کس قدر شرفِ انسانیت پر مبنی اور ممکنِ العمل ہے۔ فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْسَیْ لَکُمْ (۵/۸)

اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے اٹھار دے کہ (اس کے ساتھ) عدل نہ کرو۔

غور کیجئے۔ دشمن سے عدل کرنا ناممکن نہیں، محبت کرنا ناممکن ہے۔ ”دشمن سے بھی انصاف کرو“ کس قدر

بلند اصول ہے اور کیسا ممکنِ العمل! اس باب میں مشہور عالمِ اجتماعیات

WILLIAN A. BREND اپنی کتاب FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS میں لکھتا ہے کہ

”انجیل کا یہ حکم کہ دشمن سے بھی محبت کرو ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے“ (ص ۳۷)۔

حضرت عیسیٰ کا تذکارِ جلیلہ اور اُس کے تضمینات ختم ہو گئے۔ یہاں ہم نے دیکھ لیا کہ یہودیوں کے بعد عیسائیوں کو اُن کا جانشین بنایا گیا۔ لیکن انہوں نے بہت جلد توحید کو چھوڑ کر مشرکانہ عقائد اپنے ہاں داخل کر لئے کہ یہ کسی طرح بھی انعاماتِ البتہ کی وراثت کے مستحق نہ رہے۔ اس لئے خدا کے غیر متبدل قانون کی رُو سے یہ انعامات اُن سے چھین کر اس جماعت کے حوالے کر دیئے گئے جنہیں اللہ نے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا، اس کی تفصیل معراجِ انسانیت میں ملے گی۔ یہاں صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورہ مریم میں ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَكِيلٍ ۚ سُبْحٰنَهُ ۚ اِذَا قَضٰى
اَمْرًا فَاَنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ
وَرَبَّكُمْ فَاَعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝
الْاَوْحٰزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ قَوْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدٍ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصُرْ ۚ يَوْمًا تَوْنُنَا لَكِنِ
الظَّالِمُوْنَ الْيَوْمَ فَرٍى ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۵ - ۱۹/۳۸)

یہ بات خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے (تاکہ وہ کاروبارِ خداوندی میں اس کا ہاتھ بٹائے) وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو وہ حکم کرتا ہے کہ 'ہو جا' اور وہ ہو جاتا ہے (اُسے اپنے ارادے اور احکام کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مددگار کی ضرورت نہیں پڑتی)۔

(باقی رہا ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح خود خدا تھا، تو اس کی تردید کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے کہ خود مسیح کی دعوت یہ تھی کہ) 'میرا اور تمہارا سب کا نشوونما دینے والا' اللہ ہے۔ سو تم سب اس کی محکومیت اختیار کرو۔ یہ ہے زندگی کی صحیح سیدھی اور منوازن راہ (۳/۵۰۱)۔

اُس کی تعلیم تو یہ تھی، لیکن اس کے بعد اس کے متبعین میں سے مختلف فرقے، آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے اصل حقیقت سے انکار کیا ہے ان پر

بیدار فوس ہے۔ اُن کی اُس دن کیا حالت ہوگی جب حقیقتِ حال مشہود ہو کر سامنے آجائے گی: وہ وقت ان کے لئے بڑا ہی سخت ہوگا۔

(آج تو یہ لوگ، خدا کے ایک رسول کو خود خدا یا اس کا بیٹا بنا کر) اس قدر ظلم کر رہے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کئے، غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں، لیکن اعمال کے ظہورِ نتائج کے دن یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اُس وقت ان کے کان کیسے سننے والے اور ان کی آنکھیں کیسی دیکھنے والی بن جائیں گی! (۵۰/۲۲)۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْقُرْ وُ هُمْ فِي
غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۹/۳۹)

اور (اے پیغمبر!) انہیں اُس (آنے والے) دن سے خبردار کر دے جو بڑا ہی بچھٹانے کا دن ہوگا اور جب ساری باتوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس وقت تو یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور اس بات پر یقین لانے والے نہیں۔

یہ ”یوم الحسرت“ کونسا تھا؟ وہ دن جب بیت المقدس کی کنجیاں عیسائی اجبار و رہبان کے ہاتھوں سے اور ان کا تخت و تاج قیصر (ہرقل) کے قبضہ سے نکل کر عربوں کی اونٹ چرانے والی صحرائیں قوم کے سپرد کیا گیا کہ وراثتِ ارض کا فیصلہ اللہ کے قانونِ مشیت کے تابع ہوتا ہے۔

اِنَّا خَنْنُ نَهِثُ الْاَرْضِ وَّ مَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۱۹﴾
ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور اُن تمام لوگوں کے بھی جو زمین پر بسے ہوئے ہیں اور تمام اعمال اپنے نتائج کے لئے ہمارے ہی قانونِ مکافات کی طرف لوٹتے ہیں۔

انجیل

ہم ”ابلیس و آدم“ باب ”رسالت“ میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو کتاب

عطا فرمائی اس لئے کہ پیغام کے بغیر پیغامبر (رسول) کا مقصد ہی کچھ نہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کا تذکرہ نہیں کیا اسی طرح قرآن کریم میں ہر کتاب کا نام بھی درج نہیں کیا۔ اس سے قبل زبور اور تورات کا ذکر آچکا ہے۔ حضرت عیسیٰ پر جو کتاب نازل کی گئی تھی اس کا نام انجیل ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ ۚ (۵۴/۲۷)

پھر دیکھو! ان نبیوں کے بعد ہم نے انہی کے نقش قدم پر اپنے رسولوں کو (یکے بعد دیگرے) بھیجا اور ان کے بعد (پھر) مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور اسے انجیل عطا فرمائی۔

وہ انجیل جس میں نور و ہدایت تھی (۵/۴۶)۔

آپ غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی اور مذہب بھی ہے جو ”دوسرے“ مذاہب کی کتب مقدسہ کا ذکر اس توصیف و ستائش سے کرے؟ یہ کتاب (انجیل) خود اللہ تعالیٰ نے سکھائی تھی۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ الْقُرْآنَ ۚ (۵۴/۲۸)

اور اسے مریم! اللہ اس (بچے) کو قانون اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا یعنی تورات و انجیل کا۔

اسی کا اعلان حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا (۵/۱۱۰)۔

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے یا نصرانی تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ تورات و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر آپ (حضرت ابراہیمؑ) ان کے متبع کیسے ہو سکتے ہیں؟

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ ۚ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ إِلَّا مِنْ مُبْعَدٍ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳/۶۵)

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو کہ ان کا طریقہ نہ یہودیت کا تھا نہ نصاریت کا! اس لئے کہ تورات و انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں کی گئی ہیں) اس کے بہت بعد نازل ہوئی ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ جس گروہ بندی کا اُس وقت دعویٰ

نہ تھا، وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے؟ کیا تم (اتنی موٹی سی بات بھی) نہیں سمجھ سکتے؟
اصلی تورات دانجیل میں جہاد و سرفروشی کی وہی تعلیم تھی جو شران کریم میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۖ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ
وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ
وَمَنْ أَدْفَىٰ بِعَمْدٍ ۖ مِنَ اللَّهِ فَأَسْتَبْشِرُوا بِيَعْيِكُمُ الَّذِي
بَايَعْتُمْ بِهِ ۖ وَذَلِكَ هُوَ الْفُوزُ الْعَظِيمُ ٥ (۹/۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں بھی خرید لیں اور اُن کا مال بھی اور اس قیمت پر
خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت کی (جاودانی) زندگی ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ)
اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے
ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات انجیل، قرآن (تینوں کتابوں)
میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے
والا ہو؟ (پس سہانا!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ اور

اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فروز مندی ہے!

حتیٰ کہ اُن میں نبی اکرم کے مقدس رفقاء کا تذکرہ بھی تھا کہ وہ کس طرح دیگر انبیائے کرام کے ساتھیوں کی
طرح خدا کی بادشاہت کو زمین پر قائم کریں گے (دیکھئے ۲۸/۲۹)۔

لیکن یہ سب کچھ اس انجیل میں تھا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی نہ کہ اس
محرّف انجیل میں جسے انسانی ہاتھوں نے بُری طرح سے محرف کر ڈالا۔ حتیٰ کہ آج جن کتابوں
کو اناجیل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے خود عیسائی محققین کو اعتراف ہے کہ اُن کی اصلیت کا کچھ علم
نہیں (انجیل کی تاریخ اور عیسائیوں کے اعترافات کی تفصیل ہماری کتاب "مذہبِ عالم کی آسمانی
کتابیں" میں ملے گی)۔ بہر حال نزولِ شران کے وقت عیسائیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ حقیقی انجیل کو
بالکل چھوڑ چکے تھے (کہ اس کے وجود کا کہیں بھی پتا نہ تھا)۔ انجیل کی تعلیم شران میں آچکی تھی
لیکن وہ اس کا 'ضد' اور تعصب کی بنا پر انکار کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اللہ کے انعام و اکرام سے یکسر

محرم ہو گئے۔ سورہ مائدہ میں ہے۔

وَلَوْ أَكْثَرُهُمْ أَتَمُّوا الْعَوْرَةَ وَالْوَخِيلَ وَمَا أُنْزِلَ
إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ
مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (۵/۶۴)
اور اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ اُن کے پروردگار کی طرف سے اب اُن پر نازل
ہو رہا ہے، درست بازی کے ساتھ قائم رکھتے، تو ضرور ایسا ہوتا کہ اُن کے اوپر سے بھی
اور اُن کے قدموں کے نیچے سے بھی انہیں برکت ملتی (لیکن انہوں نے تورات و انجیل کی
تعلیم ضائع کر دی، ان میں سے ایک گروہ ضرور میانہ رو ہے، لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو
کچھ کرتے ہیں، برائی ہی برائی ہے۔

نزولِ شُرآن کے وقت نصاریٰ کی کیا حالت تھی، اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔



خلاصہ بحث

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔ آپ کی حیاتِ طیبہ باعتبارِ زمانہ ایسی مختصر کہ گویا ایک شعلہٴ مستعلیٰ۔ خود اناجیل سے بھی (جو درحقیقت اپنی موجودہ شکل میں آپ کی سیرت کی کتابیں ہیں) آپ کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو سال سے زیادہ کے حالات نہیں ملتے۔ لیکن باعتبارِ اثر و نتاج، ایک طرف ایسی ہدف رس کہ بنی اسرائیل جیسی قوم کی ہلاکت و بربادی کے خلاف خدا کی آخری حجّت اور دوسری طرف ایسی ہمہ گیر کہ تھوڑے سے عرصہ میں نوعِ انسانی کے ایک کثیر حصہ کے قلوب و اذہان پر چھا جانے والی۔ پھر اس ڈیڑھ دو سال کے کوائفِ حیات بھی معتقدین اور مخالفین کے افراط و تفریط کے گہوارہ میں اس طرح جنباں کہ اگر تُسرا ان کریم کامرکزِ ثقل سامنے نہ آتا تو چشمِ تحقیق آپ کے صحیح مقام سے کبھی آشنا نہ ہو سکتی۔ قوم بنی اسرائیل اپنے عروج و اقبال کی انتہائی بلندیوں سے زوال و انحطاط کی آخری پستیوں میں گر چکی تھی۔ دنیاوی اعتبار سے رومیوں کے شکنجہ استبداد میں جکڑی ہوئی اور دینی اعتبار سے خدا کی جگہ انسانوں (یعنی اجبار و رہبان) کے خود ساختہ قوانین کی غیر فطری زنجیروں میں گرفتار۔ ایسے میں حضرت عیسیٰ ایک انقلاب آفریں پیغام لے کر آئے تاکہ اس شوریدہ بخت قوم کو جسمانی اور "روحانی" ہر طرح کی غلامی سے نجات دلا کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکنے کے آئین سکھائیں جس سے ان کی ذلتیں، عظمتوں میں اور پستیاں سرفرازیوں میں بدل جائیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ مرضِ لاعلاج ہو چکا تھا اور مریض اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں دوائی سے چرٹ اور طبیبِ مشفق سے صداوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس بد قسمت قوم کے علماء و مشائخ نے محض اپنی سیادت و قیادت قائم رکھنے کے لئے نہ صرف آپ کے پیغامِ حیات بخش کی مخالفت کی بلکہ آپ کے خلاف سازش کر کے آپ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ وہ ان مشنوم تدابیر میں مصروف تھے اور آسمان ان کے انجام و عواقب پر منہس رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ ان کی دستِ برد سے محفوظ رکھے گئے۔ باقی رہی آپ کے حواریوں کی جماعت، سو اس کی تسکین کا سامان آپ نے یہ مژدہ سنا کر بہم پہنچا دیا کہ گھر کے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے بعد وہ نبی آخر الزماں آئے گا جو آپ (بلکہ تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام) کے پیغام کی تکمیل کر دے گا۔ یہودی خوش تھے کہ انہیں بہت بڑی "کامیابی" حاصل ہوئی ہے لیکن

زمانہ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی یہ خوشی درحقیقت چراغ کا وہ خندہ سحری تھا جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گُل ہو جاتا ہے۔ شجرِ ابراہیمی کی یہ شاخ فلسطینی جس نے تروتازگی کی ہر صلاحیت اپنے اندر سے کھودی تھی، یوں خشک ہو کر رہ گئی کیونکہ خود حضرت ابراہیمؑ سے ”اَوَيْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ“ فرما دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد برگ و بار اُس شاخِ حجازی کے حصّہ میں آیا جس میں شادابی و شگفتگی کے عنوانات کھل کھلا کر ہنس رہے تھے کہ

قسمتِ بادہ باندازہ جام است ایں جا

شاخِ اسمعیلی کی ان شادابیوں کا تذکرہ ”معراجِ انسانیت“ میں ملے گا۔



وَاذْعُزْ لِمَوْتِهِمْ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَنذِرْ إِلَى الْكَهْفِ (۱۸)

احزاب
كهف

بانشء درویشی در ساز و دما دم زن
چوپخته شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اصحابِ کہف

سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے متبعین پر سخت آزمائش و ابتلا کا دور آیا۔ معاندانہ قوتیں چاروں طرف سے سیلابِ بلا کی طرح هجوم کر کے اُمنڈ آئیں۔ یہ دنیا کی نگاہوں سے چھپے چھپے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ حکومت کی سختیاں، یہودیوں کی دیسہ کاریاں، کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بستیوں سے دُور جنگل اور ویرانوں میں کہیں چھپ چھپا کر زندگی کے دن بسر کریں۔ اس غلوت گزینی اور گوشہ نشینی نے رفتہ رفتہ منظم رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔ خانقاہیت کے خطوط و آثار عیسائیت سے پہلے بھی موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان عیسائیوں میں بعض ایسے بھی ہوں جن کے رگ و پے میں خانقاہیت کے جراثیم پہلے سے موجود ہوں۔ درمیان میں یہ جراثیم دب گئے اور اب جو فضا سازگار ملی تو انہوں نے پھر سے انگڑائیاں یعنی شروع کر دیں۔ اس تصورِ زندگی نے آہستہ آہستہ ایک ایسی متعین صورت اختیار کر لی کہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہونے لگے اور خانقاہیت ایک خاص شعارِ زندگی اور مسلکِ حیات قرار پائی۔ قرآنِ کریم نے جہاں یہود و نصاریٰ کے اور غلط معتقدات و رسومات کی تردید کی ہے وہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ رہبانیت کی یہ زندگی حضرت مسیحؑ (یا کسی اور رسول) کی تعلیم نہ تھی جو منجانبِ اللہ لوگوں تک پہنچائی گئی ہو، بلکہ یہ ان لوگوں کا خود ساختہ مسلک تھا۔

خانقاہیت

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاتَّبَعَتْهُ إِتِيفَةٌ ۖ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَافَةً ۖ وَرَحْمَةً ۖ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵۸/۲۴)

پھر ان کے بعد ہم نے ان ہی کے نقش قدم پر اپنے (دوسرے) رسولوں کو بھیجا اور انہی کے بعد ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (صحیح معنی میں) انجیل کی پیروی کی 'رحمد لی اور محبت پیدا کر دی۔ باقی رہی رہبانیت، سوائے ان لوگوں نے (از خود) گھڑ لیا ہے ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔ ہم نے تو محض اپنے قوانین سے ہم آہنگی فرض قرار دی تھی (مگر ان لوگوں نے از خود نئی نئی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں چنانچہ کرنے کو تو یہ مسلک اختیار کر لیا لیکن یہ لوگ اسے کما حقہ نبھانہ سکے۔ یہ نبھنے والا مسلک ہی نہیں)۔ چنانچہ ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے (صحیح طور پر) ایمان لائے تھے ان کا اجر عطا کر دیا اور (ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں) اور ان میں سے بہت سے فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، شروع شروع میں یہ زاویہ نشینی اور خلوت گزینی مستبد قوتوں کے جوہر ستم سے بچنے کے لئے اختیار کی گئی تھی، اس لئے ان فاروں اور تہ خانوں میں بڑے بڑے عہدہ گہرے تباہ چمکتے نظر آتے تھے۔ لیکن جب اس نے ایک منظم رسم کی صورت اختیار کر لی تو یہی خانقاہیں ان تمام انسانیت سوز معائب و جرائم کے مرکز بن گئیں جن کے تصود سے حیا کی روح کانپ اٹھے۔ قرآن کریم نے اس ابتدائی دور کی خلوت گزینی کا ایک واقعہ اپنے درخشندہ اوراق

قصہ اصحاب کہف

اللہ کا نام لینے والوں پر کس طرح گوشہ عافیت تنگ کر دیتی ہیں، لیکن بالآخر فلاح و فوز انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو حق و استقامت پر جمے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ اصحاب کہف یا اصحاب رقیم کے نام سے

متعارف ہے اور سورۃ کہف میں مذکور۔ سرِ شتہ داستان ان آیات سے سامنے آتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا
عَجَبًا ۚ إِذْ أَدَّى الْفَتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا
مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا فَفَضَّلْنَا
عَلَىٰ أَذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝ (۹-۱۸/۱۱)

اے مخاطب! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں "أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی اس غار والے لوگ جو بطرا (پیٹرا) میں واقع تھے۔ کوئی غارقِ عادت مخلوق یا اچنبے کی چیز تھے؟ (ایسا نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی جسے بعد میں لوگوں نے 'ہیستان' بنا دیا اور اُس نے اسی طرح شہرت پکڑ لی)۔

ہوایہ تھا کہ کچھ نوجوان تھے (جو دین کے اصولوں پر معاشرہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے) (۱۸/۱۴)۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑوں کے اندر ایک بہت بڑے غار میں جا کر پناہ لی، تاکہ وہاں اپنے مقصد کے حصول کے لئے تیاری کریں۔ اس کے لئے انہوں نے ہم سے التجا کی کہ اے ہمارے پروردگار! تو ایسا انتظام کر دے کہ ہمیں تیری طرف سے سامانِ زندگی بھی بہم پہنچتا رہے اور ہم نے جس بات کا ارادہ کیا ہے اسے کامیاب بنانے کے اسباب و ذرائع بھی میسر آجائیں۔

چنانچہ وہ اس غار میں کئی برس تک اس طرح رہے کہ وہ باہر کی دنیا سے منقطع تھے۔

غور سے دیکھتے تو سارے قصہ کا ملخص ان ہی تین آیات کے اندر جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ اس کے آگے اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم قصۂ اصحابِ الحجر (جئے نور) میں دیکھ چکے ہیں کہ حجرِ نبطی حکومت کا دارالسلطنت تھا، لیکن اس سے پیشتر ان کا دارالحکومت ایک اور شہر تھا جسے رقیم کہا جاتا تھا۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا ہے تو اس شہر کو شہرت حاصل ہوئی لیکن رقیم کے نام سے نہیں بلکہ پیٹرا کے نام سے جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرا کہہ کر پکارا۔ دورِ رقیم حاضری کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات کا سراغ لگا لیا ہے

جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاہوں کے آثار ملے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتی تھی۔ اس لئے نزولِ قرآن کے وقت عرب، اصحابِ کہف (غار والوں) یا اصحابِ الرقيم (بطرادالوں) کے قصہ سے آشنا تھے۔ لیکن انہی تفصیل کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیل چکی تھیں قرآن کریم نے انہیں ”أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ“ کے نام سے پکار کر ان دونوں ناموں کی طرف اشارہ کر دیا جن سے یہ لوگ متعارف تھے۔

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ چند نوجوان تھے جن کے دل میں حق پرستی کا جذبہ موجزن تھا اور وہ معاشرہ میں صحیح آسمانی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش مفاد پرست رباؤں اقتدار کی سخت مخالفت کا موجب بنی ہوگی۔ چنانچہ وہ ان کے دستِ ظلم و استبداد سے محفوظ رہنے کی خاطر بستی سے دور کسی غار میں جا چھپے اور وہاں اپنے پروگرام کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ اس دوران میں وہ باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اس کے بعد جب باہر کی دنیا کے حالات مساعد ہوئے تو وہ پھر بستی کی طرف آئے اور انہوں نے آکر دیکھا کہ زمانہ نے باطل پرستی کا زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں دیا اور وہی حق پرستی جو بستیوں اور آبادیوں سے دھکیل کر نکال دی گئی تھی ان آبادیوں اور بستیوں پر غالب آچکی تھی۔

ان ”غار والوں“ کے متعلق عوام میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے (اور ظاہر ہے کہ مسکٹ خانقاہیت کے اربابِ حل و عقد اور بھی انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوں گے)۔ قرآن نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تمہیں ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتاتے ہیں۔

عَنْ نَقْصٍ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِأَمْرٍ أَنَّهُمْ فَقِيَهُ أَمَنُوا بِرَبِّهِمْ
وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا
فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنَنُودُوا مِنْ
دُونِهِ إِنْهَآ لَعَنَّا إِذَا شَطَطْنَا ۝ (۱۳-۱۸)

آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کو ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے متعلق عوام میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو چکی ہیں لیکن ہم تمہیں ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتاتے ہیں۔ یہ چند نوجوان تھے جو اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے متعین کردہ نظام کو اپنی

زندگی کا نصب العین بنا چکے تھے اور اس کے قیام کی راہیں اُن پر بہت دُور تک کھل چکی تھیں۔ چنانچہ جب وہ اس انقلابی مقصد کو لے کر اٹھے ہیں تو ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ان کے معاشرہ میں اس خدا کا نظام قائم ہوگا جس کا نظام کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ مسلط ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور کا اقتدار اور قانون ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ بات ہمیں حق کی راہ سے بہت دُور لے جائے گی۔ ان کے برعکس ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ

هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ لُؤْلُؤًا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَاطِلٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَىٰ اللَّهِ كَذِبًا ۝ (۱۸/۱۵)

اس وقت ہماری قوم کے لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے علاوہ اور بہت سی قوتوں کا اقتدار تسلیم کر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ خود خدا کے حکم کے مطابق کیا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس ان قوتوں کے اقتدار اور اختیار کی کوئی سند (اتھارٹی) نہیں۔ یہ خدا پر یکسر کذب اور افتراء ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ حدودِ فرہوش اور کون ہو سکتا ہے جو خدا پر اس طرح افتراء باندھے۔

ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ان پر چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ چنانچہ وہ باہمی مشورہ سے **خلوت گزینی** سے فیصلہ پر پہنچے کہ ہمیں اس وقت ان کا کھل کر مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ان سے الگ ہو کر اپنی تیاریاں کرنی چاہئیں۔ اس فیصلہ کے مطابق وہ بستی سے نکل کر دُور ایک غار میں چلے گئے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاَوَّا اِلٰى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مَرْفَعًا ۝ (۱۸/۱۶)

اُن کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ان پر چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم اُمنڈ آیا۔ چنانچہ انہوں نے باہمی مشورہ کیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ جب تم نے اپنی قوم سے الگ مسلک

اختیار کر لیا ہے اور اس (قوم) نے اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کے اقتدار کو اختیار کر رکھا ہے تم ان سے بھی کنارہ کش ہو چکے ہو (تو تمہارا ان کے اندر رہنا ٹھیک نہیں۔ سر درست ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے) اور فلاں غار میں پناہ لے لینی چاہیئے۔ (اور وہاں خفیہ طور پر اپنی تیاریاں جاری رکھنی چاہئیں)۔ خدا کا قانون ربوبیت (جسے ممکن کرنے کے لئے تم نے یہ آواز اٹھائی ہے) ایسا انتظام کر دے گا کہ تمہاری ضروریات زندگی کی چیزوں کو وہاں تک پھیلا دے اور تمہارے مقصد کی تکمیل کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے اسے بھی سہل الحصول بنا دے۔

وہ جس غار میں جا کر چھپے اُس کا رخ شرقاً غرباً نہیں بلکہ شمالاً جنوباً تھا جس کی وجہ سے سورج کی شعاعیں اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کے اندر جگہ کشادہ تھی۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ شَزَّادُرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ
الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقَرَّبُ إِلَيْهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي
فُجْوَةٍ مِنْهُ ط ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ط مَنْ يَهْدِ اللَّهُ
فَهُوَ الْمُهْتَدِ ط وَ مَنْ يُضِلِّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا
مُرْسِدًا ۝ (۱۸/۱۷)

انہوں نے جس غار میں جا کر پناہ لی تھی وہ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ وہ اُس غار کے دہانے سے دائیں جانب کو پھر جاتا ہے اور جب وہ غروب ہو تو اُس کے دہانے سے بائیں طرف کتراتا ہوا نکل جاتا ہے (یعنی سورج کی شعاعیں اس غار کے اندرون کے کسی حصہ میں بھی نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ شمالاً جنوباً واقع تھی)۔ اُس غار کا دہانہ تو تنگ تھا، لیکن اُس کے اندر بہت کشادہ جگہ تھی (جو ان کی جماعت کے لئے کافی تھی)۔ یہ انتظام خدا کی نشانیوں میں سے تھا (جو انہیں میسر آ گیا تھا) اور خدا ہی نے ان کی راہ نمائی اس طرف کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ منزل مقصود تک ہی پہنچ سکتا ہے جسے خدا کی راہ نمائی میسر آ جائے۔ جسے یہ راہ نمائی نصیب نہ ہو اُس کا نہ کوئی رفیق ہو سکتا ہے نہ کوئی راستہ بتانے والا۔

اگرچہ وہ غار میں محفوظ تھے لیکن اس کے باوجود کسی حفاظتی تدبیر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ نیند کی حالت میں بھی یکسر بے خبر نہیں ہوتے تھے۔ وہ اس طرح چاق و چوبند سوتے تھے کہ باہر سے اگر ان پر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ (وَ تَحْسَبُهُمْ اِنْقَاطًا وَ هُمْ رُقُودٌ ۚ وَ ذَاتَ الشَّمَالِ ۙ) (۱۸/۱۸) اور غار کے دہانے پر ان کا کتا اپنے بازو پھیلائے، دروازے کا راستہ روکے چونکہ بیٹھا رہتا تھا کہ کوئی خطرہ ہو تو انہیں اس سے آگاہ کر دے (وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ) (۱۸/۱۸)۔ غرضیکہ انہوں نے وہاں کیفیت ایسی پیدا کر رکھی تھی کہ اگر کسی کو معلوم بھی ہو جائے کہ وہاں کوئی رہتا ہے اور اندر جھانکے تو ڈر کے مارے اُلٹے پاؤں بھاگ اُٹھے یَوَ اَظْلَعَتْ عَلَيْهِمْ لَوَلِيَّتٌ مِنْهُمْ فِرَارًا ۚ وَ كَلِمَاتٌ مِنْهُمْ رُغْبًا (۱۸/۱۸)۔

وہ اس غار میں ایک عرصہ تک رہے اور چپکے چپکے اپنی تیاریاں دوبارہ آبادی کی طرف کرتے رہے۔ وہ ان تیاریوں میں اس جذب و انہماک سے

مصروف تھے کہ انہیں یاد بھی نہ تھا کہ انہیں وہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب باہر نکلنے کا وقت آگیا ہے تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم بھلا یہاں کتنا عرصہ رہے ہونگے؟ (قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ) (۱۸/۱۹)۔ تاکہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ بستی کے لوگ انہیں پہچان لیں گے یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا عرصہ۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں اس سے کم مدت (قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ) (۱۸/۱۹)۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ ”یہ بات محض اندازہ لگانے کے لئے چھیڑی تھی۔ ٹھیک طور پر خدا ہی جانتا ہے کہ ہم کتنی مدت سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ جس مقصد کے لئے ہم اس کا اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ بستی کے لوگ ہمیں پہچان لیں گے یا نہیں، اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ اپنے میں سے ایک آدمی کو یہ سکہ دے کہ بستی کی طرف بھیجو کہ وہاں سے اچھا سا کھانا لے آئے۔ لیکن وہ اس احتیاط اور ہوشیاری سے جائے کہ ہمارا راز نہ افشا ہونے پائے“ (۱۸/۱۹) کیونکہ

اِنَّهُمْ اِنْ يَظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعَيِّدُوْكُمْ فِيْ
مَلَبَتِهِمْ وَ كُنْ تَفْلِحُوْا اِذَا اَبَدًا ۝ (۱۸/۲۰)

اگر لوگوں نے خبر پالی تو وہ چھوڑنے والے نہیں۔ یا تو سنگسار کریں گے یا مجبور کرینگے کہ پھر ان کے مذہب میں واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تم کبھی فلاح نہ پاسکو گے۔

اب یہ واجبُ العزت تھے | اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ غار میں کیوں پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس کے بعد لوگ ان کے

حالات سے باخبر ہو گئے (وَكَذَٰلِكَ أَعِزُّنَا عَلَيْهِمْ) (۱۹/۲۱) اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں کو اس سے بہت تقویت ہوئی کہ ان کے داعیانِ انقلاب زندہ ہیں اور اس قدر طاقت بھی فراہم کر چکے ہیں۔ اس سے انہیں یقین ہو گیا کہ خدا نے ان سے جو وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو انہیں آخر الامر کامیابی ہوگی، وہ بالکل سچا تھا (لِيَعْلَمُوْا اَنَّ وَّعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ) (۱۸/۲۱) اور وہ انقلاب یقیناً اگر رہے گا جس کے لئے وہ اتنے عرصہ سے منتظر تھے۔ (وَ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا) (۱۸/۲۱)۔

قرآن کریم نے اس کے بعد کے قصے کی کڑیوں کو بیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح اپنے پروگرام میں کامیاب ہوئے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی تعظیم و تحکیم کس حد تک بڑھ گئی۔ وہ صرف اتنا بتاتا ہے کہ وہ غار ان لوگوں کیلئے قوم کا شعار اور عظمت کا نشان قرار پا گئی اور جب وہ نوجوان بعد میں فوت ہوئے تو ان کے معتقدین میں اس امر پر اختلاف پیدا ہوا کہ ان کی یادگار کس قسم کی بنائی جائے کسی نے کہا کہ وہاں ایک بہت بڑی عمارت بطور یادگار بنانی چاہیے (فَقَالُوا بُنُوا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا) (۱۸/۲۱)۔ لیکن گروہ غالب کا فیصلہ یہی ہوا کہ ان کی قبروں پر ایک عبادت گاہ بنا دی جائے (لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا) (۱۸/۲۱)۔ چنانچہ اس طرح ان انقلاب آفریں مجاہدین کی قبریں بعد میں لوگوں کے لئے سجدہ گاہ بن گئیں اور ان کا غار خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب لوگ یہ تو بھول چکے ہیں کہ انہوں نے کس قدر مجاہدانہ کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اب ان کے مزاروں سے منتیں مالی جاتی ہیں۔ ان کے متولی لوگوں کو ان کی "کرامات" کے قسم قسم کے افسانے سناتے ہیں اور ان کے معتقدین بھی اس قسم کی بے معنی بحثوں میں اُبھے رہتے ہیں کہ وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا (سَيَقُوْنُوْنَ

کے اندر عبادات گزاری کے کیا کیا طریقے تھے، ان کی تفصیل خانقاہیت کے متعلق لٹریچر کے مطالعہ سے مل سکتی ہیں۔ ان لوگوں کی عجیب

خانقاہوں کی زندگی | حالت تھی۔ اس قسم کی عبادت کا منتہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان اس میں اس درجہ مستغرق ہو کہ کھانے پینے تک کا بھی ہوش نہ رہے۔ اس پر

جذب و انہماک کا ایسا عالم طاری ہو کہ وہ جس انداز میں محو عبادت گزاری ہے، اسی انداز میں ہینٹوں پڑا رہے۔ اگر کھڑا ہے تو بیٹھے نہیں، سجدہ میں ہے تو اٹھے نہیں۔ جو جھکا ہے جھکا رہے، جو بیٹھا ہے بیٹھا رہے۔ مغرب میں تو اس قسم کی خانقاہیں اور ان خانقاہوں میں ایسی موت اور ریاضتیں باقی نہیں رہیں، لیکن مشرق میں ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ ہمالہ کی چوٹیوں یا غاروں میں آج بھی اس قسم کے مندر پائے جاتے ہیں جہاں سادھو، سنیا سی اس قسم کی ریاضتوں میں محو ہوتے ہیں۔ کوئی ایک ٹانگ کے بل کھڑا ہے، کسی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا ہے اور وہ ہاتھ بالکل سوکھ چکا ہے۔ کوئی آسمان کی طرف ٹکشی لگائے ہے اور آنکھ نہیں جھپکتا۔ کوئی لوہے کی میخوں کے بستر پر لیٹا ہے۔ کوئی آگ جلائے اور دھاتک رہا ہے۔ یہی کچھ عیسائیت کی خانقاہیت میں ہوتا تھا۔

تاریخی اور اثری انکشافات شاہد ہیں کہ ارضِ فلسطین اس قسم کے تہ خانوں اور غاروں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ غار عبادت گاہوں کے طریق پر بھی کام آتے تھے اور جب ویران ہو جاتے تو رہزनों

ان غاروں کی تفصیل | اور قزاقوں کی کمین گاہوں اور پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے۔ تورات میں ان غاروں کے متعلق اکثر اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً قاضیوں کی کتاب میں ہے۔

لے اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس کے مضامین کے علاوہ

اور مدیانیوں کا ہاتھ اسرائیلیوں پر قوی ہوا اور مدیانیوں کے سبب بنی اسرائیل نے اپنے لئے پہاڑوں میں کھوہ اور غار اور مضبوط مکان بنائے۔ (قاضیوں ۶/۲)

راہنسن اپنی کتاب *Biblical Researches in Palestime* میں لکھتا ہے۔

یہ ملک چاروں طرف سے غاروں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ غاریں شاید (حضرت) داؤد کے زمانہ میں کمین گاہوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ (جلد دوم ص ۲۳)

جوزیفس اپنی مشہور تاریخ *Antiquities* کی جلد ۱۴، باب ۵ میں ان تہ خانوں اور غاروں کے متعلق لکھتا ہے کہ ان میں رہزن اور قزاق پناہ لیا کرتے تھے۔ کوہ کارمل کی غاریں اس زمانہ کی مشہور عبادت گاہیں تھیں۔ کیٹوپائے انسائیکلو پیڈیا آف بلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے۔

کارمل چونے کے پتھر کا پہاڑ ہے اور جیسا کہ ایسی صورت میں اکثر ہوتا ہے، اس میں بڑی بڑی غاریں واقع ہیں، قریب ایک ہزار سے بھی زیادہ۔ ایک خاص خطہ میں جسے ”راہبوں کے فار“ کہا جاتا ہے قریب چار ہزار غاریں ایک دوسرے سے ملحق پائی جاتی ہیں، ان میں روشندان بھی ہیں اور سونے کی جگہ بھی۔ ان کے دروازے اس قدر تنگ ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی رینگ کر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے راستے اس قدر پُر ہیچ و خم دار ہیں کہ چار قدم کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے..... یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ کوہ کارمل کی غاریں زمانہ قدیم میں نبیوں اور دوسرے مذہب پرست لوگوں کی عبادت گاہ تھیں۔

ایک مشہور سیاح *Burckhardt* اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے۔

کوہ کلات ابن معان میں طبعی غاروں کو ایسے راستوں سے باہم ملا دیا گیا ہے جو پتھر کی چٹانیں تراش تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے اندر پانی کے حوض ہیں اور کم و بیش چھ سو نفوس کے رہنے کی گنجائش۔

یہی غاریں تھیں جنہوں نے رفتہ رفتہ خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ ایسینی *Essenes* فرقہ (جس کا اجمالی ذکر پہلے آچکا ہے) مسلک رہبانیت کا سب سے بڑا پیرو تھا۔ مصر میں ان کی اس قسم

کی خانقاہیں ان کے زہد و انزوا کی زندہ شہادتیں تھیں۔ مشہور یہودی مؤرخ فیلو PHILO قریب
سنتھ قہم میں ان کے متعلق لکھتا ہے۔

ہر عبادت گاہ میں ایک مقدس حلقہ ہوتا ہے جسے مندر کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ
خانقاہ جس میں راہب عالم بالا کے عجائب و غرائب کے کثمتے دکھاتے ہیں۔ وہ
اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے، حتیٰ کہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کی چیزیں بھی
نہیں۔ ان کے پاس صرف نبیوں کا مقدس کلام ہوتا ہے اور اس قسم کی اور
چیزیں جن سے ان کے زہد و تقدس میں اضافہ اور تکمیل ہو۔

CONTEMPLATIVE LIFE

قریب ۲۵۰ء میں اسی قسم کی ایک خانقاہ عیسائی راہب پالوس نے جزیرہ طابینہ TOBENNA
میں قائم کی۔

اس جزیرہ کی ہر خانقاہ میں یونانی لٹریچر کے ماہرین کی جماعتیں رہا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ
اسکندریہ اسکول کے لوگوں نے بھی وہاں آنا شروع کر دیا۔

(امریکن انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷)

یہ پہلی خانقاہ تھی۔ لیکن اس کے بعد خانقاہوں کی ترویج اس برق رفتاری سے ہوئی کہ تیسری صدی کے
اخیر میں ہر جگہ خانقاہیں دکھائی دینے لگیں۔ چنانچہ ROLLIN اپنی کتاب "تاریخ مصر قدیم"
(جلد دوم باب ۲) میں لکھتا ہے۔

"زیریں مصر کا سب سے بڑا عجوبہ اس کا شہر OXYRICHUS تھا جس
کی حالت یہ تھی کہ شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ راہب ہی راہب دکھائی دیتے تھے،
شہر کی آبادی سے بھی زیادہ راہب۔ عام عمارات اور منادرسب خانقاہوں میں تبدیل
ہو چکے تھے اور ان کی تعداد سکونتی مکانات سے بھی زیادہ تھی..... اس شہر میں

لے یہ قریب سنتھ قہم کی شہادت ہے، یعنی اس زمانے کی شہادت جس میں حضرت مریمؑ خانقاہ میں راہبہ کی
زندگی بسر کرنے کے لئے وقف کی گئی تھیں۔ تفصیل پہلے آچکی ہے۔

بیس ہزار کنواری راہبات اور دس ہزار راہب بستے تھے۔



یہ ہے واقعہ اصحابِ کہف کا جس کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ حق پرست لوگوں کو کس کس قسم کی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بالآخر وہ لوگ کس طرح مرجعِ انام بن جاتے تھے۔ ان قصص سے ذرا تشریفِ انِ کریم کی دسعتِ داماں پر غور کیجئے۔ جہاں جہاں کوئی شگفتہ پھول ملتا ہے وہ کس طرح بلا تفریق چن لیتا ہے۔ کیا کسی اور جگہ بھی آپ کو ایسی کشادہ طہری کی مثال ملتی ہے؟

تشریفِ انِ کریم نے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ ایک تو یہ مسلک ہی لوگوں کا خود ساختہ تھا۔ اللہ نے اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے خود ساختہ مسلک کی بھی رعایت نہ رکھ سکے اور ان خرافات میں پڑ گئے جن کے تذکرہ سے آج روحِ انسانیت شرماتی ہے۔ مسلکِ خانقاہیت کی تشریح تو اپنے مقام میں (کسی آئندہ جلد میں آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کی رُو سے انسانی ذات (خودی) کے اثبات و تکمیل کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے جوشِ عمل اور شدتِ کردار سے عالمِ طبعی کو مسخر کر لے اور ان بے پناہ قوتوں کو منشاءِ ایزدی کے مطابق نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لائے۔ (اس کو فلسفہ رہبانیت قیامِ حکومتِ الہیہ کہتے ہیں)۔ اس کے برعکس مسلکِ خانقاہیت

رہبانیت (کہ جس کا ماخذ افلاطون کا مشرب "اعیان نامہ" ہے) کی رُو سے دنیا کے خارجی حقائق سب سرابِ دیدانت کی زبان میں مایا ہیں۔ اس لئے انسان کو ان خارجی حقائقِ فطرت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے "اندر کی دنیا" میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ اس فلسفہ حیات کا لازمی نتیجہ جمود و سکون ہے جس میں زندگی کا حرکتِ عنصر یکسر افسردہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ فلسفہ حیات غیرِ اسلامی ہے جو زندگی کو حقائق سے گریز اور حرکت و عمل کے بجائے جمود و تعطل سکھاتا ہے اسلامی تصویرِ زندگی کا راز "حرکتِ دوام" میں ہے۔ اب رہی دوسری شق، یعنی ان لوگوں نے اپنے خود اختیار کردہ مسلکِ خانقاہیت کی بھی رعایت نہ رکھی، سو اس ضمن میں خود مغربی محققین خانقاہیت کے متعلق اس قدر ریح کی

ہے کہ کسی دوسرے کے کچھ لکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ خانقاہی فتنے 'خانقاہیت کی ابتداء ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ طائیفہ کی سب سے پہلی خانقاہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کے متعلق امریکن سائیکلو پیڈیا (جلد ہفتم) میں مذکور ہے۔

ترک دنیا کے اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہوت پرستی، جنون، یاس انگیزی اور خودکشی عام ہونے لگی۔ راہبوں کی جہالت اور مذہبی جنون سے بہت سے خود غرض لوگوں نے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنا آلہ کار بنالیا۔

دنیا کے عیسائیت میں BUCK'S THEOLOGICAL DICTATIONARY ایک

مستند صحیفہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں MONKS کے عنوان خانقاہوں کے فتنے کے تحت مصر کی تحریک خانقاہیت کے عروج کی داستان بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

مختوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرقی سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا جنہوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے قرب و اذیت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعہ خدا اور عالم ملکوت سے قرب حاصل کیا جاسکے..... لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہو گئی۔ نیز انہوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتمل کر کے ہنگامے اور شور شایں برپا کرانا شروع کر دیں..... مستند مصنفوں کی شہادات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم سہل انگار جاہل، آوارہ مزاج اور حدود و فراموش عیش پسند واقع ہوئے تھے جن کی زندگی کا مطمح نگاہ، تمول سہل انگاری اور عیش پرستی تھا۔

ان "تارک الدنیا" زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آرہی تھی۔

پٹ پٹ کر مانگنے والے بھکاری، راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچہ میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بد معاشی، فریب دہی ان کا شعار تھا۔ حتیٰ کہ جو لوگ انہیں پناہ دیتے یہ انہیں بھی نہ بخشے..... جیروم کے اندازہ کے مطابق اس کے زمانہ میں اکیلے مصر میں ۷۰۰۰ راہب تھے..... یہ لوگ مذہبی جوش عقیدت کے نقاب میں

بدترین سلب و نہیب کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے۔

(PROGRESS OF RELIGIOUS IDEAS Vol,3 P249)

یہ خالق ہوں کی حالت تھی۔ اُدھر کلیساؤں میں جہاں اسی رہبانیت کی دوسری صورت پادریوں کے لباس میں جلوہ گر تھی، اس سے بھی بدتر حالت تھی۔ موشیم MOSHEIM مسیحی دنیا کا بہت بڑا مستند مؤرخ ہے۔ وہ اپنی مشہور تاریخ میں تیسری صدی کے کلیساؤں کے متعلق لکھتا ہے۔

اکثر کی یہ حالت تھی کہ وہ آرام طلبی اور شہوت پرستی کی زندگی میں ڈوبے ہوئے تھے..... ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان راہبہ عورتوں سے جو عمر بھر مجھ درہنہ کی قسم کھائے ہوتیں، ناجائز تعلقات قائم کرتے۔ ان خوبصورت راہبات کو اپنا شریک بستر بنالینا ان کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا۔

یہ اعمال کی کیفیت تھی۔ اور عقائد کی یہ حالت کہ موشیم مذکور چوتھی صدی کے مذہب پرستوں کے متعلق لکھتا ہے۔

ارضِ فلسطین اور دوسرے ولیوں کی قبروں کی زیارتوں کے لئے اطراف و اکنافِ عالم سے لوگ چلے آتے، یہ سمجھ کر کہ حقیقی نیکی اور یقینی نجات صرف وہیں مل سکتی ہے۔ تو تم پرستی کی لگام کو ذرا ڈھیلا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ کس طرح حدودِ فراموش و سعتوں تک پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں یہودہ معتقدات اور لایعنی رسومات کا نئے دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس سرزمین کی مٹی کو لوگ تبرکاً لے جاتے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ یہ خبیث روحوں کے بد اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اکیر ہے۔ چنانچہ اس مٹی کی ہر جگہ بڑی بڑی قیمتوں پر خرید و فروخت ہوتی..... آہستہ آہستہ تو ہم پرستی عام ہوتی گئی جس سے مذہبی مکاری اور فریبکاری کا دروازہ کھل گیا۔ اب ان راستوں سے مذہبی دوکاندار آلے شروع ہو گئے جن کا اصول اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں کی جہالت اور عقیدت سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُتو سیدھا کیا جائے اور اس طرح دولت اکٹھی کر لی جائے۔ انسانی فطرت کی کچھ افتاد ایسی ہے کہ ہر نئی چیز اچھو بہ اور کراست بن کر نظر آتی ہے۔ (اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کیا یہ جانا کہ مٹی کے ڈھیروں کو ولیوں کی قبریں بنا کر ان کی پوجا کرائی جاتی۔ ولیوں کی قبرستوں میں

آئے دن اضافے ہوتے رہتے اور چوروں اور ڈاکوؤں کو مقدس شہدار بنا کر پیش کیا جاتا۔ کسی مردے کی ہڈیاں ویرانے میں دفن کر دی جاتیں۔ پھر مشہور کر دیا جاتا کہ ہمیں خواب میں دکھائی دیا ہے کہ اس جگہ ایک بہت بڑے بزرگ مدفون ہیں۔ راہبوں کی جماعتیں قریہ قریہ گشت لگاتیں اور یہ لوگ نہایت دیدہ دلیری سے نہ صرف بزرگوں کی طرف منسوب کر کے فرضی تبرکات ہی بیچتے بلکہ عوام کی نگاہوں کو یہ کہہ کر بھی دھوکا دیتے کہ ہم جنات نکالتے ہیں اور بھوت پریت کو مار بھگاتے ہیں۔ غرضیکہ اسی قسم کی منکاری اور جھلساری اس قدر عام ہو رہی تھی کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

مشہور مورخ گبن جس نے روما کی عظیم الشان سلطنت کے انحطاط و سقوط کی عبرت انگیز داستان لکھی ہے، اس باب میں لکھتا ہے:

یہ کامیاب تجربہ کہ ولیوں کے تبرکات سونے اور جواہرات سے بھی زیادہ بیش قیمت ہیں، پادریوں کے لئے کلیسا کے خزانوں میں اضافے کرنے کی تحریص کا موجب بنا۔ انہوں نے امکانات و صداقت کو بالائے طاق رکھ کر پُرانی ہڈیوں کے لئے عجیب و غریب نام وضع کئے اور پھر ان ناموں کی طرف (محیر العقول) کارنامے منسوب کئے۔ حضرت مسیح کے حواریوں اور ان مقدس لوگوں کے چہروں، پرچہوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی تھی قسم قسم کے مذہبی افسانوں کی سیاہ چادر ڈالی گئی۔ جسور و غیور شہدار کی فہرستیں ہزار ہا ایسے فرضی مشاہیر کا اضافہ ہو گیا جن کا وجود ان افسانہ پردازوں کے ذہن سے باہر کہیں نہیں تھا اور اس بدگمانی کے لئے کافی وجوہات موجود ہیں کہ صرف (TOURS) کا کلیسا ہی ایک ایسا نہ تھا جس میں ولیوں کے بجائے جلساڑوں کی ہڈیوں کی پرستش ہوتی تھی (او) جگہ بھی ایسا ہوتا تھا، اس توہم پرستی نے ایک طرف فریب کاری اور خوش اعتقادی کی راہیں کشادہ کر دیں اور دوسری طرف دنیائے عیسائیت سے تاریخ اور بصیرت (دونوں) کے چراغ گل کر دیئے۔

ان ولیوں کو کعبہ مقصود و قبلہ حاجات اور مصائب و نوائب میں مشکلات کا تصور کیا جاتا تھا۔

یہ امر لوگوں کے لئے خوشی کا موجب ہے کہ ان لوگوں کے پاس اطباء کی مذاقت کے علاوہ امراض کے دفیہ کے لئے ایک اور بھی امید کا سرچشمہ ہے۔ وہ سرچشمہ جو کسی مصیبت میں بھی ناکام نہیں رہتا۔ مثلاً (ان کے نزدیک) انتہی ولی اپنے معتقدین کو آگ سے محفوظ رکھتا ہے اور ایک دوسرا انتہی انہیں پانی کی مصیبت سے نجات دلاتا ہے۔ بارہرا ولی جنگ اور بجلی کے حوادث میں جائے پناہ ہے۔ بلاس ولی گلے کی بیماریوں کو اچھا کرتا ہے۔ لوسیا ولی آنکھوں کے امراض کو شفا دیتا ہے۔ نکوس ولی ان جوان حورتوں کی امداد کرتا ہے جو شادی کی متمنی ہوں۔ رامتی ولی محل کے ایام میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ پونیا ولی دانتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ ڈومنگو ولی بخارا تار دیتا ہے اور روقی ولی کی طرف طاعون کی مصیبت میں رجوع کیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر کوئی بیماری ہو یا کوئی مصیبت اس کے دفیہ کے لئے کوئی نہ کوئی ولی موجود ہے جس سے دعا کے ذریعہ اعانت طلب کی جاتی ہے اور وہ اپنے پکارنے والے کی مدد کو پہنچ کر اس کی تکلیف میں دستگیری کرتا ہے۔

یہ اور ہم؟ آپ یہ کچھ پڑھ رہے ہیں اور تیسری چوتھی صدی کے عیسائیوں کی حالت کا نقشہ ذہن میں مرتسم کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو فرصت کہاں کہ یہ سوچیں کہ خود ہمارے ہاں ایک عرصہ دراز سے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن مسلمان کو اس کے سوچنے کی ضرورت ہی کیا؟ اس نے قرآن میں پڑھا کہ رہبانیت خلاف اسلام ہے تو سمجھ لیا کہ یہ آیت عیسائیوں سے متعلق ہے۔ ان کی خالقانیت خلاف اسلام تھی لیکن ہماری خالقانیت عین اسلام بلکہ ”مغز اسلام“ ہے! اب انہیں کون سمجھائے کہ لات و منات و منات ہی رہتے ہیں خواہ انہیں محرابِ کعبہ میں ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس قسم کی جلسا زیاں اور فریب کاریاں ہی قابلِ اعتراض نہیں بلکہ قابلِ اعتراض ہے وہ روحِ خالقانیت جو خدا کا متعین فرمودہ نظامِ حیات نہیں بلکہ حقائقِ زندگی سے گریز کرنے والے شکست خوردہ دماغوں کی اختراع ہے جس سے پوری کی پوری قومِ افیونیوں کا گردہ بن کے رہ جاتی ہے اور یہ روحِ خالقانیت ایک ہی ہے، یہاں ہو یا وہاں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ”تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔“ یہی ”اجنبی پودا“ بعد میں عین اسلام بن گیا۔ حیرت ہے کہ قرآن کو سامنے رکھنے والے مسلمان کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ

آئی کہ

کمال ترک نہیں آب و گل سے بھوری
کمال ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

حضرات انبیاء کرامؑ کا تذکارِ جلیلہ جس کی ابتداء حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی، جو تھے نور اور برقی طور کے بعد زیرِ نظر کتاب میں حضرت عیسیٰؑ تک وجہ شادابی قلب و نظر بن چکا ہے۔ اس کے بعد حضور خاتم النبیینؐ کی سیرت مقدسہ اس سلسلہ کی اگلی کڑی، معراجِ انسانیت میں آگئی ہے۔ قبل اس کے کہ زیرِ نظر کتاب کو ختم کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے احوال و کوائف میں جو جو مشترکہ اقدار قرآن میں بیان ہوئی ہیں، انہیں بیک وقت سامنے لایا جائے اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ان انبیاء کرامؑ کی دعوتِ کارِ و عمل ان کی امتوں کی طرف سے کیا ہوا؟ اس طرح یہ حقہ گویا سابقہ مندرجات پر نگہِ بارِ گشتِ کاکام دے گا۔ آئندہ دو ابواب اسی طائرانہ تبصرہ پر مشتمل ہیں۔



اور یہ ہیں اُمم گذشتہ

وَاللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَىٰ سَائِرِ الْمُرْسَلِیْنَ

باز خواہم قصّہ پارسینہ ات
تازہ سازم داغہائے سینہ ات

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ

(اور یہ ہیں — اقوامِ سابقہ)

نور و نکست کے اس کاروانِ رشد و ہدایت کی جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں میں ہم اس درجہ محو رہے کہ ان وادیوں اور شاخساروں کی تفصیلات کو اچھی طرح دامن نگاہ میں نہ سمیٹ سکے جن سے یہ قافلہ گزر رہا ہے۔ آئیے ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈالتے چلیں 'اس لئے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ کے سلسلہ تعلیم و تبلیغ کے ساتھ جب تک ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف سامنے نہ آجائیں جن کی طرف وہ حضرات مبعوث ہوئے تھے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جس کے لئے قرآن کریم نے اس سلسلہ کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اقوامِ سابقہ کی تفصیل جوئے نور، برقی طور اور زیر نظر کتاب کے سابقہ اوراق میں آچکی ہیں۔ آئندہ سطور میں فقط ان اصول و اساسات کی یاد تازہ کرائی جائے گی جن کے ماتحت وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔

انسان کا سب سے بڑا شرف علم ہے اور حصولِ علم کے اہم گوشے مشاہدات و تجربات۔ مشاہدات انسان کی اپنی نگاہ تک محدود ہوتے ہیں اور تجربات اس کی اپنی عملی زندگی میں محصور۔ لیکن جب ایک فرد یا ایک زمانہ کے تجارب و مشاہدات کو اگلی نسلوں تک منتقل کر دیا جائے تو اسے تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ دنیائے انسانیت کا اہم ترین شعبہ ہے۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنی ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا ہے۔ انسان کی علمی سطح اسی کے بل بوتے پر بلند ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی جس قدر متاع گراں

اور علم و سائنس کی جس قدر تابناک روشنی آپ کو آج (یا جب اور جہاں کہیں) نظر آئے وہ تاریخ ہی کی رہیں منت ہوگی۔

علم تاریخ | تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا حاصل، ہزار ہا سال کی مسلسل و متواتر تہذیب و تمدن کا پتلا، اقوام و ملل کی سیکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ، ایک دریا علم و ہنر جو اپنے منبع کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا ساحل نا آشنا ہوتا چلا گیا۔ آج آپ بلا تامل و کاوش سنکھیا کی ڈلی کو دور پھینک دیتے ہیں اور شکر کی ڈلی کو منہ ڈال لیتے ہیں لیکن آپ کو کیا معلوم کہ سنکھیا اور شکر میں تمیز کرنے کے لئے زمانے کو کتنی قربانیاں دینی پڑی ہوں گی۔ آج آپ کا موٹر بلا تکنان ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے فرسٹے بھرتا اڑے چلا جاتا ہے لیکن آپ کیا جانتے کہ پہلی بار اسے لے کر موٹر کی ساخت تک ذہن انسانی کو کن کن سنگلاخ وادیوں اور ناہمواریوں پر شاہراہوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔

لیکن یہ سب ترقی کس طرح ہو رہی ہے؟ اس عروج و ارتفاع کا راز کیا ہے؟ انسان اپنے تاریخی سرمایہ (یعنی آبار و اجداد کے تجربات و مشاہدات) سے کس طرح اتنا بے بہا فائدہ اٹھا رہا ہے؟ اس کا جواب ایک اور فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ آج سے دس ہزار سال پیشتر انسان نے دیکھا کہ سم آفاقی انسانی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ ہم آج بھی اس کی ہلاکت آفرینی پر بلا تردد و تامل یقینی حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ مرد و زمانہ سے سم آفاقی (سنکھیا) کی تاثیر نہیں بدل سکتی۔ اگر یہ دس ہزار سال پیشتر زہر تھا تو آج بھی زہر ہی ہے۔ اگر آفریقہ میں زہر تھا تو امریکہ میں بھی زہر ہے۔ اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ یہ تمام سلسلہ کائنات صرف اسی ایک عمود پر گھوم رہا ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔

پھر یہ کہ فطرت کے قوانین کا دائرہ عمل فقط طبیعی دنیا PHYSICAL WORLD تک ہی محدود نہیں۔ انسانی حیات اجتماعیہ سے متعلق بھی قوانین اسی طرح اٹل ہیں۔ اگر صحیح قوانین کے خلاف زندگی بسر کرنا جو ہر انسانیت کی بالیدگی کے لئے دس ہزار سال پیشتر مہلک تھا تو آج بھی اسی طرح مہلک ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر طبیعی دنیا میں تاریخ (یعنی

۱۔ یہ کن معانی میں اٹل ہیں، اس کی طرف ابلیس و آدم عنوان و حجتیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

انسانی مشاہدات و تجارب کا آگے منتقل ہوتے جانا انسانانی عروج و ارتقار کا نقطہ ماسکہ ہے تو دنیا کے عمرانیت و اجتماعیت میں کبھی تاریخ ہی اہمیت لئے ہوئے ہے۔

قرآن کریم قدم قدم پر تاریخی مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ وہ اپنے محکم اور اٹل دعاوی کی تائید میں تاریخی نظائر و شواہد پیش کرتا ہے اور ہر صاحب بصیرت کو دعوت غور و فکر دیتا ہے

تاریخ اور قرآن

کہ جب فلاں قسم کی روش زندگی نے فلاں فلاں وقت میں فلاں قسم کا نتیجہ پیدا کیا تھا تو کیا وہی روش زندگی آج بھی اسی قسم کا نتیجہ پیدا نہ کرے گی؟ یہ ہے مقصد قرآن کریم میں اُمم سابقہ اور اقوام گذشتہ کے احوال و ظروف بیان کرنے کا! حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن کریم ہی نے پیش کیا، ورنہ اس سے پیشتر تاریخ وقائع نگاری کی حد سے آگے نہ بڑھی تھی۔ سائنس کہتے ہی اسے پس کہ آپ مشاہدہ اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ فلاں قانون (یا اصول) کے مطابق کام کرنے سے فلاں قسم کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے یا جب کوئی واقعہ آپ کے سامنے آئے تو آپ یہ کہہ سکیں کہ یہ فلاں قانون یا اصول کے مطابق ظہور میں آیا ہے۔ اقوام عالم کے سلسلہ میں اس کو ان الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے کہ ”تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے“ یعنی ہم نے دیکھا کہ فلاں زمانہ میں فلاں قوم میں اس قسم کی نفسیاتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں تو ان سے اس قسم کے نتائج ظہور میں آئے۔ اس کے بعد جب بھی اس قسم کے اسباب پیدا ہوں گے، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے اور یہ سب اس لئے کہ نگار خانہ ہست و بود یونہی اتفاقیہ وجود میں نہیں آگیا، بلکہ ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی خاص منہی کو پیش نظر رکھ کر پیدا کی گئی ہو اس کی ہر حرکت ایک خاص قاعدہ اور قانون کے تحت واقع ہونی چاہیئے۔ اسی کو قانون فطرت کہتے ہیں۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کبریٰ کو قرآن کریم نے کس حسن و زیبائی سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَ اَنْشَأْنَا بَعْدَهَا
 قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّا اَحْسَوْا بِاَسْنَانَا اِذَا هُمْ مِنْهَا
 يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَ اَرْجِعُوْا اِلٰی مَا اُنْزِلْتُمْ فِيْهِ
 وَ مَسْكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ
(۱۱ — ۱۵/۲۱)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و فساد میں غرق تھیں ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق تباہ ہو گئیں اور ان کے بعد ہم نے دوسرے گروہوں کو اٹھا کھڑا کیا۔ جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو وہ اپنی بستیوں سے بھاگ اٹھے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے آواز دی کہ آ بھاگتے کہاں ہو؟ اسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا) اور انہی مکانوں میں (جن کی مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا) وہاں تم سے پوچھا جائے گا (کہ تمہیں اس عیش پرستی کا حق کیسے حاصل تھا)۔ بستیوں کے باشندوں نے پکارا، افسوس ہم پر۔ ہم بلاشبہ ظلم کرنے والے تھے۔ تو دیکھو وہ برابری پکارا کئے۔ یہاں تک کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق وہ ہلاک ہو گئیں کئے ہوئے کھیت کی طرح، بجھے ہوئے انگاروں کی طرح۔

ان آیات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے۔ ان پر ایک مرتبہ پھر بنگاہِ تدبر غور کر لیجئے اس لئے کہ ان میں قانونِ فطرت کا ایک نہایت اہم گوشہ سامنے لایا گیا ہے، یعنی قانونِ مکافات جو فطرت کے ہر قانون کی طرح اٹل اور محکم ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ
لَّوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهَوًا لَّآ تَخْذُ مِنْهُ مِنْ لَدُنَّا
إِنْ كُنَّا فَعِلِينَ ۝ (۱۶ — ۱۷/۲۱)

اور دیکھو ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کچھ کھیل تماشا کرتے ہوئے نہیں بنایا ہے۔ اگر ہمیں کھیل تماشا بنانا منظور ہوتا تو (ہمیں اس سے کون روک سکتا تھا؟) ہم خود اپنی جانب سے ایسا ہی کارخانہ بناتے۔ مگر ہم ایسا کرنے والے نہ تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سابقہ آیات اور ان آیات میں کیسا ربط مضمون ہے، کس قدر گہرا تعلق ہے! فرمایا کہ یہ تمام سلسلہ کائنات ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں ایک عالمگیر قانون کام کر رہا ہے۔ اور وہ قانون ہے حق و باطل کی باہمی کشمکش کا۔

بَلْ نَقْذِرُ الْبَاطِلَ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۝

وَ لَكُمْ الْوَيْلُ حَتَّى تَصِفُوْنَ ۝ (۲۱/۱۸)

بلکہ (یہاں حقیقت حال ہی دوسری ہے) ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں تو وہ باطل کا سر کچل ڈالتا ہے اور اسے فنا کر دیتا ہے۔ افسوس تم پر تم کیسی کلیسیا میں بیان کرتے ہو! دنیا میں جو چیز حق پر ہے (یعنی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے) وہ باقی رہے گی۔ وہ آگے بڑھے گی۔ جو اس کے خلاف روش اختیار کر لے گی، رُک جائے گی، مٹ جائے گی۔ عالم آفاق کی کوئی شے ہو یا انسانوں کی کوئی جماعت، سب کے لئے ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔ کائنات کیا ہے، انس اہم قانون کے زندہ شواہد کا مجموعہ اور سچی تاریخ کیا ہے، اس قانون کی عملی صداقتوں کا صحیفہ! اس لئے قرآن کریم نے جہاں اس عالمگیر قانون کو پیش کیا ہے جس کے ماتحت حق و باطل کے تصادم و نزاع کے فیصلے ہوتے ہیں، وہاں وہ اہم سابقہ کی تاریخ کو بھی سامنے لایا ہے، تاکہ اس قانون کی صداقت پر خود انسانی سرگزشت شہادت دیدے۔

وَ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۲۲/۳۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! ابلاغِ ہم نے تمہاری طرف حقیقت کو واضح کر دیا تو ان لوگوں کی قوموں کی مثالیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں اور تقویٰ شعار لوگوں کے لئے نصیحت (کی ہیں) اتار دی ہیں تاکہ تم ان پر خود کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔)

یہ عالمگیر قانون جو قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کو منضبط کرتا ہے، سنت اللہ (یعنی خدا کا مقرر کردہ قاعدہ) کہلاتا ہے۔ سورۃ مؤمن میں ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ أَشَدَّ قُوَّةً وَ أَثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا آغْنَىٰ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (۳۰/۸۲)

(اے پیغمبرِ اسلام کیا یہ منکرینِ دعوتِ ایمانی زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ اور طاقت اور زرینی استحکامات میں بھی ان سے بڑھ کر مضبوط تھے (مگر کیا ہوا؟ جب خدا کا فیصلہ یعنی

قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت آیا، تو جو کچھ دستکامات وغیرہ وہ کرتے رہتے تھے (خدا کے عذاب کے مقابلہ میں) ان کے کسی کام نہ آ سکے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ

فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ
وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۶/۸۲)
جب ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین کو لے کر آئے (تو ان پر غور و غوص کرنے کے بجائے) اپنے اُس (ناقص و ناکارہ) علم پر اترنے لگے جو ان کے پاس (آبارِ واجداد سے چلا آ رہا) تھا اور ان کی وہ باتیں خود انہی پر مسلط ہو کر رہیں جن کے ساتھ وہ لوگ (انبیاء کا مذاق اڑا کرتے تھے۔

اس پر جب ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو وہ چلا اُٹھے کہ

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِإِلَهِهِ وَحَدَّثَ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا
بِهِ مُشْرِكِينَ ۝ (۴۶/۸۳)

پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو چلانے لگے کہ ہم خدا کے یکتا و یگانہ پر ایمان لائے
اور ہم نے اُن (جھوٹے خداؤں) کا انکار کیا جن کو ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔

لیکن مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد نتائج برآمد ہو کر رہتے ہیں۔ یہ اللہ کا مقررہ قاعدہ (سنت اللہ) ہے۔

فَلَمْ يَكُنْ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُدَّتْ أَلْفُ الْكَافِرُونَ ۝ (۴۶/۸۵)

لیکن جب تب ہی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی تو ان کا یہ ایمان انہیں نفع دینے والا نہیں تھا
یہی اللہ کا قانون ہے جو اس کے بندوں میں چلا آ رہا ہے اور یہاں (یعنی اس حد تک) پہنچ کر انکار کرنے والے (ہمیشہ) خسارہ ہی میں رہے۔

یہ سنت اللہ (مقررہ قاعدہ) کسی ایک جماعت، ایک زمانہ یا ایک جگہ تک محدود نہ تھا۔ یہ مکافاتِ عمل کا عالمگیر قانون ہے۔ اس لئے جہاں جہاں انسان تھا، یہ قاعدہ کار فرما رہا، اُممِ گذشتہ میں بھی اور آج بھی۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَ كُنْ تَجِدَ أِسْنَةَ اللَّهِ

تَبْدِيلًا ۝ (۳۳/۶۲)

ان لوگوں میں جو پہلے گزر چکے ہیں، اللہ کا مقررہ قانون یہی تھا اور (اے پیغمبر اسلام! آئندہ بھی)

تم اللہ کے مقررہ قانون میں ہرگز ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے!

اس لئے کہ اللہ کے قوانین محکم اور اٹل ہوتے ہیں۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ

اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِ ۖ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا

مَقْدُورًا ۝ (۳۳/۳۸)

ایسا کام کر گزرنے میں نبی پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جسے اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

ان لوگوں میں جو پہلے ہو گزرے ہیں یہی اللہ کا مقررہ قانون رہا ہے اور اللہ کا ہر کام اندازہ

پر مقرر کیا ہوا ہے۔

اس قانون میں کبھی تبدل و تحول نہیں ہو سکتا۔

ۚ اُسْتَكْبَارًا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ

اِلَّا بِاَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ

تُجَدَّ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۝

(۲۳/۲۵ نیز ۲۸/۲۸)

(خدا کی زمین میں تکبر کرنے اور تخریب کی خفیہ تدابیر کی وجہ سے) (ان کی بیزاری ہی بڑھتی ہی)

اور (یاد رکھو) تخریب کی خفیہ تدابیر اپنے کرنے والوں کے سوا کسی اور پر تسلط نہیں ہوتیں تو

کیا یہ لوگ پہلے لوگوں کے طریقہ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ (اگر ایسا ہے تو اے پیغمبر!) تم ہرگز

ہرگز خدا کے مقررہ قانون میں نہ کوئی تبدیلی اور نہ ہی اس کے مقررہ قاعدے میں کسی قسم کا

تغیر پاؤ گے۔

اسی طرح حق پرستوں کی جماعت کے متعلق فرمایا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا ۚ لَا تَجِدُ

لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ (۱۷/۷۷)

ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے اور تو ہمارے ٹھہرائے ہوئے قاعدوں کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائے گا۔

اور ان کی مخالفت کرنے والے سرکشوں کے متعلق۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ
وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ أَلَا وَلَيْنَ أَوْ
يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ (۵۵/۱۸ نیز ۳۸/۸)

اور جب لوگوں کے سامنے ہدایت آگئی، تو ایمان لانے اور طلبِ کارِ حفاظت ہونے سے نہیں کونسی بات روک سکتی ہے؟ مگر یہی کہ اگلی قوموں کا سا معاملہ انہیں بھی پیش آجائے یا ہمارا عذاب سامنے آکھڑا ہو۔

اس لئے کہ زمانہ کے بدل جانے سے طریقِ کار کی شکلوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اصل روح ہر جگہ وہی کار فرما رہتی ہے۔ سورۃ ذاریات میں ہے۔

كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا
سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ ۚ أَتَوْا صَوَابَهُمْ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
طَاغُونَ ۚ (۵۲-۵۱/۵۲)

بالکل اسی طرح ان سے پہلی قوموں کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے (ہمیشہ) یہی کہا کہ یہ جھوٹا ہے یا کوئی پاگل ہے۔ کیا اس جواب کی یہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے چلے آئے ہیں؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ دراصل سرکش قوم (کے افراد) ہیں (اور نئے سرکشی ان سب کی گفتگو تک میں یکسانیت پیدا کرتی چلی آتی ہے)۔

یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ پہلی سرکش اور گمراہ قومیں آنے والی قوموں کے لئے وصیت چھوڑ جائیں کہ جب تمہیں حق کی دعوت دی جائے تو تم اس قسم کی روش اختیار کرنا۔ سرکش جذبات کا ہر جگہ تقاضا ہے کہ وہ اسی قسم کی روش اختیار کریں۔ سانپ کا بچہ کتاب میں پڑھ کر ڈسنا نہیں سیکھتا۔ یہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے حق و باطل کے معرکہ میں ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں تزام و تصادم بھی اپنی روح کے اعتبار سے ایک جیسا ہوگا اور نتیجہ بھی یکساں۔ فرق صرف طریقِ کار میں ہوگا۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرجی وہی عنتری

ایک بنیادی اصول | یہ سنت اللہ کیا ہے؟ بالکل سیدھی سادی بات واضح بین غیر مبہم اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَ أََنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۸/۵۳﴾
(اور یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے اسے پھر کبھی نہیں بدلتا جب تک کہ اس گروہ کے افراد اپنی نفسیاتی کیفیت نہ بدل لیں۔
یہ اس لئے کہ اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے!

نعمتیں ملتی اسے ہیں جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ پھر جب تک کوئی قوم اپنے اندر اہلیت رکھتی ہے ان نعمتوں سے سرفراز رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے تصورات زندگی (مَا بِأَنْفُسِهِمْ) آئین حیات (مَا بِأَنْفُسِهِمْ) نفسیاتی کیفیات (مَا بِأَنْفُسِهِمْ) کو بدل ڈالتی ہے اور اسے قوانین خداوندی کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ آئین کے تابع لے آتی ہے، تو اس تبدیلی کا فطری نتیجہ انعامات الہیہ سے محرومی ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ (۱۳/۱۱)
اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جب تک کہ وہ خود ہی اپنی نفسیاتی کیفیت نہ بدل ڈالے۔

ایمان کا مفہوم | یہی نفسیاتی کیفیت (مَا بِأَنْفُسِهِمْ) ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ خارجی تبدیلی اس داخلی تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ ذہنی تصورات اور قلبی کیفیات کے بدل جانے سے باہر کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ اس لئے جسے ”خدا کا عذاب“ کہا جاتا ہے، وہ کہیں خارج سے نازل نہیں ہوتا۔ انہی داخلی کیفیات و تصورات کے بدل جانے سے صلاحیت اور اہلیت ختم ہو جاتی ہے اور خارج کی وہ معاندانہ قوتیں جو اس سے پیشتر ان

کی داخلی صلاحیت و قوت کی وجہ سے ان کے مقابل آنے کی ہمت نہیں پاتی تھیں، ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں اور غلبہ پالیتی ہیں۔ یہ ہونہیں سکتا کہ ایک قوم اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھے اور وہ ہلاک کر دی جائے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (۱۱/۴)

اور (یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کرے درآخالیہ

اس کے باشندوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔

ہلاکت کیسے ہوتی ہے | ہلاکت تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ قوم سلامتی کی راہ کو چھوڑ کر غیر خداوندی راہیں (فسق) اختیار کر لیتی ہے۔

فَقَدْ يُرَفُّكَ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۳۵/۴)

تو کیا غیر خداوندی راہیں اختیار کرنے والی قوم کے سوا کوئی اور

بھی ہلاک کئے جاسکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں)۔

اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھئے کہ اس کارگہ سعی و عمل میں جو زندہ رہتا ہے، دلیل و برہان کے ماتحت زندہ رہتا ہے جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہلاک ہوتا ہے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُخَيَّرَ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ

وَ إِنْ اللَّهُ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ (۸۷/۴۲)

اس لئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے، دلیل و برہان کے مطابق ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے

دلیل و حجت کے مطابق زندہ رہے، بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے!

نہ یونہی (بلا ایمان اور سعی و عمل) سرفرازیوں حاصل ہوتی ہیں نہ ہی اندھا دھند نکتہ و زوال کا رسواں عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ یہ نظام کائنات، عدل و انصاف پر چل رہا ہے، ظلم و جور پر نہیں چل رہا۔

اے اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات یہ تباہی حوادث ارضی و سماوی کی شکل میں بھی آتی ہے۔ مثلاً سیلاب، زلزلہ، کوہ آتش فشاں کی ہلاکت سامانی، لیکن اس کی وجہ ”جوئے نور“ میں (عنوان حضرت نوح میں) بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیجئے۔ یہ ضروری ہے۔

فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

(۹/۴۰ نیز ۲۹/۴۰ : ۹۹ - ۱۱/۱۰۱)

اور ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا۔ مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ ہلاکت اور تباہی ہمیشہ انسان کے اپنے کاموں کی وجہ سے آتی ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ آيَاتِكُمْ وَ يَعْقُوبُ عَنْ كَثِيرٍ ۝ (۳۰/۳۲)

اور (یاد رکھو) جو کچھ مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوئی ہے اور بہت سی باتوں کو تو خدا معاف کر دیتا ہے۔

اگر قوم نوح غرق ہوئی تھی تو اپنی ہی خطاؤں کے باعث۔

مِمَّا خَطِيئَتُهُمْ أُغْرِقُوا ۝ (۴۱)

(دیکھو) وہ خود اپنی ہی خطاؤں کے باعث غرق کئے گئے

اور اگر قوم ثمود تباہ ہوئی تھی تو اپنے ہی جرائم کی وجہ سے۔

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوْهَا ۚ فَذَٰلَٰكَ مَا عَلِيْهِمْ رَبُّهُمْ يَذَّكِّيْهِمْ
فَسَوَّاهَا ۚ (۱۳/۹)

پھر انہوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا۔ چنانچہ ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ پس ان کے پروردگار نے اپنے قانونِ مکافات کی رو سے ان کی غلط روش کی وجہ سے ان کو ملیاٹ کر دیا اور (زمین کے) برابر کر ڈالا۔

دقس علیٰ ہذا۔ ورنہ اگر کوئی قوم صحیح راہوں پر چلتی جائے تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ انہیں خواہ مخواہ تباہ و برباد کر دے۔ یہ اس کے قانونِ عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدَابِكُمْ اِنَّ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَ كَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ (۴۱/۱۴)

لے معاف کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی صحیح عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کے اچھے اثرات مضر اثرات پر غالب آجائیں۔

لوگو! اگر تم شکر کرو (یعنی خدا کی نعمتوں کی قدر کرو اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لاؤ) اور خدا پر ایمان رکھو تو خدا کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ یعنی وہ کیوں خواہ مخواہ تمہیں عذاب دے؟ خدا تو (انسانی اعمال کا) قدر شناس اور (ان کی حالت کا) علم رکھنے والا ہے۔

ہلاکت و بربادی تو آتی ہی اس وقت ہے جب کوئی قوم قوانین الہیہ سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت و صیانت سے باہر لے جاتی ہے اور پھر دنیا میں کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جو ان کی پشت و پناہ بن سکے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَفَرَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْتًا لَهُمْ ۚ
ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَأَنَّ الْكَافِرِينَ
لَا مَوْلَى لَهُمْ ۚ (۱۰-۱۱/۴۷)

کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ (اچھی طرح نگاہِ عبرت سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں کیسا (دردناک) انجام ہوا ہے۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور (یاد رکھو ان) انکار کرنے والوں کے لئے بھی ان ہی جیسا (انجام) ہونا ہے۔ یہ محض اسی لئے ہے کہ خدا (صرف) اُن کا حامی و ناصر ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں اور ان انکار کرنے والوں کا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں ہے۔

خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جو ہلاکت سے بچا سکے، خواہ عقیدت و عظمت کی کتنی ہی نسبتیں ان کی طرف کیوں نہ کر دی جائیں۔ سورہ احقاف میں ہے۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَ لَكُمْ مِنَ الْفُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُونَ ۚ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
قُرْبَانًا آلِهَةً ۚ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۚ وَذَٰلِكَ رَافِكُهُمْ وَمَا
كَانُوا يَنْفَتَرُونَ ۚ (۲۷-۲۸/۴۷)

اور اے مخاطبینِ دعوتِ ایمانی دیکھو! جو جو آبادیاں تمہارے ارد گرد تھیں ہم نے ان سب کو اپنے قانونِ مکافات کے مطابق برباد کر دیا (ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو) اور ہم (اُن برباد شدہ آبادکاروں کے سامنے) اپنے قوانین کو بار بار لائے کہ شاید وہ حق کی طرف لوٹ

آئیں (مگر وہ باز نہ آئے اور بالآخر اپنے مکافاتِ عمل کو پہنچے) تو (اے مخاطبین! غور کرو کہ) ان معبودوں نے ان کی کیوں امداد نہ کی جنہیں انہوں نے خدا کے سوا خدائی تقرب کے لئے گھڑکھا تھا (وہ ان کی امداد تو کیا کرتے) بلکہ ان سے کھوئے گئے۔ اور یہ سب کچھ ان کا ایک جھوٹا تھا اور وہ باتیں تھیں جن کو وہ (بلا دلیل) افتراء کیا کرتے تھے۔

فرقہ بندی سے بڑا عذاب اعمال کی یہ سزا مختلف انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز صورت یہ ہوتی ہے کہ

قوم فرقوں میں بٹ جائے اور باہمی سرپٹول میں مصروف رہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ
أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيُزَيِّقَ بَعْضَكُمْ
بِأَسَرِّ بَعْضٍ ۚ أُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْأُمُورَ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝ (۶/۴۵)

(اے پیغمبر!) کہہ دو، وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پیروں
تले سے کوئی عذاب پیدا کر دے یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک
(گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے۔ سو دیکھو! کس طرح ہم گونا گوں طریقوں سے
آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں بوجھیں!

اوپر سے عذاب سے مراد یہ ہے کہ قوم کے بالائی طبقہ میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جائیں
کہ وہ نظم و نسق کو بگاڑنے کا موجب بن جائیں۔ اور ”نیچے سے عذاب“ سے مراد یہ ہے کہ قوم کا پچھلا طبقہ اٹھ
کر نظام کو درہم برہم کر دے یا یہ دونوں طبقے مخلوط ہو کر خانہ جنگی میں مصروف ہو جائیں بہر حال اس کی شکل کوئی
بھی ہو، قوم میں فرقہ پرستی اور گروہ سازی تخریب کے لئے سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے جو قوموں کی ہلاکت
کا باعث بنتا ہے۔

وَقُلْ لِّلْعِبَادِ يُقُولُوا الْبَیِّنَاتُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ
يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِرِجْسَانٍ عَلَدًا
مُّبِينًا ۝ (۱۴/۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو (یعنی ان سے جو دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں کہ) جو بات کہو، ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

لیکن عذاب کی صورت کوئی ہو، نتیجہ ہر حال ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔ ایسی قوم سے اللہ کی نعمتیں ایک ایک کر کے چھین لی جاتی ہیں۔

وَ اِذْ تَاَذَنَ رَبُّكُمْ لَنْ يَنْ شَكُرَكُمْ لَآ زِيْدَ تَكُمْ وَ لَنْ يَكْفُرْ تُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ (۱۴/۷)

اور کیا وہ وقت بھول گئے جب تمہارے پروردگار نے (اپنے اس قانون کا) اعلان کیا تھا کہ اگر تم نے شکر کیا یعنی ہر نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف کیا جس کے لئے وہ دی گئی تھی تو میں تمہیں اور زیادہ نعمتیں بخشوں گا اور اگر ناشکری کی تو پھر یاد رکھو، میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

محکومی اور بے عملی کی لعنت ان پر ستولی ہو جاتی ہے (ضَرْبَتْ عَلَيْهِمُ الدَّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ) اور یہ تبدیلی اس طرح آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر بتدریج رونما ہوتی ہے کہ اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ ان کی دنیا بدل کیسے گئی۔

فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبْ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۶۸/۴۴)

پس (اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں کو جو اس بات (یعنی آیاتِ قرآنی) کو جھٹلاتے ہیں میرے قانونِ مکافات کے حوالے کرو۔ یہ ان سے خود نیپٹ لے گا۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ ایسی جگہ سے کیسے گئے جس کے متعلق وہ (کچھ بھی) نہیں جانتے!

غیر محسوس انقلاب کسی درخت کے پاس سالہا سال تک کھڑے رہیے۔ اس طرح بیج پھونٹنے سے پھل لانے تک کے تمام مراحل آپ کی آنکھوں کے سامنے طے

پائیں گے۔ لیکن آپ بھی محسوس نہ کر سکیں گے کہ یہ تبدیلیاں ہو کیسے رہی ہیں اور ایک حالت سے دوسری حالت کب بدلتی ہے، آہستہ آہستہ بتدریج۔ مِّنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۵) ان راہوں سے جن کا تمہیں شعور تک نہ ہو۔ بیج پھل کی صورت اور عمل، نتیجہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کا پتا اس

وقت چلتا ہے جب اس سطوت و حکومت کی مالک قوم کی جگہ ایک دوسری قوم ملے لیتی ہے۔ یوں د بے پاؤں چپکے چپکے جیسے سینہ صحرا سے بہتاب کی چادر لپٹتی اور اس کی جگہ اندھیرے کی چادر بچھتی چلی جائے۔ کس قدر المناک ہے یہ کیفیت اور کیسی عبرت انگیز ہے یہ تبدیلی!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ افْعَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَتَأْتِلُمُ إِلَى الْأَرْضِ ط أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۖ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَتَفَرُّوا يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَ يَسْتَبْدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۖ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(۹/۳۹ — ۳۸)

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں! کیا مستقبل کی فکر کو چھوڑ کر تم صرف قریبی مفاد کی زندگی ہی پر ریکھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے) تو یاد رکھو! قریبی مفاد کی زندگی کی متاع تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر بہت تھوڑی! اگر قدم نہ اٹھاؤ گے، تو یاد رکھو! وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لاکھڑا کرے گا اور تم (دفاع سے غافل ہو کر) اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے (اپنا ہی نقصان کرو گے) اور اللہ تو ہر بات پر قادر ہے۔

ایک کی جگہ دوسری قوم | یہ نہیں کہ اندھیرے کی جگہ اندھیرا آجائے، یعنی جو نئی قوم، مٹنے والی قوم کی جگہ لے وہ بھی انہی جیسی خصوصیات کی مالک ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ تبدیلی ہی کیوں ہو؟ وہ مٹے ہی کیوں اور یہ بڑھے کیسے؟ مٹی تو وہ ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آگے وہ بڑھتی ہے جس میں حرکت اور حرارت کے چشمے اُبلتے ہیں۔ اس لئے یہ آنے والی قوم جانے والی قوم کے مثل نہیں ہوتی۔

هَآنَئِثُمْ هُوَ لَا ءِ تَدْعُونَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَخْشَى ۚ وَ مَنْ يَخْشَى فَإِنَّهُ يَخْشَى عَنِ نَفْسِهِ ۖ وَاللَّهُ

الْغَنِيِّ وَ اَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَكَّلُوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا
غَيْرَكُمْ لَا تُمْرُوْا بِمَكَوْلُوْا اَمْثَلَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸)

دیکھو! تم ہی تو وہ لوگ ہو جن کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھو۔ (مگر) تم میں وہ لوگ بھی ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) جو بخل کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کے خلاف بخل کرتا ہے (کیونکہ خدا کی راہ میں جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے وہ دراصل تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر خرچ ہوتا ہے) اور اللہ تو (تمہارے اس روپیہ سے) بے نیاز ہے اور (دراصل) تم خود ہی اس کے محتاج ہو۔ (یاد رکھو!) اے پیرانِ دعوت ایمانی! اگر تم صحیح راستے سے مُنہ موڑ لو گے تو تمہاری جگہ خدا کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی!

ربِّ مشارق و مغارب اس پر شاہد ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوتی ہے۔

فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ اِنَّا لَقَدِمْوْنَ ۝ عَلٰی
اَنْ تُبَدِّلَ سَخِرًا مِّنْهُمْ لَا وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ (۵۱/۴۱-۴۰)
پس (اس حقیقت کبریٰ پر) مشارق و مغارب کا پروردگار شاہد ہے کہ ہم یقیناً اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر (اقوام) کو ان کی بجائے بدل کر لے آئیں اور ہم عاجز کئے ہوئے نہیں ہیں!

یہ قوم صالح بڑھتی پھیلتی جاتی ہے اور اس غیر صالح قوم پر چاروں طرف سے زمین تنگ ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ پورے طور پر مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اور بتدریج اس لئے کہ قوموں کی زندگیاں صبح اور شام کے پیمانوں سے نہیں ناپی جاتیں۔ ان کے بننے اور بگڑنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللهُ وَعْدَهُ وَاِنْ
يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَالْفِ سَنَةِ رَمًا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷)

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے تباہی کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں (یعنی کہتے ہیں کہ اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکنا؟) اور اللہ کبھی ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے مگر تیرے پروردگار کے یہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم

لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس۔

ظہورِ نتائج کا وقت | لیکن صدی ہو یا ہزار سال، جب اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ۝ (۲۸-۱۰/۲۹)

اور یہ لوگ کہتے ہیں ”اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ، یہ وعدہ (یعنی انکارِ حق کا نتیجہ) کب سامنے آئے گا۔ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو (یہ معاملہ کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ بتلا دوں) کب واقع ہوگا (میں تو خود اپنی جان کا بھی نفع نقصان اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر قوم کے اعمال کے نتائج سامنے آنے کے لئے ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے۔

اُس وقت تقدیم و تاخیر کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ مٹنے والی قوم مٹ کر رہتی ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۚ

(۲۳/۲۴)

کوئی قوم مہلت کے وقفہ سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس لئے کہ یہ سب کچھ ایک مقررہ قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرِيْبٍ إِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ (۲-۱۵/۵)

ہم نے کبھی کسی بستی کے باشندوں کو ہلاک نہیں کیا، مگر اسی طرح کہ اس کے لئے ایک ایسا قانون مقرر تھا جس کا انہیں علم دے دیا گیا تھا۔ کوئی امت نہ تو اپنے مہلت کے وقفہ سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے!

اس ”وقتِ معین“ کے معنی یہ نہیں کہ ان کی ”تقدیر“ میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوتا ہے کہ انہوں نے فلاں

وقت پر تباہ ہو جانا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے جیسے بیج سے کھیتی پکنے تک کی مدت معین ہوتی ہے۔ جب اعمال کے نتائج ظاہر ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو پھر اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ وقت اُس قوم کی ہلاکت کا ہوتا ہے۔ اسی کو "آنے والی گھڑی" کہتے ہیں۔ جو قوم اس آنے والی گھڑی کو جھٹلاتی ہے اور اپنے آپ کو فریب دے کر سمجھ لیتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا وہ سب سے زیادہ بد بخت ہے۔

قَوْلُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝ (۵۱/۶۰)

تو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے اس (ظہور نتائج کے اعمال کے) وقت سے انکار کر دیں جس سے انہیں آگاہ کیا جا رہا ہو۔

ظہور نتائج کی ساعت (آنے والی گھڑی) آ کر رہتی ہے۔ اس وقت قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ سورہ جاثیہ کے آخری رکوع کو دیکھئے۔ اس حقیقتِ عظمیٰ کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ
يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ ۝ (۳۵/۲۷)

یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کا اقتدار تمام کائنات کو محیط ہے۔ جب وہ انقلابِ عظیم واقع ہوگا تو یہ لوگ جو باطل کی روش پر چل رہے ہیں، سخت نقصان اٹھائیں گے۔

جب ہر قوم کے مستقبل کا فیصلہ ان کے اعمال کے مطابق کیا جائے گا۔

وَسَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ حَافِیَةٌ ۚ فَمِنْ كُلِّ اُمَّةٍ تَدْعٰی اِلٰی کِتٰبِهَا
اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ هٰذَا ۙ کِتٰبُنَا یَنْطٰقُ
عَلٰی کُمْ بِالْحَقِّ ط اِنَّا کُنَّا نَسْتَنۡسِیۡکُمْ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۳۵/۲۸-۲۹)

اُس وقت ہر مخالف قوم کی قوت ٹوٹ چکی ہوگی اور تو دیکھے گا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہوگی۔ ہر قوم کو بلایا جائے گا کہ وہ اپنے اعمال نامہ کو دیکھے۔ اُس وقت ہر قوم کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے اور اسے ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے گا (۱۹/۶۸)۔

(ان سے کہا جائے گا کہ) جو کچھ تم کیا کرتے 'وہ سب اس رجسٹر میں لکھ لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا۔ نہ کم نہ زیادہ، بالکل صحیح۔
جنہوں نے اپنے اعمال سے اپنے اندر شاد کامی و کامرانی کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہوگی، وہ کھلی ہوئی کامیابی سے بہرہ افروز ہوں گے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝ (۳۵/۳۰)

(اعمال نامہ کے مطابق ہر ایک کا فیصلہ ہوگا) جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں 'ان کا نشوونما دینے والا انہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے گا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

لیکن جنہوں نے قوانین الہیہ سے سرکشی برتی ہوگی، وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔
وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ أَفْلَمْ تَكُنْ آيَاتِي عَلَيْكُمْ قَسْبًا وَكَثْرًا ۚ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ (۳۵/۳۱)

اور جو لوگ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں 'ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے سامنے میرے قوانین پیش کئے جاتے تھے، لیکن تم ان سے سرکشی برتتے تھے اور ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔

وہ لوگ کہ

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَالسَّاعَةُ لَا تُرَبُّبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ ۚ إِنَّ نَظْنَؤ رِالًا ظُلُمًا ۖ مَا نَحْنُ بِمُتَّبِقِينَ ۝ (۳۵/۳۲)

اور جب تم سے کہا جاتا تھا کہ یاد رکھو! خدا کا وعدہ حق ہے۔ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے اسی طرح واقع ہو کر رہے گا اور یہ انقلاب آکر رہے گا۔ اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ انقلاب کیا ہے، ہم اسے محض ایک واہمہ سمجھتے ہیں۔ ہم اس پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔

لیکن اس وقت ان کے اعمال کے نتائج محسوس و مشہود پیکروں میں ان کے سامنے ہوں گے، ہجومِ بلا کی طرح انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۵/۳۳)

اُس وقت اُن کی بد عملیوں کے نتائج کھل کر ان کے سامنے آجائیں گے اور جن باتوں کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے، وہ انہیں ہر طرف سے گھیر لیں گی۔

جب فیصلہ کی گھڑی پہنچتی ہے تو اس وقت بے بسی اور بے چارگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سیلاب کو دیکھتے ہیں کہ اُمڈے چلا آ رہا ہے لیکن اسے روکنے کی طاقت نہیں، مدد کے لئے چلاتے ہیں لیکن کوئی مددگار نہیں۔

فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَ اللَّهُمُ الصَّيْقَةَ وَهُمْ يَنْظُرُونَ
فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَ مَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ ۝ (۵۱/۳۵-۳۴)
تو (دیکھو) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی رالآخر کڑک نے انہیں آپکڑا اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر نہ تو وہ اٹھ کر کھڑے ہی ہو سکے اور نہ ہی اپنی مدافعت کر سکے۔

بے بسی ہی نہیں بلکہ بدبختی، ایسی بدبختی کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑتے ہیں تا کہ بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جائیں (۵۹/۲)۔

اس طرح یہ حکومت و سطوت اور شوکت و ثروت کی مالک قوم ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہو کر تپ دق کے مریض کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہلاکت خود اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس پر کسی کی آنکھ نمناک نہیں ہوتی۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْأَرْضُ وَ مَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ۝ (۴۴)
چنانچہ نہ تو ان (کے) اس دردناک انجام پر آسمان و زمین کی آنکھ روئی اور نہ ہی انہیں (کوئی) اہلت نصیب ہوئی۔

اور جب کوئی قوم اس طرح تباہ ہو جاتی ہے تو پھر دوبارہ نہیں اُٹھ سکتی۔

وَ حَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ (۲۱/۹۵)

اور اس آبادی کے لئے جسے ہم نے (ان کے اعمال کے نتیجہ میں یوں) تباہ کر دیا ہو، یہ حتمی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ (دوبارہ) نہیں لوٹیں گے (یعنی حیاتِ تازہ حاصل نہیں کر سکیں گے) PHYSICALLY

ہلاکت کے معنی | آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں قوموں کی تباہی و بربادی کے لئے ہلاکت اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے حیات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبعی طور پر اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم کی قوم صفحہ ارض سے مٹ جائے۔ لیکن ہلاکت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت و سطوت عزت اور اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکتہ اور زوال کے جہنم میں جا پہنچیں۔ اس قوم کے افراد جیتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کی حیات اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے، خواہ تعداد کے اعتبار سے وہ کروڑوں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ سو جہاں جہاں قوموں کی ہلاکت کا ذکر آتا ہے، اس مفہوم کو ہمیشہ سامنے رکھئے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس آئینے میں آپ کو اپنے متعلق کیا دکھائی دیتا ہے۔



جرائم کی فہرست | یہ جرائم جن کا لازمی نتیجہ ہلاکت اور تباہی تھا، کیلئے یوں تو ان کی فہرست بڑی لمبی چوڑی مرتب ہو سکتی ہے، لیکن جس طرح نیکی سے مراد

قانون خداوندی کی اطاعت ہے، اسی طرح بُرائی سے مفہوم اس قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس لئے ان جرائم کی نوعیتیں کتنی ہی مختلف ہوں، حقیقت سب جگہ ایک ہی تھی، یعنی قوانینِ الہیہ سے روگردانی۔ کفر، شرک، تکذیب، گناہ، جرم، ظلم، فسق، فساد، سب اسی شجرِ ملعونہ کی شاخیں ہیں (ان کا باریک فرق اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گا)۔ بنیادی طور پر اسے کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی سرے سے اس حقیقت ہی سے انکار کہ انسانی زندگی کے لئے غیر متبدل قوانینِ خداوندی کی ضرورت ہے (۵۱-۴۴/۶) (۸۱-۹۰)۔ کہیں اسے تکذیب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ تکذیب کی دو اہم شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب ان سے کہا جائے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہے تو وہ اسے سچ سمجھنے سے انکار کر دیں۔ اس وہنیت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے (۲۳/۲۴) (۲۴-۲۵/۳۵)۔

وہ اس دعوت کی تکذیب اس لئے کرتے تھے کہ یہ جدید مسلک ان کی اس روش کے خلاف تھا جو ان کے آثار و اجداد سے متواتر چلی آرہی تھی (۶-۲/۳۸)۔ یہ اسلاف پرستی ہے اور اسلاف پرستی میں ہوتا یہ ہے کہ انسان حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ یعنی جس چیز کے متعلق متواتر عقیدہ چلا آتا ہے کہ وہ حق ہے اسے بلا سند و دلیل حق سمجھ لیا جاتا ہے۔ اندھی تقلید کی اس فضا میں بقول (HUME) "اعمال اس لئے مقبول نہیں ہوتے کہ وہ نیک ہیں بلکہ انہیں نیک اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں مقبولیت عامہ کی سند حاصل ہے۔" اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب بلا علم کرتے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ ۖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ
كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۶/۳۹)

نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

تکذیب کی دوسری شکل یہ ہے کہ زبان سے تو قوانین خداوندی کا اقرار کیا جائے لیکن زندگی ان کے خلاف گزاری جائے۔ اس سلسلہ میں سورت الماعون کو بنگاہ تفکر دیکھئے۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی (۶-۱/۱۰۶)۔ کسی حقیقت کا محض زبان سے اقرار انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ تباہی سے بچاتا ہے اسی عمل کا نتیجہ جو اس حقیقت کے مطابق کیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے "اٰمَنُوْا" کے ساتھ "عَمَلُوْا الصّٰلِحٰتِ" کو لازمی قرار دیا ہے۔

•••

تکذیب کے ساتھ استہزاء، مخالفت میں بدترین دنیایت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو قوم اس قسم کے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے وہ تباہی سے کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔

استہزاء | وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۚ فَاهْلِكُوا
أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَ مِثْلُ الْأَوَّلِينَ ۝ (۴۳/۸-۷)

اور (دیکھو) ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر یہ کہ وہ لوگ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے
(نتیجہ وہی ہوا یعنی ہلاکت)۔ لہذا یہ قوم مخالف کیا چیز ہے؟ ہم نے ان سے زیادہ قوت و
سطوت والوں تک کو برباد کر ڈالا ہے۔ اور پہلے لوگوں کی مثال گزر چکی ہے (جو عبرت
حاصل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

ظلم | قوانین الہیہ سے انکار اور تکذیب اور ان کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی تردید و
انفیذ کا لازمی نتیجہ ظلم تھا۔ نتیجہ کیا؟ انسانوں کا خود ساختہ نظام بذاتِ خود ظلم اور فساد ہے
جس کا نتیجہ ہے ہلاکت۔

و كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً ۚ وَ اَنْشَأْنَا بَعْدَهَا
قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّا اَحْسَنُوْا بَاْسَنَا اِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُوْنَ
وَ تَرْكُضُوْا وَ اَرْجِعُوْا اِلٰى مَا اُسْرِفْتُمْ فِيْهِ ۚ وَ مَسْكِنُكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْأَلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ
دَعْوَاهُمْ حَتّٰى جَعَلْنَاهُمْ حَصِيْدًا ۙ خَامِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۱ - ۱۵)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و شرارت میں غرق تھیں ہم نے پامال کر ڈالیں اور ان کے بعد
دوسرے گروہوں کو اٹھا کھڑا کیا! جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو اچانک بستیوں
سے بھاگ اٹھے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں آواز دی کہ اب بھاگتے کہاں ہو؟
اپنے اسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمہیں اس قدر شرار کر رکھا تھا)۔

بستیوں کے باشندوں نے پکارا، "افسوس ہم پر! بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے"
تو (دیکھو) وہ برابر ہی پکارا کرتے، یہاں تک کہ ہم نے (انہیں ہلاک) کر دیا کٹے ہوئے کھیت
کی طرح، بجھے ہوئے انگاروں کی طرح!

ظلم و سرکشی | "ظلم" بڑا جامع لفظ اور قرآن کریم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ضرر
"نا انصافی" نہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام

پراسے ہونا چاہیے۔ اس اجمال کے اندر ظلم کی تمام تفصیل سمٹ کر آجاتی ہیں۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ قوموں کی تباہی کی بنیادی وجہ ظلم ہوتا ہے۔ چونکہ اس مقام پر ان تمام آیات کو سامنے لانے کی گنجائش نہیں اس لئے ہم چند ایک اہم آیات کو سامنے لانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً قوم نوح کے سلسلہ میں کہا ہے۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَاظْلَمُوا
وَالْمُؤَلَّفُكَ أَهْوَىٰ ۚ فَفَشَلْنَا مَا عَمِلُوا ۚ (۵۲-۵۳/۵۳)

اور (کیا انہیں معلوم نہیں کہ) قوم نوح کو بھی اب سے (بہت) پہلے خدا ہی نے تباہ کیا تھا؟ بلاشبہ وہ تو بہت ہی زیادہ ظالم اور بہت ہی سرکش لوگ تھے اور (پھر) اوندھی کی ہوئی بستیوں کو (ایک تنکے کی طرح) اٹھا کر پھینک دیا اور (اتنا ہی نہیں) پھر ان پر جو کچھ مسلط ہوا سو مسلط ہوا۔

اور ظلم اور سرکشی پیدا اس وقت ہوتی ہے جب سامانِ رزق کی فراوانی ہو۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۚ..... وَمَا كُنَّا
مُفْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۚ (۵۸-۵۹/۵۸)

اور (غور تو کرو) ہم نے کس قدر بستیوں کو برباد کر دی ہیں (جن کی آبادیاں) اپنی (سامان) معیشت (کی فراوانی) پر اترا یا کرتی تھیں۔ چنانچہ یہ ہیں ان کے مکانات جو بجز معدودے چند ان کے بعد سے (آج تک) آباد ہی نہیں ہو سکے۔ اور بالآخر ہم ہی ان کے وارث ہوئے (یعنی ہمارا اقتدار ہی ان پر غالب آکر رہا) اور (اسے پیغمبر اسلام!) تیرا پروردگار ان بستیوں کو اس وقت تک برباد کرنے والا نہیں تھا جب تک ان کے کسی مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیج دیتا جو ان کے سامنے ہمارے قوانین پیش کر دیتا (یوں اتمامِ حجت ہو جاتا) اور (یاد رکھو) ہم (یونہی) آبادیوں کو برباد کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے باشندے ہی ظالم ہوں (اور) اعمال سے اس بربادی کے فیصلہ کو اپنے اوپر لازم کر لیں)۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی اور فارغ البالی قابلِ نفرت چیز ہیں، کیونکہ اُن سے ظلم و سرکشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مال و دولت تو خدا کی نعمتیں ہیں۔ اس لئے نعمتِ قابلِ مذمت

کس طرح ہو سکتی ہے؟ قابلِ مذمت ہے یہ روش کہ مال و دولت اور قوت و حشمت کو قوانینِ الہیہ کے تابع نہ رکھا جائے بلکہ انہیں اپنی خواہشات کے مطابق صرف کیا جائے جس کا نتیجہ خدا فراموشی اور خود فریبی ہو۔ اس جذبہ کی ابتداء اس خیالِ باطل سے ہوتی ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنی تدبیر و ہنر سے ملا ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتٍ مَّا كَسَبُوا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ
سَيِّئَاتٌ مَّا كَسَبُوا ۚ وَ مَا لَهُمْ بِمُغْيِرِينَ ۝ (۳۸ - ۳۹/۵۱)

اور (دیکھو) ان کے اعمال کی خرابیاں اُن پر (اچھی طرح) واضح ہو جائیں گی اور جن باتوں کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے وہ ان پر مسلط ہو جائیں گی۔ جب کسی آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اپنی طرف سے اُسے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے "اس کے سوا اور کیا ہے کہ مجھے اپنے علم و بصیرت کی وجہ سے یہ نعمت مل گئی ہے" (اے خود فریب انسان! یاد رکھ، ایسا نہیں ہے) ایسا سمجھنا فتنہ ہے۔ لیکن اکثر آدمی اس حقیقت کو جانتے نہیں۔ اسی قسم کی ذہنیت ان لوگوں کی بھی تھی جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں۔ مگر جو کچھ وہ کرتے رہے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ چنانچہ ان کے اعمال کے تخریبی نتائج انہیں پہنچ کر رہے۔ اور (اے افرادِ نسلِ انسانی! یاد رکھو) ان (موجودہ) لوگوں میں سے جو لوگ ظلم (دسکشی) کی راہ اختیار کر رہے ہیں انہیں بھی ان کے اعمال کے نتائج پہنچ کر رہیں گے۔ اور وہ (کسی طرح بھی خدا اور اس کے قوانین کو) ہرانے والے اور عاجز کر دینے والے نہیں ہیں!

جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ دولت و ثروت تنہا میری کاریگری کا نتیجہ ہے تو اس دولت پر نازاں ہو کر جو وہ استبداد پر اُتر آتا ہے۔ سورۃ العام میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَلَخَذُوا نُهُم بِالْبُلْسَاءِ
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ۝ (۶/۴۲)

(اے رسول!) یہ کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تم

پہلے بھی ہم، دیگر اقوام کی طرف، اپنا پیغامبر بھیجتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ابتدائی تنذیر ہوتی ہے تاکہ لوگ محتاج ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر کے، قانون خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔ یہ خدا کی طرف سے پہلی تنذیر WARNING ہوتی ہے تاکہ اس سے عبرت حاصل کر لیں۔ لیکن وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

فَلَوْ لَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۶/۴۳)۔

لیکن اس تنذیر سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ لے کہ ان کی مفاد پرستوں کے جذبات ان کے کاروبار کو ان کی نگاہوں میں بڑا خوشامبنا کر دکھاتے اور ان سے کہتے کہ جس کام میں اس قدر جلد اور آسانی سے مفاد حاصل ہو رہے ہیں، انہیں چھوڑ دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟

اور جس تعلیم کی انہیں یاد دلانی جاتی ہے اسے بھلا دیتے ہیں اور اپنی خوشحالی اور عیش پسندی میں بدست ہو جاتے ہیں تو پھر قانون مکافات کی محکم گرفت آپہنچتی ہے جس سے اس قوم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۝ فَقَطَّعَ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ط وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۶/۴۴-۴۵)۔

انہیں یہ مفاد عاجلہ حاصل اس لئے ہوتے کہ ہمارا قانون مکافات، عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں، ہمت کا وقفہ رکھتا ہے اس لئے انسان کی غلط روش سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ فوراً تباہ ہو جائے چنانچہ وہ لوگ خدا کے قانون کو پس پشت ڈال دیتے، لیکن اس کے باوجود ان پر سامانِ زیست کے دروازے کھلے رہتے (۱۴/۱۱۲)۔ وہ اسی طرح قوت اور دولت کے نشتر میں بدست ہوتے چلے جاتے اور اس کے ساتھ ہی ان کی غلط روش کے تباہ کن اثرات بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے تاکہ ان کے ظہور کا وقت آجائے۔ تو وہ قوم، اپنی توقعات کے یکسر خلاف گرفت میں آجاتی اور ان پر ایسا زوال آتا کہ ان کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

اس طرح اس قوم کی جڑ کاٹ جاتی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ جب ان کی تباہی سے نظام ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دور ہو جاتے تو وہ نظام دنیا کے لئے وجہ ہزار حمد و ستائش بن جاتا۔ اس طرح یہ تخریبی مرحلہ تعمیری منزل کا پیش خیمہ بن جاتا۔ یہی ہمارا قانون ہے۔ یہاں ہر تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ حق کے نظام کے متکثر ہونے کے لئے باطل کے نظام کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ جب تک ظالم کی جڑ نہ کٹے، مظلوم کی کھیتی ہری نہیں ہوتی۔

سورۃ اعراف میں اسی حقیقت کو تصریف آیات سے یوں دہرایا گیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبِاسِ
وَالضَّرَآءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ۝ (۷/۹۴)

یہ محض چند واقعات ہیں جنہیں اس مقام پر سامنے لایا گیا ہے۔ ورنہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخی یادداشتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا تو اس کے ارباب دولت و ثروت نے اس کی مخالفت کی ۳۴/۳۴ و ۴۳/۲۳۔ جب تک ان کی غلط روش اس درجہ تک نہ پہنچتی کہ وہ ان کی آخری تباہی کا موجب بن جائے ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں اور مشکلیں آتیں۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ دیکھ کر قوانین خداوندی سے سرکشی برتنا چھوڑ دیں اور ان کے سامنے جھک جائیں۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں خود ان کے غلط نظام کی پیدا کردہ ہوتی تھیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ قوانین الہیہ پر ایمان لے آتے اور تقویٰ شعار بن جاتے تو ان پر زمین و آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیئے جاتے۔

وَكُذَّآءِ أَهْلَ الْقُرَىٰ أَصْنُوْا وَاتَّقُوا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ
مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا
يَكْسِبُونَ ۝ (۷/۹۶)

اگر یہ لوگ ہمارے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے اور اس کی اتباع سے زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کی فکر کرتے تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے

(۷۶۱/۵: ۷۶۱/۷)۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں آن پکڑا۔

غور کیجئے۔ ایک رزق کی فراوانی وہ تھی جس نے خدا بھلا دیا اور ایک فراوانی یہ ہے جسے قرآن نے زمین و آسمان کی برکات قرار دیا ہے۔ لیکن یہ فراوانی ایمان و تقویٰ سے ملتی ہے۔ قوانین الہیہ کی تکذیب و انکار کا نتیجہ تو بہر کیف ہلاکت ہے، ایسی ہلاکت جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ۚ
أَوْ أَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يُلْعَبُونَ ۚ
أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۷۹۹-۸۰۰)
یہ ہیں وہ حقائق جو تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں تو کیا اس کے بعد بھی (یہ تمہارے مخاطب) جو مختلف بستیوں میں رہتے ہیں اس سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آنے جب وہ سو رہے ہوں۔

کیا یہ اس سے بالکل پختہ ہو رہے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آجائے جب وہ بے خبر کھیل کود میں مشغول ہوں۔

کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں خدا کی تدبیروں کی طرف سے امان مل چکی ہے؟ یاد رکھو! اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں وہی قوم رکھ سکتی ہے جس نے تباہ اور برباد ہونا ہو۔

سورہ اعراف کی تین اگلی آیات پر بھی ساتھ کے ساتھ ہی غور کرتے جائیے کہ ان میں بھی اسی حقیقت کی تہنیں ہیں۔ فرمایا۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا.....
وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَ هُمْ كَافِرِينَ ۝ (۸۰۱-۸۰۲)

یہ لوگ جو پہلی قوموں کی تباہی کے بعد ان کے ملک اور دولت کے وارث ہوئے ہیں کیا ان پر یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوتی کہ ہمارا قانون ان کے جرائم کی بنا پر انہیں مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔

لیکن یہ جو اس قدر واضح دلائل و شہادات کے باوجود ان باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سلاف کی اندھی تقلید اور مفاد پرستیوں کے جذبات نے انکے سمجھے سوچنے

کی صلاحیتوں کو سلب کر دیا ہے۔

بہر حال یہ ہیں وہ چند اقوام سابقہ جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کئے ہیں۔ ان کے رسول ان کی طرف واضح دلائل و احکام لے کر آتے۔ وہ لوگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر غور و فکر کرتے، بلا سوچے سمجھے اسے جھٹلا دیتے۔ کبھی اس بنا پر کہ اس سے پہلے ان کے آباء و اجداد اُسے جھٹلا چکے تھے اور کبھی یوں کہ ایک دفعہ جو بات یونہی منہ سے نکل گئی اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ حقیقت سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر یوں ہسری لگا کرتی ہیں۔ اسلاف کی اندھی تقلید اور اپنی بات کی تیج انسان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیا کرتی ہے۔

ان اقوام سابقہ میں سے اکثر کی یہی حالت رہی کہ وہ قوانین خداوندی کے وفا شعار نہ رہے۔ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا اس پر قائم نہ رہے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلنے لگ گئے۔

یہ وہ قومیں تھیں جنہیں ہر قسم کی فراغت حاصل تھی لیکن ان لوگوں نے خدا کی ان نعمتوں کا غلط استعمال شروع کر دیا اور تباہ ہو گئے (۵-۶/۶)۔ قصہ قارون کے ضمن میں کہا:

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ
لَا يُهْدِي الْمُفْسِدِينَ ۝ (۶۶-۶۸/۶)

اس کی زندہ شہادت قارون کی سرگذشت ہے۔ وہ قوم موسیٰ ہی کا ایک فرد تھا، لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر خود اپنی قوم کے افراد پر بڑی زیادتی کرتا تھا۔ (ہر سرمایہ دار کی طرح) ان کا خون چوستا تھا، چنانچہ اس طرح اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ اس کے خزانوں کو ایک طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی (ایا اس کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط زور آور جماعت کی ضرورت تھی)۔

(اس دولت کے نشہ نے اسے بدست کر دیا تھا) چنانچہ اس کی قوم (کے باہوش طبقہ) نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اتراؤ نہیں۔ اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش قانون خداوندی کی رو سے پسندیدہ نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ، لیکن اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت کا جمع کرنا ہے اور بس۔ زندگی اس کے بعد بھی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اپنی اُس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو اور معاشرہ میں ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ تاکہ تم امیر سے امیر تر بنتے جاؤ اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو روش قانون خداوندی کی رو سے پسندیدہ نہیں اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن وہ نشہ دولت میں بدست تھا جیسے ہر سرمایہ دار CAPITALIST ہوتا ہے۔ اس نے ان باتوں کو نگاہ کے تبسم سے سنا اور لب کی ہنسی سے ٹھکرا دیا، یہ کہتے ہوئے کہ (معاذ اللہ) کہاں کا خدا اور کون سا اس کا فضل! میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی تدابیر سے کیا ہے۔ اس لئے جس طرح میرا جی چاہے اسے صرف کر لو۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۖ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً
وَ أَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُلِّهِمُ الْمُجْرِمُونَ ۝ (۲۷/۷۸)
قارون بولا، یہ تو میں نے اپنی ہنرمندی کی بنا پر حاصل کیا ہے؟ کیا خوب! اس نے اتنا
بھی نہ جانا کہ اس سے پہلے خدا ان نسلوں (مک) کو تباہ کر چکا ہے جو قوت کے اعتبار سے اس
سے زیادہ مضبوط اور جمعیت کے اعتبار سے اُس سے زیادہ تعداد میں تھیں؟ اس قسم کے غلط کار
لوگوں سے (ان کھلی ہوئی) غلط کاریوں کے متعلق سوال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

سمجھنے بوجھنے والے | اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ یہ ہلاک ہونے والے سب کچھ سمجھتے بوجھتے دیکھتے
بھالتے تھے۔ علم و ہنر کے مدعی، ایجادات و انکشافات میں سب سے آگے
تہذیب و تمدن کے اجارہ دار دانش و بینش میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھنے والے۔ لیکن بائیں ہلپے

ہاتھوں سے اپنی ہلاکت کے سامان فراہم کرنے پر مہم۔ سب کچھ سوچتے سمجھتے، تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں جا رہے تھے اس لئے کہ — عقل کو تابع فرمان نظر کرنے سکے — قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ کے اندر اس حُسن و خوبی سے مرکوز کر دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا۔

وَ عَادًا وَ ثَمُودًا وَ قَدْ تَبَيَّنَ لَكُم مِّنْ مَّسْكِنِهِمْ وَ قَفَّ وَ زَيْنَ
لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّ هُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَ كَانُوا
مُتَّبِعِينَ ۝ (۱۲۹/۳۸)

اور ہم نے عاد اور ثمود کو تباہ کر دیا اور (یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں) ان کے مکانات کے کھنڈ
خود اس کے شاہد ہیں۔ اور بات یہ تھی کہ مفاد پرستی کے جذبات نے ان کے لئے ان کے اعمال
کو مزین بنا رکھا تھا۔ چنانچہ انہیں راہ (حق) سے روک دیا۔ اور یہ لوگ اندھے نہیں تھے سب
کچھ دیکھنے بھالنے والے تھے۔

اس ”متبصرین“ کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمادی۔

وَ لَقَدْ مَنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا
وَ أَبْصَارًا وَ أَفْئِدَةً زَمًا أَعْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَا أَبْصَارُهُمْ
وَ لَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
وَ حَاقَّ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ (۴۶/۲۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان امور میں اس قدر قوت دے رکھی تھی جس قدر قوت تمہیں
بھی نہیں دی اور انہیں سمع اور بصر اور قلب (سب ہی کچھ) عطا کر رکھے تھے۔ مگر ان کے کان
اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اس لئے کہ وہ قوانین خداوندی کا انکار کیا کرتے
اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں انہی باتوں نے آکر گھیر لیا جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ اس آیہ جلیلہ کے مفہوم پر غور کیجئے اور اتنا غور کیجئے کہ یہ آپ کے قلب کی گہرائیوں میں
اُتر جائے۔ اس لئے کہ آج جو کچھ یورپ کے لالہ زاروں میں ہو رہا ہے وہ اسی حقیقت کبریٰ کی تفسیر ہے۔
بصارت و سماعت، دانش و بینش، علم و ہنر، سب کچھ موجود ہے، لیکن چونکہ قوانین خداوندی سے انکار
مُحسوس ہے اس لئے عقل و تدبیر کی فصول کاریاں بے بس ہو کر ٹھٹھکی گئی ہیں اور جن حقائقِ ابدی کی ہنسی اڑائی جاتی

تھی وہ پھانسی کا پھندا بن کر پورے یورپ (اور اس کے ساتھ اس کے ملحقین) کے گلے میں پڑا ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ وَ حَاقَّ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَكْثِرُونَ ۝ اس لئے کہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہو کر تھیں، دل کی آنکھوں کی روشنی کم ہوا کرتی ہے۔ فَإِنَّهَا لَوْ تَعَسَىٰ أُلُوهَ بَصَآرُ ۚ وَلَكِنْ تَعَسَىٰ أَلُكُلُوبُ ۚ أَلَتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۲۶)۔ یاد رکھئے! عقل و دانش عالم آفاق کے انکشافات و اختراعات میں ضرور رہنمائی کرتی ہے لیکن انسانی میسٹ اجتماعیہ میں جہاں انسانوں کے حقوق و مفاد کا باہمی تصادم و نزاع ہو، نہایت عقل کبھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجود مستبصرین ہونے کے، انسانی حیات اجتماعیہ کے معاملہ میں اندھے کے اندھے رہ جاتے ہیں۔

اور یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کسی سوسائٹی میں عیوب اس درجہ عام ہو جائیں کہ عیب عیب ہی نہ سمجھا جائے۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں اور قوم کو فتنہ و فساد سے کوئی روکنے والا نہ ہو یعنی ان کی زندگی کی پوری عمارت غیر صالح بنیادوں پر استوار ہو جائے اور فکر و نظر کے تمام گوشے اسی عمارت کے مختلف شعبے بنتے چلے جائیں۔

فَلَوْ كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَخَذْنَا مِنْهُمُ
وَ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُخْرِفُوا فِيهِ وَ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ (۱۱۶)
پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، ان میں اہل خیر باقی ہے
ہوتے اور لوگوں کو شر و فساد کرنے سے روکتے؟ ایسا نہیں ہوا! بہت تھوڑے لوگ صحیح راستے
پر رہے اور انہیں ہم نے محفوظ رکھا، ظلم کرنے والے تو اسی راہ پر چلے جس میں انہوں نے
(اپنی نفس پرستیوں کی) آسودگی پائی تھی اور وہ سب (احکام حق کے) مجرم تھے۔

یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں بچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے تباہ ہو جاتے ہیں۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ ۚ وَ أَهْلُهَا مُصِلِحُونَ ۝ (۱۱۷)
(اور) یاد رکھو! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے اور اس
کے باشندوں میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔

اکابر مجبرین | سورۃ انعام میں کہا گیا ہے کہ
وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرًا مِّنْهَا لِيُنْذِرُوا

فِيهَا ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ (۶/۱۲۳)

اور (دیکھو جس طرح آج مکہ کے رئیس دعوتِ حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں) اسی طرح ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سوا پیدا ہوتے رہے جو وہاں مکہ و فریب کے جال پھیلاتے تھے۔ اور فی الحقیقت وہ مکہ و فریب نہیں کرتے تھے مگر اپنے ہی ساتھ (کیونکہ وہ حق کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے) اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے تھے) لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے تھے۔

اس آیتِ جلیلہ کے مفہوم پر پھر غور کیجئے۔ اکابر مجبرین، یعنی قومی تدبیر و سیاست کے اراکین و معتمدین، عمائدِ سلطنت و حکومت، اربابِ سطوت و حکومت، نظامِ حکومت کے واضعین، سب مل کر بیٹھتے ہیں اور دوسری قوموں کی ہلاکت و بربادی کے لئے خفیہ تدابیر سوچتے ہیں (لِيُنْذِرُوا فِيهَا) (مکہ کے معنی خفیہ تدبیر کے ہیں) چپکے سوچتے ہیں۔ اندر ہی اندر دوسروں کی ہلاکت کے منصوبے باندھتے اور تیار

کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت ادھر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے میں اُسی وقت دوسری قوم کے اربابِ حل عقد بھی اسی قسم کے منصوبوں میں منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خفیہ تدابیر جو ان کے نزدیک بزرگم خویش دوسروں کی ہلاکت کا ذریعہ بننے والی ہوتی ہیں درحقیقت خود انہی کی ہلاکت کا سامان لئے ہوتی ہیں۔ وَمَا يَشْعُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ لیکن ان بد نصیبوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور نہیں جانتے کہ ہم خود کسی کی کن جان کاہ تدبیروں میں مصروف ہیں۔ وَمَا يَشْعُرُونَ چنانچہ یہ سب کچھ اندر ہی اندر ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہی قوتیں آپس میں اس انداز سے متصادم ہو جاتی ہیں کہ ساری دنیا ان زلزلوں کے دھماکے سے کپکپا اٹھتی ہیں۔

وَكَذَلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (۱۱۹)

اور (دیکھو) اس طرح ہم بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر تسلط کر دیتے ہیں ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے۔

∴

عبث آموزی | جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان واقعات و کوائف کی طرف توجہ اس لئے منعطف کرائی جاتی ہے کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے، یعنی وہ فائدہ اٹھایا جائے جو

تاریخ اُمم کی تدوین و تحفظ سے مقصود ہے۔ ہر آنے والی قوم یہ سمجھ لے کہ فلاں قوم نے فلاں روش زندگی اختیار کی تو ان کا یہ انجام ہوا اور اگر اسی قسم کی روش زندگی ہم اختیار کریں گے تو ہمارا بھی یہی حال ہوگا۔ نزول قرآن کریم کے وقت بنی اسرائیل کی قوم جیتی جاگتی سامنے موجود تھی۔ یہ وہ قوم تھی جس کی عظمت و شوکت کی وارث امت محمدیہ ہونے والی تھی۔ اس لئے جماعت مومنین سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھو کہ خدا کی نعمتوں کی ناپاس گزاری کرنے والی قوم کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

سَلِّ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَلِيَّةٍ ۚ وَمَنْ يُبَدِّلْ
نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَرِيدٌ
الْعَقَابِ ۝ (۲/۲۱۱)

دائے پیغمبر! چاہیے کہ یہ لوگ پھیلی امتوں کی سرگزشتوں سے عبرت پکڑیں۔ ان سے کہو کہ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انہیں (علم و بصیرت کی) کتنی روشن نشانیاں دیں اور کس طرح فلاح و سعادت کی تمام راہیں ان پر کھول دیں؟ لیکن اس پر کبھی وہ راہ ہدایت پر قائم نہ رہے (اور نعمت الہی کی قدر شناسی نہ کی) اور جو کوئی خدا کی نعمت پا کر پھر اسے (محمودی و شقاوت سے) بدل ڈالے تو یاد رکھو! خدا (کا قانونِ مکافات) بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

یہ قوم تو سامنے موجود تھی اس لئے ان کی پریشان حالی اور تباہی و بربادی محسوس شکل میں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن ان سے پیشتر اور متعدد اقوام ایسی گذر چکی تھیں جن کی صرف داستانیں باقی تھیں۔ اس لئے ان کے حالات بیان کر دیئے تاکہ ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ اس عبرت آموزی کے لئے سب سے پہلے عرب کے ان کفار سے مخاطب کیا گیا جو اپنی قوت و سطوت کے نشہ میں قوانینِ الہیہ کی اطاعت سے سرکشی برتتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ ذرا اقوامِ گزشتہ کے حالات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ کیا تم ان سے بھی زیادہ قوت و حشمت کے مالک ہو۔ جب قوانینِ خداوندی سے انکار و عدوان سے ان کا انجام ہلاکت اور تباہی ہوا تو کیا تمہارا بھی وہی انجام نہ ہوگا۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ
كَأُولَٰئِكَ فَجْرٍ مِّنْ ۚ (۲۴/۲۴)

اے پیروانِ دعوتِ اسلامی! غور تو کرو، کیا یہ (یعنی منکرینِ دعوت) بہتر حالت میں ہیں یا

قوم متع اور وہ قومیں جو ان سے بھی پہلے گزر چکی ہیں بہتر حالت میں تھیں؟ (مگر تمہیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے ان کی قوت کی ذرا پروا نہیں کی) ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ (کیونکہ) بلاشبہ وہ (ہمارے قوانین کے اعتبار سے) مجرم لوگ تھے۔

سورہ محمد میں ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجْنَاكَ
أَهْلُكَلَّهُمْ فَلَا قَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۱۳/۴۷)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کتنی ہی آبادیاں تھیں جو قوت (شوکت) کے اعتبار سے تمہاری اس آبادی (دالوں) سے زیادہ مضبوط تھیں جنہوں نے تمہیں باہر نکال دیا ہے (مگر جب ہمارا قانون مکافات حرکت میں آیا تو ان کی قوت کچھ بھی کام نہ آئی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ) ہم نے (جب) ان کو ہلاک کر دیا تو ان کا کوئی مددگار بھی نکل کر نہ آ سکا (اور ایک نہ ایک دن یہی ان لوگوں کا بھی انجام ہو کر رہنا ہے)۔

اور یہ اس لئے کہ

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيْتٍ مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ

لے اس آیت سے متصل اور آیات پر مزید غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں مکافات عمل کے عالمگیر قانون کا فلسفہ کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۝ مَا خَلَقْنَاهَا إِلَّا
بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۸-۳۹/۴۲)

اور (یاد رکھو) ہم نے آسمان و زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہیں کھیل کود کے خیال سے پیدا نہیں کیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن (افسوس کہ) اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے ہی نہیں۔

یعنی تمام کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے، محض کھیل تفریح کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ یہ سب کچھ ایک عظیم الشان مقصد کھصول کی خاطر اور ہا ہے اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تمام اعمال اپنے ناکج ٹھیک ٹھیک مرتب نہ کریں۔

وَ اقْبَعُوْا اَهْوَاٰهُمْ ۝ (۱۳/۴۷)

(خیال کر دو) کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل پر چل رہا ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے پاس دلیل و برہان تو کچھ نہیں، البتہ اس کی بد عملیاں اس کی نگاہ میں خوبیاں بن کر دکھائی دیں اور یہ لوگ صرف خواہشات (نفسانی) کی پیروی کرتے ہیں؟ (ظاہر) کہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

جو کچھ عرب کے مستبد اور سرکش کہتے تھے وہی کچھ ان سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ
اَسَدٌ مِّثْلُنَا ۚ اَوْ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اُمَّهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ
هُوَ اَسَدٌ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَنْجَحِدُوْنَ ۝ (۱۵/۴۱)

پس (دیکھ لو) عاد نے (خدا کی) زمین میں بلا وجہ غرور و تکبر کیا اور کہنے لگے "ہم سے بڑھ کر قوت میں زیادہ مضبوط کون ہو سکتا ہے؟" اور اس انا ولا غیر کی کانفرہ لگانے سے پہلے کیا انہوں نے (اتنا بھی) نہ دیکھا کہ جس خدا نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے بھی بڑھ کر قوت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے! (سب کچھ جانتے ہوئے بھی) وہ لوگ (ضداد و عناد کے ساتھ) ہمارے قوانین کا انکار کرنے کے عادی ہو گئے تھے!

عاد اور ثمود تو کیا، فرعون جیسے استکبار و فرعونیت کے مجسموں کو قانونِ مجازات کی محکم گرفت نے نہ چھوڑا۔

وَ لَقَدْ جَاءَ اِلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ
ضَلٰلٍ وَّ سُعِيْرَةٍ ۝ (۴۱ — ۵۴/۴۷)

اور (دیکھو) قومِ فرعون کے پاس بھی انکار و بد عملی کے نتائج سے آگاہ کرنے والے آچکے تھے (مگر) انہوں نے ہمارے قوانین کو (یکے بعد دیگرے) جھٹلادیا۔ پھر (انجام بھی ہوا کہ) ہم نے انہیں ایک غالب قدرت والے کی طرح پھڑپھڑایا۔ (تو اب بتلاؤ کہ) کیا تمہارے انکار کرنے والے ان انکار کرنے والوں سے بہتر ہیں یا (خدا کی طرف سے) صحیفوں میں تمہارے لئے کوئی برأت (لکھ دی گئی) ہے۔ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کرنے والی جمعیت ہیں؟ (شاید انہیں معلوم نہیں کہ) بہت جلد ان کی اس جمعیت کو شکست دیدی جائے گی اور وہ سب پیٹھ موڑ جائیں گے۔

اس انقلاب کا دن ان کے وعدہ کا دن ہے (اوشاید تمہیں معلوم نہیں) کہ انقلاب کا دن بہت ہی خوفناک اور بہت ہی تلخ دن ہوگا۔ بے شک مجرم لوگ ہیں ہی ہلاکت اور مصیبت میں۔

سورۃ مزمل میں ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۖ شَهِدًا عَلَيْنَا ۖ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ
فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۖ فَمِنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۚ (۱۵۱-۱۵۳/۴۳)

(اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے جو تم پر نگران ہے (بالکل اسی طرح) جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پس فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے بھی اسے سخت گرفت کے ساتھ پکڑ لیا تو اگر تم انکار کر دو گے تو اس دن (کی گرفت سے) کس طرح بچ سکتے ہو جس کی ہولناکی بچوں کو بوڑھا کر دے گی۔ آسمان اس پکھٹ پڑنے والا ہوگا اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

(یاد رکھو) بلاشبہ تو ایک (فراموش کردہ حقیقت کی) یاد دہانی ہے، سو جو چاہے اپنے پروردگار

کی طرف راستہ اختیار کر لے (اور جو نہ چاہے نہ اختیار کرے)۔

آخری آیت کی حکمت بالغہ پر غور کیجئے۔ کیسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا کہ قرآن تو فقط قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے اٹل اور محکم نتائج و عواقب کی یاد دہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کرے اپنے اللہ کے قانون کا اتباع کرے اور یوں زندگی کی سیدھی راہ پر ہو لے، ورنہ اس کے لئے ہلاکت منتظر کھڑی ہے فرعون کی سرکشی اور فتنہ سامانی کا انجام تمام پس آندگان کے لئے عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے۔

قَلَمًا أَسْفُونًا اُنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۖ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا
وَ مَثَلًا لِّلْآخَرِينَ ۚ (۵۵۱-۵۵۴/۴۳)

سو جب انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو ہم نے ان سے انتقام لیا چنانچہ ان سب کو غرق کر دیا اور اس طرح ہم نے انہیں بعد میں آنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بنا دیا۔

پھر جو قوم ان اقوامِ گذشتہ کے احوال و عواقب سے عبرت حاصل نہیں کرتی وہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ اس قانون کی ہمہ گیری انہیں چاروں طرف سے محیط ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۖ فِرْعَوْنٌ وَ ثَمُودُ ۖ بَلِ الَّذِينَ

كَفَرُوا فِي تَكْذِيبِ ۚ وَاللَّهُ مِنْ ذَرَارِهِمْ حَاطٌ ۝ (۱۷۱-۱۸۵)

اے پیغمبر اسلام! کیا تم تک فرعون اور ثمود کے لشکروں کی باتیں پہنچی ہیں؛ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے سرکشوں کا راستہ اختیار کیا ہے وہ (سچائی کو) جھٹلانے ہی میں لگے رہتے ہیں اور اللہ (کا قانونِ مکافات) انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (جس سے بچ کر وہ کہیں نکل نہیں سکتے)۔ یہ قانون ایسے محفوظ مقام (علیم البتہ) میں رکھا گیا ہے جہاں کسی کی دسترس نہیں ہو سکتی کہ اس کے نتائج و اثرات میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ فِي كُوفٍ مَّحْفُوظٍ ۝ (۲۱۱-۲۲۸/۱۸۵)

اصل بات یہ ہے کہ وہ سچائی (جسے یہ لوگ جھٹلانے میں لگے رہتے ہیں) بڑی شان والا قرآن ہے جو محفوظ تختی میں ہے۔

ان لوگوں سے کہا کہ دور مت جاؤ۔ خود اپنے گرد و پیش کی اُجڑی ہوئی بستیوں کی طرف دیکھو اور غور کرو کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۲۴۱/۲۳۶)

اور (اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) ہم نے تمہارے آس پاس اور ارد گرد کی بہت سی بستیوں کو برباد کر دیا اور ہم نے اپنے قوانین کو بار بار دہرایا کہ ممکن ہے (یہ لوگ) لوٹ آئیں (اور اپنی بد عملیوں سے باز آجائیں)۔

ان میں وہ قویں بھی شامل ہیں جو اپنی مرکزیت کھو بیٹھنے کے بعد ازیں سوراخہ ازاں سودر ماندہ — در بدر خاک بسر، ماری ماری پھر رہی ہیں اور زمین کے کسی گوشے پر انہیں تمکن حاصل نہیں کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھی یہی حال ہو؟

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَوْمٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ ۖ هَلْ مِنْ مَّجِيئٍ ۝ (۳۶۱/۵)

اور (اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) ان (منکرینِ دعوت) سے پہلے ہم نے کتنی ہی نسلیں برباد کر دی ہیں جو ان سے زیادہ طاقت و قوت میں مضبوط تھیں۔ چنانچہ انہوں نے تمام شہروں کو چھان مارا (مگر جب

ہمارا قانونِ مکافاتِ حرکت میں آیا تو کیا ان کے لئے کوئی بھی بھاگنے کی جگہ تھی؟

حیرت ہے کہ تم ان واقعات کو اپنے کانوں سے سنتے اور ان تباہ حال اقوام کے پس ماندگان کی عبرت انگیز حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو لیکن پھر بھی اپنی روش میں اصلاح نہیں کرتے۔

تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۖ وَ لَقَدْ جَاءَهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۖ
كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ
مِنْ عَهْدٍ ۖ وَ إِنَّا وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ كَافِرِينَ ۝ (۱۰۱-۱۰۲/۷)

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں جن کے حالات ہم نہیں سناتے ہیں۔ ان سب میں ان کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے، مگر ان کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اُسے (سچائی کی) نشانیاں دیکھ کر مان لیں۔ سو دیکھو اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی سے) انکار کرتے ہیں۔

اور ان میں سے اکثروں کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور اکثروں کو ایسا ہی پایا

کہ یک قلم نافرمان تھے!

تم اس لئے عبرت حاصل نہیں کرتے کہ تم قانونِ مکافاتِ عمل پر (جس کا مہتمی حیاتِ اخروی پر ایمان ہے) یقین نہیں رکھتے۔

وَ لَقَدْ آتَوْنَا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمِطِرَتْ مَطَرَ النَّوَارِ أَفْلَحُ
يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَتَذَكَّرُونَ نَشُورًا ۝ (۲۵/۴۰)

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ (بار بار) اس آبادی پر گزر چکے ہیں جس پر (پتھروں وغیرہ کی) بُری طرح بارش برساتی جا چکی ہے۔ مگر ان لوگوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی تو کیا ان لوگوں نے اس آبادی کو دیکھا ہی نہیں (اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ وہاں سے گزر گئے) نہیں بات دراصل یہ ہے کہ انہیں دوبارہ زندہ ہونے (اور اعمال کی جواب دہی) کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔

لیکن نصیحت تو وہ حاصل کرے جو ان تاریخی امثال و نظائر کو بہ نگاہ بصیرت دیکھے، بگوشِ ہوش سے اور پھر انہیں قلب کی گہرائیوں میں اتار کر ان پر غور و فکر کرے۔ ورنہ اگر انہیں اساطیرِ الاولین (پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں)

سمجھ کر سن لیا اور پڑھ لیا تو ظاہر ہے کہ اس ”داستان گوئی“ سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لِنُكْرَى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَ
 هُوَ شَهِيدٌ ۝ (۵۷/۳۷)۔

بلاشبہ اس میں اُن ہی لوگوں کے لئے نصیحت ہے جن کے پاس (صداقت آشنا) دل ہو یا یہ کہ
 وہ (بات کی طرف) کان بھی لگائیں اور خود اپنے ہوش و حواس کے ساتھ (موجود بھی رہیں) یہ نہیں کہ
 کان تو یہاں ہیں اور دھیان کہیں (اور)۔

یہ نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ انسان پاداشِ عمل سے خوف نہ کھالے جو جلنے کی تکلیف سے نہیں ڈرتا اس کے سامنے
 جلے ہوئے لوگوں کی درد و کرب کی اندوہناک داستانیں ہزار دہرائیے اس کے دل پر اس سے کیا اثر ہو سکتا
 ہے؟ اس لئے فرمایا۔

وَتَرْكُنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ (۵۱/۳۷)
 اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں ایک نشانی چھوڑ دی
 لہذا تاریخی حقائق کیسی ہی عظیم الشان حکمتِ بالغہ پر منتج ہوں قانونِ مکافات کی واروگیر سے اعراض برتنے والی
 قوم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۚ لَّا حِكْمَةٌ
 بَالِغَةَ ۚ فَمَا تُغْنِ السُّدُورُ ۚ فَتَوَلَّوْا عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى
 شَيْءٍ تُكْرَهُ ۚ مُخْشِعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ
 جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۚ (۵۳/۷-۳)

اور ان کے پاس وہ وہ خبریں آچکی ہیں جن میں دھمکیاں اور حکمتِ بالغہ (سب کچھ موجود تھیں)
 مگر (نتائجِ اعمال سے) ڈرانے والے کچھ کام نہ آ سکے۔ سو اے پیغمبر! تم ان کی پروا نہ کرو (اور)
 اس دن کا انتظار کرو جس دن بلائے والا سخت چیز کی طرف بلائے گا، آنکھیں (شرم و
 ندامت سے) جھکی ہوئی ہوں گی۔ (اپنی) خواب گاہوں سے وہ اس طرح نکل رہے ہوں گے
 جیسے پراگندہ اور منتشر ٹڈیاں۔

اس لئے قرآن اسی کے لئے باعثِ نصیحت و وجہِ اصلاح ہو سکتا ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرنے کا متمنی

ہو۔ سورہ قمر کی جو آیات جلیلہ اوپر گزر چکی ہیں ان کے بعد مختلف اقوام و مملکتوں کے گزشتہ کے کو افسانہ زندگی، ان کے فساد انگیز اعمال، حیات اور ان اعمال کے تباہ کن نتائج و عواقب کا بیان ہے ان میں سے ہر قوم کے عبرت انگیز انجام کے بعد اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ

وَلَقَدْ يَمَنُّنَا الْفُتْرَانَ ۚ الَّذِي كُفِرَ مِنْهُ مَدَّ كِبَرُهُ (۵۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی

نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن کریم کھول کر ان آیات کو بہ نگاہ تدبیر دیکھئے۔ حکمت و موعظت کے نئے نئے باب کھلتے نظر آئیں گے۔

۔۔۔

اب تک تاریخی نظائر پر غور و تدبیر کے دو طریقے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مٹی ہوئی قوم کے پریشان حال افراد کی حالت زار و زبوں پر غور کر کے سوچا جائے کہ یہ چلتے پھرتے جنازے کس شاندار ماضی کے افسانے ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ اہم سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں جو زبانِ زبدِ خلاق ہوں یا تاریخ کے صفحات میں محفوظ مرکزِ نگاہ بنائی جائیں۔ لیکن تاریخی حقائق کی نقاب کشائی اور ان سے عبرت آموزی کا ایک اور طریق بھی ہے جسے اثری انکشافات

ARCHAEOLOGICAL DISCOVERIES

کہا جاتا ہے۔ دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ عظیم المیراث علمی کارنامہ عصرِ حاضر ہی کی ایجاد ہے لیکن جس کی نگاہیں قرآن پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اولیت کا سہرا بھی اسی جامع علوم و حکم کے سر ہے۔ قرآن کے اوراق کو الٹتے اور دیکھتے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ جاؤ، زمین میں چلو پھرو اور جن اقوام گزشتہ کے افسانے تمہارے کانوں تک پہنچے ہیں ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں میں پہنچو اور ان کی مٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی سطوت کے کھنڈرات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان کی بھری ہوئی پرانی ٹھیکریوں پر عبرت و موعظت کی کتنی اثر انگیز اور دل دوز داستانیں منقوش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھو اور ان کے آئینے میں ماضی کے واقعات اور سوانح کا مطالعہ کرو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ۝ هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى

وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۱۳۷-۱۳۸)

اور دیکھو تم سے پہلے بھی دنیا میں (قوموں کی حیات و ممات اور عروج و زوال کے) دستور و قوانین کا فرما رہے چکے ہیں (اور وہ تمہارے لئے معطل نہیں ہو جاتیں گے) پس دنیا کی سیر کر لو دیکھو کہ جو لوگ احکام حق کو جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا اور پاداشِ عمل میں کیسے نتائج پیش آئے؟ یہ لوگوں (کے فہم و بصیرت) کے لئے ایک بیان ہے اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں ہدایت و موعظت ہے!

اس سے ایک ہی آیت بعد فرمایا کہ وَ تِلْكَ الْآيَاتُ نُذِرُ لَهَا بَيِّنَاتٍ لِّلنَّاسِ جَعَلْنَاهَا آيَاتٍ لِّمَن يَّرْغُورُ کرو اور دیکھو کہ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا قانون کس طرح عالمگیر اور جزر و مد ہے؟ سورۃ یوسف میں ہے۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ط وَ سُبْحَنَ اللَّهِ ذَا مَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۲/۱۰۸)
(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے میں جو تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں تو علی وجہ البصیرت بلاتا ہوں اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ اللہ بلند و بالا ہے۔ میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں!
و دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى ط أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَكَ الْأَخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۲/۱۰۹) ذ (یوسف/۱۶)

(اور اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر اس طرح کہ وہ باشندگانِ شہر ہی میں سے ایک آدمی تھا اور ہم نے اس پر وحی اتاری تھی۔ پھر کیا یہ لوگ (جو تمہارے اعدائے رسالت پر متعجب ہو رہے ہیں) زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو پہلے گزر چکے ہیں؟ اور جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نجات کرتے ہیں تو یقیناً آخرت کا گھرانہ کے لئے کہیں بہتر ہے۔ پھر (اے گروہ مخاطب!) کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

تم نے قوم عاد و ثمود کے تذکرے سُنے، ان کے مٹنے کی داستانیں تمہارے کانوں تک پہنچیں۔ اٹھو اور دیکھو۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً

لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۲۷/۵۲)

چنانچہ یہ ان کے مکانات ہیں جو اوندھے پڑے ہیں۔ (کیوں؟) اس وجہ سے کہ انہوں نے ظلم اور

نا انصافی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ بلاشبہ اس (صورتِ حال) میں ان لوگوں کے لئے (بڑی)

نشانی ہے جو ذرا بھی (علم و شعور) رکھتے ہیں۔

ان اُجڑے ہوئے دیار سے ان شوریدہ بخت اقوام کی تباہی پر غور کرو۔ ان مسکن سے ساکنین کی حالت کا اندازہ لگاؤ۔ ان کے کھنڈرات ان کی عمارات کی رفعت و شوکت پر قیاس کرو (۳۷-۲۸/۲۹)۔ تم صبح و شام آنکھیں بند کر کے ان کھنڈرات سے گزر جاتے ہو اور نہیں سوچتے کہ ان کے اندر ماضی کے کتنے کتنے بڑے قد آور آئینے مدفون ہیں جن میں حال کے خد و خال نمایاں طور پر دکھائی دے سکتے ہیں۔ ان پر سے گزرتے ہوئے اندھوں کی طرح مت گزر جاؤ۔ آنکھیں کھول کر چلو اور ان ٹھیکریوں میں آنے والے دور کی عبرت آموز تصویریں دیکھو۔

وَإِذْ كُنْتُمْ لَشُرُودَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِينَ ۚ وَ بِالنَّارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳۷/۱۳۸-۱۳۹)

اور بلاشبہ تم لوگ ان (برباد شدہ اقوام کی آبادیوں) پر صبح کو اور راتوں کو گزرتے رہتے ہو۔

تو کیا تم (پھر بھی) کچھ سمجھتے نہیں؟

اور یہ اس لئے کہ تمہاری آنکھوں میں دیکھنے کی تمہارے کانوں میں سننے کی اور تمہارے دلوں میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ سورہ حج میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ

فَكَأَيُّ مَن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ۚ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى

عُرُوشِهَا وَ بَيْتٌ مُّعَظَّلَةٌ وَ قُصِرَ مَسْجِدُهَا ۝ (۲۲/۴۵)

پھر دیکھو کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی

اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنوئیں ناکارہ ہو گئے۔ سر بفلک محل کھنڈ بن گئے۔

اس کے بعد اس سے اگلی آیت کو دیکھتے اور دل کی آنکھوں سے دیکھتے۔ فرمایا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا
أَوْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْنَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْنَى
الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ (۳۲/۳۶)

کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے تو سمجھتے تو جھٹکتے
کان ہوتے تو سنتے اور پاتے حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو آنکھیں اندھی
نہیں ہو جایا کرتیں (جو سرور میں ہیں) دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

اس عظیم النظیر ٹکڑے کو جلی حروف میں لکھ کر سامنے آویزاں کر لیجئے کہ اِنَّهَا لَا تَعْنَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ
تَعْنَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝

غور کیجئے! ان اثری انکشافات کی تاکید کس قوم سے کی گئی تھی اور اس پر عمل کس نے کیا؟ آج یورپ
کے علمائے اثریات نے مدت العمر کی محنت شاقہ اور مسلسل سعی و عمل سے انہی زمین دوز کھنڈرات سے اقوام
سابقہ کے تہذیب و تمدن اور عروج و زوال کی حقیقی الامکان تاریخ مرتب کر لی ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ خود اپنے
کھنڈرات کے آئینے میں اپنی حالت نہیں دیکھتے۔ لیکن یورپ نے یہ تمام سعی و کاوش محض علمی تحقیقات کی غرض
سے ہی کی اور ان سے وہ صحیح تاریخی فائدہ نہ اٹھایا جس کی طرف قرآن کریم
اثری تحقیقات سے غرض؟ کی حکمت بالغہ راہ نمائی کرتی ہے۔ اگر یہ تمام کدو کاوش قرآنی روشنی میں کی
جاتی تو مغرب ان تمام علمی ذخیروں کے بعد اس طرح بلا کست میں نہ گرتا۔ قرآن کریم کی رو سے ان تمام اثری انکشافات
اور تاریخی تحقیقات کا منتہی یہ ہے کہ ان سے قوانین خداوندی پر چلنے کی دلیل حاصل کی جائے نہ کہ انہیں محض علمی
تفنن کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ سورہ سجدہ میں فرمایا۔

أَوْ لَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ
يَئْتُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ ۖ أَفَلَا
يَسْمَعُونَ ۝ (۳۲/۳۶)

کیا اس کتاب نے ان پر یہ بات واضح نہیں کر دی تھی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں برباد
کر دی ہیں جن کے مکانوں کے درمیان وہ چلتے پھرتے ہیں۔ (اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو) بلاشبہ
اس میں بڑی ہی نشانیاں تھیں۔ تو کیا وہ لوگ (ان واقعات کو) سنتے ہی نہیں۔

ان کھنڈرات کی ٹھیکریاں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو قانونِ فطرت کی شکل میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ اس لئے اس سے اگلی آیت میں فرمایا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ
زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ۝ (۳۲/۲۷)

کیا انہوں نے (اتنا بھی) نہیں دیکھا کہ ہم ہی ہیں جو پانی کو خالی (اور خشک) زمین کی طرف لے جاتے ہیں اور اس سے کھیتیاں اگادیتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی کھاتے ہیں۔ کیا وہ (اتنا بھی) نہیں دیکھتے؟

جو شخص اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کی زمین میں پیداوار کی صلاحیت ہوگی۔ وہ فطرت کی گہراریوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے گا پانی کی زبردستی اس کے کسی کام نہ آئے گی خواہ علمی اعتبار سے اسے قانونِ زراعت کی تمام جزئیات تک پر بھی عبور کیوں نہ ہو۔ جو شخص سیاحتِ ارضی اور اثری انکشافات سے اس نتیجہ تک نہیں پہنچتا کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا انجام کیا ہوتا ہے اس کے سر کی آنکھیں کھلی لیکن دل کی آنکھیں اندھی رہتی ہیں۔ سورہ نمل میں ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝
(اے پیغمبرِ سلام! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ ذرا زمین میں چلیں پھر یہ اور دیکھیں کہ مجرموں کا انجام کیسا کچھ ہوجکا ہے!

اور اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا کہ

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا دُلُّوا مُدِيرِينَ
وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ
يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ۝ (۲۷/۸۱-۸۰)

(اے پیغمبرِ سلام! یہ حقیقت ہے کہ تم مردوں کو (اپنی باتیں) نہیں سنا سکتے اور نہ ہی اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہو (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دیں اور نہ ہی تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر صحیح راستے کی طرف لا سکتے ہو۔ تم (اچھی طرح سمجھ لو کہ) ان لوگوں کے سوا جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تم کسی کو (اپنی پکار) سنا ہی نہیں سکتے، چنانچہ وہی لوگ ہیں جو

(ہماری) اطاعت (اور تابعداری) کرنے والے ہیں!

غور فرمایا آپ نے کہ علمی کاوشوں سے صحیح طور پر کون متمتع ہو سکتا ہے؟ وہی جو قانونِ کافاتِ عمل پر ایمان رکھتا ہے۔ جو قوانینِ فطرت پر اس انداز سے غور نہیں کرتا اسے اس کا علم ہلاکت سے نہیں بچا سکتا۔ سِیْرُ ذَا فِي الْأَرْضِ کو تو مبدار و معاد کی دلیلِ راہ بن جانا چاہیے۔

سِیْرُ ذَا فِي الْأَرْضِ

قُلْ سِیْرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ط إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹/۲۰)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کہہ دو کہ زمین میں گھومو پھر و پھر دیکھو کہ خدا نے اپنی مخلوق کو ابتداء کس طرح پیدا کیا ہے (اور خدا کی خلافتِ سرمد میں ختم نہیں ہوگی)۔ پھر (اس کے بعد) خدا کے قانون کے مطابق نشاۃ ثانیہ ہوگی۔ بلاشبہ خدا ہر چیز پر قادر ہے!

اور اس سے اللہ کے اس قانونِ مشیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے ماتحت قوموں کے اعمال کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے (۲۹/۲۱)۔ اس قانون کی ہمہ گیری سے کائنات کے کسی گوشے میں چھپ کر بھی انسان بچ نہیں سکتا۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ دَلِيلٍ وَلَا فَصِيرٌ (۲۹/۲۲)

اور (اس حقیقت کو بھی ابھی طرح ذہن نشین کر لو کہ) تم خدا کو نہ زمین میں عاجز کر سکتے ہو نہ آسمان میں۔ اور خدا کے سوا کوئی قوت بھی تمہاری دوست اور مددگار نہیں بن سکتی!

سورہ روم میں فرمایا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ..... وَكَانُوا بِهَا يَسْتَعْجِلُونَ (۳۰/۹-۱۰)

اگر یہ لوگ اپنی ذات اور کائنات کے نظام پر غور کرنا نہیں چاہتے تو کم از کم تاریخی نوشتوں ہی کو دیکھیں کہ وہ انہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں؟ اس مقصد کے لئے اگر یہ لوگ آنکھیں کھول کر دنیا میں چلیں پھریں تو انہیں نظر آجائے گا کہ جن قوموں نے 'ان سے پہلے' انہی جیسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ وہ قومیں قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں (۳۰/۲۱)۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں (زرعی اور معدنی پیداوار) کو باہر نکالا۔

ملکوں کو آباد کیا۔ اور ان کی آبادیاں ان مخاطبین کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ ان کے رسول ان کے پاس خدا کے واضح قوانین لے کر آئے۔ (قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ..... اس کے بعد کیا ہوا؟ اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھو کہ) ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خدا نے کسی قوم کو یونہی ظلم اور زیادتی سے تباہ کر دیا ہو۔ تو میں خود اپنے اوپر آپ ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں۔ (۳۵/۲۴)

ہاں تو خدا کے رسول ان کے پاس آئے۔ لیکن انہوں نے انہیں جھٹلایا، ان کا تسخیر اڑایا اور اپنی اسی روش پر قائم رہے جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام قائم کر رکھا تھا ان کی اپنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں ان کا توازن بگڑ گیا (اور وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے)۔

تاریخ و اثر کے حقائق پر غور کرو اور سوچو کہ کس طرح وہی عالمگیر اور محکم قانون انسان کی حیات اجتماعیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد سوچو کہ مبدار و معاد کا قانون حق ہے یا نہیں (۱۱۱-۱۲/۳۰)۔ یعنی یہ قانون مشیت ہے کہ ہر شے کی تخلیق (ابتداء) ایک خاص مقصد کے ماتحت ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ ایک خاص نظام اور قاعدہ کے مطابق مختلف مراحل طے کرتی آگے بڑھتی ہے حتیٰ کہ اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے منزل قرار دیا گیا ہے۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ لہذا عالمِ انفس و آفاق کے مشاہدات و تجارب ہوں یا انسان کی عمرانی و اجتماعی زندگی (تاریخ) کے امثال و نظائر، ان سب پر غور و فکر کو ایک ہی حقیقت کی طرف منجھونا چاہیئے۔ اور وہ مبدار و معاد کی حقیقت ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری کی واقعیت ہے اور اسی کا نام ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قوانینِ الہیہ سے سرکشی قوت کے گھمنڈ پر کی جاتی ہے۔ اس لئے اس حقیقت کی طرف خاص طور پر توجہ مرکوز کرائی گئی کہ سیاحتِ ارضی اور اثری تحقیقات سے یہ دیکھو کہ ائمِ گذشتہ علم و قوت کا غلط استعمال | قوت و ثروت میں کچھ کم نہ تھیں (۲۲۱-۲۲/۴۰)۔ قوت و سطوت میں ہی کم نہ تھیں بلکہ علم و دانش میں بھی۔ اسی لئے وہ اپنے علم و عقل

سُنَّتَ اللّٰهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ

(۸۵-۸۴/۴۰)

پھر جب وہ عذاب دیکھ لیتے ہیں تو پکارتے ہیں کہ ہم خدا کے یکتا و یگانہ پر ایمان لے آئے اور ان (معبودانِ باطل) کا انکار کر دیا جنہیں ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔ مگر اب (جبکہ وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے) ان کا یہ ایمان انہیں نفع نہیں دے سکتا۔ یہی خدا کا طریقہ (اور قانون) ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اس حد پر پہنچ کر یہ انکار کرنے والے ہمیشہ خسارہ ہی میں رہتے ہیں۔

اُس وقت تباہی لازمی ہے۔

جُوئے رواں | پھر یہ بھی یاد رکھتے کہ یہ ہلاکت اور بربادی اسی دنیا کی زندگی تک ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی جوئے رواں ایک جوئے رواں ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی اس سے اگلی منزل میں قدم رکھتی ہے۔ اس لئے جس قوم پر اس زندگی میں ذلت و رسوائی کا ہلاکت آمیز عذاب مسلط ہو جائے وہ اس سے اگلی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ بلکہ وہاں کی ذلت و رسوائی اس سے بھی زیادہ درد انگیز ہوگی اس لئے کہ وہاں اعمال کے نتائج زیادہ محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَإِذَا أَقْبَهُمُ اللَّهُ لِيُخْزِيَ فِي الْآخِرَةِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۝ (۲۵-۲۶/۳۹)
جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں انہوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا۔ چنانچہ (نتیجہ میں) ان پر ایسی جگہ سے عذاب آگیا جہاں سے انہیں خیال بھی نہیں تھا۔ پس خدا نے انہیں دنیا کی زندگی میں (کبھی) رسوائی (کے عذاب) کا مزہ چکھایا۔ اور آخرت کا عذاب تو بلاشبہ اس سے بہت بڑا ہوگا۔ کاش وہ (اس حقیقت کو) سمجھتے ہوں۔

حیاتِ اخروی | وہ آخرت کی زندگی جس میں تمام قومیں اپنے اپنے اعمالِ حیات کو ساتھ لئے نتائج کی منتظر ہوں گی جن کے اعمال نے ان میں ارتقائی منازل طے کر کے بلند بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہوگی وہ سفرِ زندگی کے اگلے درجہ میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝ (۳۵/۳۰)

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے تو ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت میں داخل فرما لے گا اور یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے!

اور جنہوں نے قوانین الہیہ سے انکار و استکبار کی روش اختیار کی ہوگی وہ مجرمین کی صف میں ہوں گے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا قَدْ أَفْلَحُوا تَكُنْ أَيْتِي تُثَلِّي عَلَيْكُمْ فَأَسْتَكَبِرْكُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ (۳۵/۳۱)

لیکن جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہوگی (ان سے جواب طلب کیا جائے گا اور کہا جائیگا) کیا تمہارے سامنے میرے قوانین پیش نہیں کئے گئے تھے، مگر تم نے (ان کے ساتھ) غرور اور تکبر کا برتاؤ کیا اور تم تھے ہی مجرم قوم (کے افراد)۔

اس وقت ہر ایک کی آنکھیں دیکھ لیں گی کہ کس طرح اللہ کی جبروت و کبریاں 'اس کے قوانین کی ہمہ گیری' تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۳۵/۳۲)

اور (یاد رکھو) آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے کبریاں ہیں اور وہ بڑا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

•••

PHYSICAL

ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ جس طرح عالم طبیعی

WORLD میں اٹل قوانین فطرت نافذ العمل ہیں اسی طرح

تدبر فی القرآن سے دُرنگی

انسانی حیات اجتماعیہ کے متعلق بھی قوانین الہیہ جاری و ساری ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کارگہ حیات کا کوئی شعبہ ان قوانین کی حدود و ریاست سے باہر نہیں۔ قرآن کریم انہی احکام کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے۔ قوانین فطرت پر گہری نگاہ رکھنے والا ایج سے پھل کا پتہ دے سکتا ہے۔ وہ سیاروں کی رفتار دیکھ کر سو سال پہلے بتا سکتا ہے کہ سورج کو گہن کب اور کس وقت لگے گا۔ ایک حکیم حاذق 'مریض کی نبض کو چھو کر اور بعض اوقات فقط اس کے

چہرے پر نگاہ ڈال کر اس کے مرض کے مآل و انجام کے متعلق صاف صاف بتا دیتا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ اٹل قوانین کے نتائج کے متعلق پہلے سے بتایا جاسکتا ہے۔ اس میں ”علم غیب“ کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لئے ان قوانین کے متعلق گہری نگاہ کی ضرورت ہے اور بس۔ یہی کیفیت انسانی حیات اجتماعیہ کے قوانین کی ہے جس شخص کی نگاہ ان قوانین پر ہو وہ کسی قوم کی موجودہ روش سے بتا سکتا ہے کہ اس قوم کا انجام کیا ہوگا۔ اور چونکہ یہ قوانین قرآن کے اندر منضبط ہیں، اس لئے جس دیدہ ور کی نگاہیں قرآنی حقائق کی گہرائیوں تک اتر چکی ہوں اس میں ایسی فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

گلے را وید و احوال چمن گفت

اسی فراست کا نتیجہ ہے کہ وہ عین اس وقت جبکہ ساری دنیا کسی نظام تہذیب و تمدن کی تعریف و تائیں میں قصیدہ خواں ہو۔ اس کی چمک دمک سے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو رہی ہو عظیم الشان دانایاں روزگار اسے تمام انسانی مصائب و نوائب کے لئے مسیحا تصور کر رہے ہوں۔ چھوٹے بڑے اس نسخہ کیسیا کی برکات کے معترف ہوں۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیب نو کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہوں۔ غرضیکہ انسان یہ سمجھ رہا ہو کہ اس نے اس فردوسِ گمشدہ کو پایا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشتِ پیمائیوں اور صحراؤں و دیووں میں گزاری تھی۔ وہ مردِ مومن جس کی نگاہوں میں بصیرتِ قرآنی کی روشنی جلوہ بار ہو، پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتا ہے اور اس تہذیبِ جدید کے چھوٹے بڑے نگوں کی ریزہ کاری سے فریب کھانے والوں سے للکار کر کہہ دیتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خجستہ آپ ہی خود کشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں کسی کشف و کرامت کا دخل نہیں۔ یہ علم غیب نہیں۔ یہ الہام نہیں۔ یہ نتیجہ ہے قرآنی حقائق پر غور و تدبر کا، فرقانی معارف پر ایمان و ایقان کا۔ جس طرح ایک طبیبِ حاذق کی نگہِ شرف میں بھانپ لیتی ہے کہ فلاں شخص کے چہرہ کی سُرخی، خونِ صالح کا نتیجہ ہے یا سسکھیا کا اثر، اسی طرح ایک حکیمِ مومن کی دیدہ وری دیکھ لیتی ہے کہ فلاں قوم کے نظامِ تمدن کی چمک دمک، ہیرے کی تابناکی ہے یا کانچ کی نگاہِ فریبی۔ قرآن ہی نورِ عطا کرتا ہے جس سے انسان حق و باطل میں تمیز کر لیتا ہے اور معرکہ حیات میں بلا خوف و خطر بڑھے چلا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ
كَفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۵۴/۲۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو خدا کا تقویٰ حاصل کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ خدا
تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا اور تمہارے لئے ایک نور پیدا کر دے گا جس کی
روشنی میں تم دنیا میں دیدہ وروں کی طرح چل سکو گے۔ وہ تمہیں تمام خطرات سے محفوظ رکھیگا۔
وہ غفور و رحیم ہے۔

خود تخریبی آگے بڑھنے سے پیشتر تہذیبِ حاضرہ کی خودکشی کے متذکرہ صدر "خواب" پر ایک مرتبہ
پھر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ آج لالہ زار ان مغرب میں اس خواب کی تعبیر
کس طرح تڑپتی پھڑکتی انسانیت کی صورت میں محسوس و مشہود دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ
اس تہذیب نو کا قصرِ مشید کس طرح خود اپنے بوجھ سے نیچے گرا رہا ہے اور اس گرنے میں کس طرح اس کی اینٹ
سے اینٹ بک رہی ہے۔ یہ تخریب و انہدام کسی خارجی اسباب و ذرائع سے ظہور پذیر نہیں ہو رہا بلکہ اس
حقیقتِ ثابتہ کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کی تعمیر میں خود تخریب مضمحل تھی۔ اور صرف ایک تہذیبِ حاضرہ ہی
پر کیا موقوف ہے، ہر وہ تہذیب جس کی بنیادیں غیر فطری خطوط پر تھیں اس کا یہی انجام ہوا۔ تاریخِ انسانی پر
نگاہ ڈالئے تو وہ اسی تعمیر و تخریب کی مسلسل داستانِ نظر آئے گی۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم الشان حقیقت کو ایک
نہایت لطیف استعارہ کی صورت میں بیان فرمایا ہے جہاں ارشاد ہوا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۱۷/۹۲)

اور دیکھو تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کا تہ خود
ہی اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ایک عجیب حقیقت قرآنِ کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق
پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر
لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے دقائق و حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور

کی باہمی تلقین کے اجزاء پر مشتمل ہو۔ یہاں پہنچ کر انسان کی ناکامیاں کامیابیوں میں اور نامرادیاں بہرہ مندیاں میں بدل جائیں گی یہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ قرآن کو دنیا میں اسی غرض کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے اس نظام کے علی وجہ البصیرت تمام نظام ہائے انسانی پر غالب آنے کے لئے تجرباتی طریق یہ ہے کہ انسان ایک ایک نظام کو اپنے ہاتھوں سے بنائے اور خود ہی ڈھائے۔ دن بھر سوت کاتے اور شام کو خود ہی بکھیر دے۔ جب انسان خود آنا کر دیکھ لے گا کہ فی الواقع اِنَّ الْاِنْسَانَ لِفِئِ خُسْرٍ تنہا عقل انسانی ناکامیوں کی طرف ہی لے جانے والی ہے تو اس وقت وہ اِلٰہ کی طرف آئے گا۔ جیسا کہ ہم ”ابلیس و آدم“ میں وحی کے عنوان میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں، انسانیت آگ اور خون کا پتھریلہ لے کر ہر بار بہ رنگ نوا بھرتی ہے اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس اُبھار کا رخ ان قوانین خداوندی کی طرف ہوتا ہے جو قرآن کریم کی وقتیں میں محفوظ ہیں اور جو تکمیل شرف انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہیں۔ آج بھی دنیا اس ورطہ لُذ سے اِلٰہ کی طرف آنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس جماعت کے حصہ میں آتی ہے کہ وہ دنیا کو اس جہنم سے کھینچ کر نجات و سعادت کی طرف لے جائے۔ پہلے خود اِلٰہ کا پیکر بنے اور اس کے بعد ساری دنیا کو اس قالب میں ڈھال لے۔

آوازہ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
سکین و لکم ماندہ دریں کشمکش اندر



ایم سابقہ کے ماجریات و کیفیات کا عبرت آموز منظر دیکھتے دیکھتے ہم خود اپنے احوال و ظروف میں گم ہو گئے۔ لیکن چونکہ ان کی تفصیل کا ابھی وقت نہیں اس لئے ہم رکتے ہیں تاکہ اتنی مسافت سے جو نقوش ہمارے آئینہ قلب پر مرسم ہوئے ہیں وہ اچھی طرح ثبت ہو جائیں تو پھر آگے بڑھیں۔ بہر حال یہ تھیں ایم سابقہ کی وہ واویلاں جن سے وہ کاروانِ رشد و ہدایت گزرا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان اُمم و اقوام سے ہمارا اتنا ہی واسطہ ہے کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم عبرت حاصل کریں اور دیکھیں کہ جنہوں نے اپنی روش زندگی آسمانی نظام کے تابع رکھی ان کا انجام کس قدر حسین و شاداب تھا اور جنہوں نے قوانین انسانی کو خضرِ راہ بنایا ان پر ہلاکت و تباہی کا رسوا کن عذاب کس طرح مسلط ہوا۔ ہمارا ان سے اتنا ہی واسطہ ہے۔ ورنہ نہ تو مٹنے والی قوموں کے اعمال کا وبال ہم پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہمارے اسلاف کا دورِ عروج و سطوت ہمارے لئے

وجہ سرفرازی ہو سکتا ہے! انہیں جو کچھ ملا ان کے اعمال کی بدولت ملا۔ ہمیں جو کچھ ملے گا ہمارے اعمال کی بدولت ملے گا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۗ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۳۱)

یاد رکھو! یہ ایک قوم تھی جو اپنے وقت پر دنیا سے چلی گئی۔ اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماد گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ کچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے۔



حضرات انبیائے کرام کا تذکارِ جلیلہ جس کی ابتداء حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی 'جوعے نور' برقی طور ' اور زیرِ نظر مجلہ میں 'حضرت عیسیٰؑ تک پہنچ گیا۔ اب اس کے بعد اس ذاتِ گرامی کا اُسوۂ حسنہ وجہ تازگی نظر ہوگا جس پر اس سلسلہ (نبوت) کا اختتام ہوگا۔ اس کے لئے اس سلسلہ کی اگلی کڑی (معراجِ انسا) ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے اس آسمانی دعوت کی مکمل تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی۔

والسلام

